1

12 x 18

96

12

216

گنجِ فرشتے

2772

گنجِ فرشتے

5/7
32/A

5/7
32/A

گنجِ فرشتے

گنجِ فرشتے

Read by Yousuf Bestos

Ganja

F

گنجے فرشتے

سعادت حسن منٹو

گنجے فرشتے

مکتبۂ جدید ۔ لاہور

بار دوم .... مارچ سنہ ۵۳ء

پبلشر: چودھری رشید احمد، مکتبہ جدید لاہور
پرنٹر: سویرا آرٹ پریس۔ لاہور

گنجِ معانی حضرتِ غالبؔ

کے نام

ہوسِ گُل کا تصوّر میں بھی کھٹکا نہ رہا

عجب آرام دیا بے پر و بالی نے مجھے

گنجِ معانی حضرتِ غالبؔ

ترتیب

میرا صاحب

"یہ سن سینتیس کا ذکر ہے۔ مسلم لیگ رو بہ شباب تھی۔ میں خود شباب کی ابتدائی منزلوں میں تھا۔ جب خواہ مخواہ کچھ کرنے کو جی چاہتا ہے۔ اس کے علاوہ صحت مند تھا، طاقت ور تھا۔ اور جی میں ہر وقت یہی خواہش تڑپتی تھی کہ سامنے جو قوت آئے اس سے بھڑ جاؤں۔ اگر کوئی قوت سامنے نہ آئے تو اُسے خود پیدا کروں اور مدِ مقابل بنا کر اُس سے گتھ جاؤں۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے۔ جب آدمی ہر وقت کچھ کرنے کے لئے بیتاب رہتا ہے۔ کچھ کرنے سے میرا مطلب ہے کوئی بڑا کام۔ کوئی بہت بڑا کارنامہ سر انجام نہ ہو، تو سرزد ہی ہو جائے —— مگر کچھ ہو ضرور۔

اس مختصر تمہید کے بعد اب میں پھر اُس زمانے کی طرف لوٹتا ہوں۔ جب غالب جوان تھا۔ معلوم نہیں اُس نے اپنی جوانی کے دنوں میں کسی سیاسی تحریک میں حصّہ

لیا تھا یا نہیں۔ مگر خاکسار مسلم لیگ کا ایک سرگرم کارکن تھا۔ غازی آباد کور مجھ ایسے کئی نوجوانوں کی ایک جماعت تھی۔ جس کا میں ایک مخلص ممبر تھا۔ اپنے اخلاص کا ذکر میں نے اس لیئے بڑے وثوق سے کیا ہے ــــــــ کہ اُن دنوں میرے پاس سوائے اس کے اور کچھ تھا ہی نہیں۔

یہ اُسی زمانے کا ذکر ہے۔ کہ محمد علی جناح دہلی تشریف لائے اور مسلمانوں نے اُن کا شاندار جلوس نکالا۔ جیسا کہ ظاہر ہے۔ غازی آباد کور نے اس جلوس کو پُر رونق اور پُرجوش بنانے میں پورا حصہ لیا۔ ہماری جماعت کے سالار انور قریشی صاحب تھے۔ بڑے تنومند جوان جواب شاعرِ پاکستان کے لقب سے مشہور ہیں۔ ہماری کور کے جوانوں کے ہونٹوں پہ انہی کا تصنیف کردہ قومی ترانہ تھا۔ معلوم نہیں ہم سُر تال میں تھے یا نہیں۔ لیکن اتنا یاد ہے کہ جو کچھ بھی ہمارے حلق سے باہر نکلتا اُس کو سُر تال کی پابندیوں میں جکڑنے کا ہوش کسی کو بھی نہیں تھا۔

فریاد کی کوئی لَے نہیں ہے

نالہ پابندِ نَے نہیں ہے

یہ تاریخی جلوس تاریخی شہر دلّی کی تاریخی جامع مسجد سے شروع ہُوا۔ اور پرجوش نعرے بکھیرتا، چاندنی چوک، لال کنواں، حوض قاضی اور چاوڑی بازار سے ہوتا ہُوا اپنی منزل یعنی مسلم لیگ کے آفس پہنچ کر ختم ہو گیا۔

اجتماعی طور پر اسی تاریخی جلوس میں محمد علی جناح صاحب کو قائدِ اعظم کے

غیر فانی خطاب سے نعرہ زن کیا گیا۔ ان کی سواری کے لئے چھ گھوڑوں کی فٹن کا انتظام تھا۔ جلوس میں مسلم لیگ کے تمام سرکردہ اراکین تھے۔ موٹروں، موٹر سائیکلوں، بائیسکلوں اور اونٹوں کا ایک ہجوم تھا۔ مگر بہت ہی منظم۔ اس نظم کو دیکھ کر قائدِ اعظم جو طبعاً بہت ہی نظم پسند تھے۔ بہت مسرور نظر آتے تھے۔

میں نے اس جلوس میں اُن کی کئی جھلکیاں دیکھیں۔ ان کی پہلی جھلک دیکھ کر میرا ردِّ عمل معلوم نہیں کیا تھا۔ اب سوچتا ہوں اور تجزیہ کرتا ہوں۔ تو صرف اس نتیجے پر پہنچتا ہوں۔ کہ خلوص چونکہ بے رنگ ہوتا ہے۔ اس لئے وہ ردِّ عمل بھی یقیناً بے رنگ تھا۔ ...... اس وقت اگر کسی بھی آدمی کی طرف اشارہ کر کے مجھ سے کہا جاتا۔ کہ وہ دیکھو تمہارا قائدِ اعظم ہے۔ تو میری عقیدت اُسے قبول کر لیتی اور اپنے سر آنکھوں پر جگہ دیتی ــــ لیکن جب میں نے جلوس کے مختلف موڑوں اور پیچوں میں ان کو کئی مرتبہ دیکھا۔ تو میری تنومندی کو دھکّا سا لگا۔ میرا قائد اور اس قدر دُبلا ــــ اس قدر نحیف!

غالبؔ نے کہا تھا ؎

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو، کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

وہ ہمارے گھر آئے تھے۔ یہ اُن کی مہربانی اور خدا کی قدرت تھی۔ خدا کی قسم میں کبھی اُن کو دیکھتا تھا۔ اُن کے نحیف و نزار جسم کو۔ اس مشتِ استخوان کو،

اور کبھی اپنے ہٹے کٹے ڈیل ڈول کو۔ جی میں آتا کہ یا تو میں سکڑ جاؤں یا وہ پھیل جائیں۔ لیکن میں نے دل ہی دل میں اُن کے انہی ناتواں دست و بازو کو نظرِ بد سے محفوظ رکھنے کے لئے دعائیں بھی مانگیں۔ دشمنوں پر ان کے لگائے ہوئے زخموں کا چرچا عام تھا۔

حالات پلٹا کھاتے ہی رہتے ہیں۔ معلوم نہیں پلٹوں کا نام حالات ہے۔ یا حالات کا نام پلٹے۔ بہرحال کچھ ایسی صورت ہوئی کہ دماغ میں آرٹ کا کیڑا جو کچھ دیر سے سو رہا تھا۔ جاگا اور آہستہ آہستہ رینگنے لگا۔ طبیعت میں یہ اکساہٹ پیدا ہوئی کہ بمبے چل کر اس میدان میں قسمت آزمائی کی جائے۔ ڈرامے کی طرف بچپن ہی سے مائل تھا۔ سوچا کہ شاید وہاں چل کر اپنے جوہر دکھانے کا موقع مل جائے ـــــ کہاں خدمتِ قوم و ملت کا جذبہ، اور کہاں اداکاری کا خبط ـــــ انسان بھی عجب مجموعۂ اضداد ہے۔

بمبے پہنچا۔ ان دنوں امپیریل فلم کمپنی اپنے جوبن پہ تھی۔ یہاں رسائی گو بہت ہی مشکل تھی۔ مگر کسی نہ کسی حیلے سے داخل ہو ہی گیا۔ آٹھ آنے روز پر ایکسٹرا کے طور پر کام کرتا تھا۔ اور یہ خواب دیکھتا تھا۔ کہ ایک روز آسمانِ فلم کا درخشندہ ستارہ بن جاؤں گا۔

اللہ کے فضل سے باتونی بہت ہوں۔ خوش گفتار نہ سہی تو کچھ ایسا بدگفتار بھی نہیں۔ اردو مادری زبان ہے۔ جس سے امپیریل فلم کمپنی کے تمام ستارے

ناآشنا تھے۔ اس نے میری مدد دہلی کے بجائے بمبیے میں کی۔ وہ یوں کہ وہاں کے قریب قریب تمام ستاروں نے اپنی گردشوں کا حال مجھ سے لکھوایا۔ اور پڑھوایا کرتے تھے۔ اردو میں کوئی خط آتا تو میں انہیں پڑھ کے سناتا۔ اس کا مطلب بتاتا۔ اس کا جواب لکھتا۔ مگر اس منشی گیری اور خطوط نویسی سے کوئی خاطر خواہ فائدہ نہ ہوا۔ اکسٹرا تھا اکسٹرا ہی رہا۔

اس دوران میں امپیریل فلم کمپنی کے مالک سیٹھ آرڈیشر ایرانی کے خاص الخاص موٹر ڈرائیور بدھن سے میری دوستی ہو گئی۔ اور اس نے اس کا حق یوں ادا کیا۔ کہ فرصت کے اوقات میں مجھے موٹر چلانا سکھا دی۔ مگر چونکہ یہ اوقات نہایت ہی مختصر ہوتے تھے۔ اور بدھن کو ہر وقت یہی دھڑکا لگا رہتا تھا۔ کہ سیٹھ کو اس کی چوری کا علم نہ ہو جائے۔ اس لئے میں اپنی تمام ذہانت کے باوصف موٹر چلانے کے فن پہ پوری طرح حاوی نہ ہو سکا۔ حاوی ہونا تو بہت بڑی بات ہے۔ بس یوں سمجھئے کہ مجھے بدھن کی مدد کے بغیر الف جیسی سیدھی سڑک پر سیٹھ آرڈیشر کی بیوک چلانا آ گئی تھی۔ اس کے کل پرزوں کے متعلق میرا علم صفر تھا۔

اداکاری کی دھن سر پہ بہت بری طرح سوار تھی۔ مگر یہ سر کا معاملہ تھا۔ دل میں مسلم لیگ اور اس کے روح رواں قائدِ اعظم محمد علی جناح بدستور بسے ہوئے تھے امپیریل فلم کمپنی میں، کینیڈی برج پر، بھنڈی بازار اور محمد علی روڈ میں اور بیلے ہاؤس پر اکثر مسلمانوں کی اقلیت کے ساتھ کانگرس کے سلوک کا تذکرہ ہوتا تھا۔

امپیریل میں سب جانتے تھے کہ میں مسلم لیگی ہوں۔ اور قائدِ اعظم محمد علی جناح کا نام لیوا
لیکن یہ وہ زمانہ تھا جب ہندو کسی کے منہ سے قائدِ اعظم کا نام سن کر اس کے جان لیوا
نہیں ہو جاتے تھے۔ قیامِ پاکستان کا مطالبہ ابھی منظرِ عام پر نہیں آیا تھا۔ میرا خیال
ہے۔ امپیریل فلم کمپنی کے لوگ جب مجھ سے قائدِ اعظم کا تعریفی ذکر سنتے۔ تو یہ سمجھتے
تھے کہ وہ بھی کوئی ہیرو ہے جس کا میں پرستار ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک دن
اُس زمانے کے سب سے بڑے فلمی ہیرو ڈی بلیموریا نے ٹائمز آف انڈیا کا پرچہ
میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "لو بھئی، یہ تمہارے جناح صاحب ہیں"۔
میں سمجھا ان کی کوئی تصویر چھپی ہے۔ پرچہ بلی موریا کے ہاتھ سے لے لیا۔
اُلٹ پلٹ کر کے دیکھا۔ مگر ان کی شبیہہ نظر نہ آئی، میں نے اس سے پوچھا "کیوں
بھیا کہاں ہے ان کا فوٹو"۔
بلی موریا کی جون گلبرٹ اسٹائل کی باریک باریک مونچھیں مسکراہٹ کے باعث
اُس کے ہونٹ پر کچھ پھیل سی گئیں۔ "پھوٹو ووٹو نہیں ہے ——— ان کا اشتہار چھپا ہے"
میں نے پوچھا "اشتہار؟ کیسا ——— اشتہار!"
بلی موریا نے پرچہ لیا اور ایک لمبا کالم دکھا کر کہا۔ "مسٹر جناح کو ایک
موٹر مکینک کی ضرورت ہے۔ جو ان کے گراج کا سارا کام سنبھال سکے"۔
میں نے اخبار میں وہ جگہ دیکھی۔ جہاں بلی موریا نے انگلی رکھی ہوئی تھی، اور
یوں "اوہ" کیا جیسے میں نے ایک ہی نظر میں اس اشتہار کا سارا مضمون پڑھ لیا ہے،

حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ خاکسار کو انگریزی اتنی ہی آتی تھی جتنی ڈی بلی موریا کو اُردو۔
جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں میری موٹر ڈرائیوری صرف الف ایسی سیدھی سڑک تک محدود تھی۔ موٹر کی میکنزم کیا ہوتی ہے اس کے متعلق حرام ہے جو مجھے کچھ علم ہو۔ سیلف دبانے پر انجن کیوں اسٹارٹ ہوتا ہے۔ اس وقت اگر مجھ سے کوئی یہ سوال کرتا تو میں یقیناً یہ جواب دیتا کہ یہ قانونِ موٹر ہے۔ سیلف دبانے پر بعض اوقات انجن کیوں اسٹارٹ نہیں ہوتا —— اس سوال کا بھی جواب یہ ہوتا کہ یہ بھی قانونِ موٹر ہے۔ جس میں انسانی عقل کو کوئی دخل نہیں۔
آپ کو حیرت ہوگی کہ میں نے بلی موریا سے جناح صاحب کے بنگلے کا پتہ وغیرہ نوٹ کر لیا اور دوسرے روز صبح اُن کے پاس جانے کا ارادہ کر لیا۔ اصل میں مجھے ملازمت حاصل کرنے کا خیال تھا نہ اس کی توقع تھی۔ بس یونہی ان کو ان کی رہائش گاہ میں قریب سے دیکھنے کا شوق تھا۔ چنانچہ اپنے خلوص کو ڈپلومے کے طور پر ساتھ لئے میں ماؤنٹ پلیزنٹ روڈ واقع مالا بار ہل پر ان کی خوش نما کوٹھی پر پہنچ گیا۔ باہر پٹھان پہرہ دار تھا۔ کئی تھانوں کی سفید شلوار، سر پہ ریشمی لنگی، بہت ہی صاف ستھرا اور بارعب، گرانڈیل اور طاقتور، اس کو دیکھ کر میری طبیعت خوش ہوگئی۔ دل ہی دل میں کئی مرتبہ میں نے اس کے اور اپنے ڈنڑ کی پیمائش کی اور یہ محسوس کر کے مجھے بڑی عجیب سی تسکین ہوئی کہ فرق بہت معمولی ہے۔ یہی کوئی ایک آدھ اِنچ کا۔

مجھ سے پہلے اور کئی امیدوار جمع تھے۔ سب کے سب اپنی اسناد کے پلندے بغل میں دابے کھڑے تھے۔ میں بھی ان میں شامل ہو گیا۔ بڑے مزے کی بات ہے کہ اسناد تو ایک طرف رہیں۔ میرے پاس ڈرائیونگ کا معمولی لائسنس تک نہیں تھا۔ اُس وقت دل صرف اس خیال سے دھڑک رہا تھا۔ کہ بس اب چند لمحوں میں قائدِ اعظم کا دیدار ہونے والا ہے۔

میں ابھی اپنے دل کی دھڑکن کے متعلق سوچ ہی رہا تھا۔ کہ قائدِ اعظم پورچ میں نمودار ہوئے۔ سب اٹینشن ہو گئے۔ میں ایک طرف سمٹ گیا۔ اُن کے ساتھ اُن کی دراز قد اور دُبلی پتلی ہمشیرہ تھی۔ جن کی متعدد تصاویر میں اخباروں اور رسالوں میں دیکھ چکا تھا۔ ایک طرف ہٹ کر اُن کے باادب سکتّر مطلوب صاحب تھے۔

جناح صاحب نے اپنی یک چشمی عینک آنکھ پہ جمائی۔ اور تمام امیدواروں کو بڑے غور سے دیکھا جب اُن کی مسلّح آنکھ کا رُخ میری طرف ہُوا۔ تو میں اور زیادہ سمٹ گیا۔ فوراً اُن کی کھب جانے والی آواز بلند ہوئی۔ مجھے صرف اتنا سنائی دیا۔ "یُو ـــ؟"

اتنی انگریزی میں جانتا تھا۔ اُن کا مطلب تھا۔ "تم۔" مگر وہ "تم" کون تھا۔ جس سے وہ مخاطب ہوئے تھے؟ میں سمجھا کہ میرے ساتھ والا ہے۔ چنانچہ میں نے اُسے کہنی سے ٹھوکا دیا۔ اور کہا۔ "بولو۔ تمہیں بلا رہے ہیں۔"

میرے ساتھی نے لکنت بھرے لہجہ میں پوچھا۔ "صاحب میں؟"

قائدِ اعظم کی آواز پھر بلند ہوئی۔ "تو ــــــ تم؟"

اُن کی باریک مگر لوہے جیسی سخت انگلی میری طرف تھی۔ میرا تن بدن کانپ اُٹھا۔ "جی جی ـــــ ہیں؟"

"بس!" یہ ٹھری ناٹ ٹھری کی گولی تو میرے دل و دماغ کے پار ہو گئی۔ میرا حلق ـــــ قائدِ اعظم کے نعرے بلند کرنے والا حلق بالکل سوکھ گیا ـــــ میں کچھ نہ کہہ سکا ـــــ مگر جب انہوں نے اپنا مونوکل آنکھ سے اتار کر "آل رائٹ" کہا تو میں نے محسوس کیا۔ کہ شاید میں نے کچھ کہا تھا۔ جو انہوں نے سن لیا تھا۔ یا وہ میری کیفیّت بھانپ گئے تھے۔ اور میرے نطق کو مزید اذیّت سے بچانے کے لئے انہوں نے "آل رائٹ" کہہ دیا تھا۔

پلٹ کر انہوں نے اپنے حسین و جمیل اور صحت مند سیکرٹری کی طرف دیکھا اور اُس سے کچھ کہا۔ اس کے بعد وہ اپنی ہمشیرہ کے ساتھ اندر تشریف لے گئے۔ میں اپنے دل و دماغ کی گڑبڑ جلدی جلدی سمیٹ کر وہاں سے چلنے ہی والا تھا کہ مطلوب صاحب نے مجھے پکارا۔ اور کہا کہ صاحب نے تمہیں کل دس بجے یہاں حاضر ہونے کے لئے کہا ہے۔

میں مطلوب صاحب سے یہ سوال نہ کر سکا۔ کہ صاحب نے مجھے کیوں بلایا ہے اُن کو یہ بھی نہ بتا سکا۔ کہ میں بلائے جانے کے ہرگز ہرگز قابل نہیں ہوں۔ اس لئے کہ میں اس ملازمت کا بالکل اہل نہیں جس کے لئے قائدِ اعظم نے اشتہار دیا ہے

وہ بھی اندر چلے گئے اور میں گھر لوٹ آیا۔

دوسرے دن صبح دس بجے پھر درِ دولت پر حاضر ہوا۔ جب اطلاع کرائی۔ تو ان کے خوش پوش حسین وجمیل اور صحت مند سیکرٹری تشریف لائے۔ اور مجھے یہ حیرت انگیز مژدہ سنایا۔ کہ صاحب نے مجھے پسند کیا ہے۔ اس لیے میں فوراً گراج کا چارج لے لوں۔

یہ سُن کر جی میں آئی کہ اُن پر اپنی قابلیت کا سارا پول کھول دوں۔ اور صاف صاف کہہ دوں۔ کہ حضرت قائدِ اعظم کو اس خاکسار کے متعلق غلط فہمی ہوئی ہے میں تو محض تفریحاً یہاں چلا آیا تھا۔ یہ آپ گراج کا بوجھ اس نا اہل کے کاندھوں پر کیوں دھر رہے ہیں۔ مگر جانے کیوں۔ میں کچھ نہ بولا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ آناً فاناً گراج کا پردھان بنا دیا گیا۔ چابیاں میرے حوالے کر دی گئیں۔ چار کاریں تھیں۔ مختلف میک کی۔ اور مجھے صرف سیٹھ آر ڈیلشر ایرانی کی بیوک چلانا آتی تھی۔ اور وہ بھی الف جیسی سیدھی سڑک پر۔ مالا بارہل تک پہنچنے میں کئی موڑ تھے۔ کئی خم، اور موٹر میں آزاد کو صرف اپنی اکیلی جان نہیں لے جانا تھی۔ اُسے خدا معلوم کن کن اہم کاموں پر اس رہنما کو لیے لیے پھرنا تھا۔ جس کی زندگی کے ساتھ لاکھوں مسلمانوں کی جان وابستہ تھی۔

میں نے سوچا چابیاں وغیرہ سب چھوڑ چھاڑ کے بھاگ جاؤں۔ بھاگ کے سیدھا گھر پہنچوں۔ وہاں سے اپنا اسباب اٹھاؤں اور ٹکٹ کٹا کے دہلی کا

رخ کروں۔ مگر پھر سوچا یہ درست نہیں۔ بہتر یہی ہے۔ کہ بلا کم و کاست جناح صاحب کو سارے حقائق سے باخبر کردوں۔ اور معافی مانگ کر افسانوں کی طرح واپس اُس جگہ چلا جاؤں۔ جو کہ میرا اصل مقام تھا۔ مگر آپ یقین مانئے کہ مجھے پورے چھ مہینے تک اس کا موقعہ نہ ملا۔"

میں نے پوچھا۔" وہ کیسے؟"

محمد حنیف آزاد نے جواب دیا۔" آپ سُن لیجئے ـــــ دوسرے روز حکم ہوُا کہ آزاد موٹر لائے۔ وہ جو ایسے موقعوں پر خطا ہوُا کرتا ہے، خطا ہوتے ہوتے رہ گیا۔ میں نے ارادہ کرلیا کہ جونہی صاحب سامنے آئیں گے سلام کرکے گراج کی چابیاں اُن کے حوالے کردوں گا اور اُن کے قدموں میں گر پڑوں گا۔ لیکن ایسا نہ ہوسکا ـــــ وہ پورچ میں تشریف لائے تو اس بندۂ نابکار کے منہ سے رعب کے مارے ایک لفظ بھی نکل نہ سکا۔ اس کے علاوہ اُن کے ساتھ فاطمہ صاحبہ تھیں۔ عورت کے سامنے کسی کے قدموں میں گرنا، منٹو صاحب، کچھ بہت وہ تھا ـــــ"

میں نے آزاد کی موٹی موٹی آنکھوں میں شرم کے لال لال ڈورے دیکھے اور مسکرادیا۔" خیر ـــــ پھر کیا ہوُا؟"

"ہوُا یہ منٹو صاحب کہ خاکسار کو موٹر اسٹارٹ کرنی ہی پڑی۔ نئی پیکارڈ تھی۔ اللہ کا نام لے کر اٹکل پچو اسٹارٹ تو کردی۔ اور بڑی صفائی سے کوٹھی کے باہر بھی لے گیا، پر جب مالا بارہل سے نیچے اُترتے وقت لال بتی کے موڑ کے پاس پہنچا۔

جانتے ہیں نہ لال بتّی ؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔" ہاں ہاں !"

"بس صاحب، وہاں مشکل پیدا ہو گئی۔ اُستاد بدھن نے کہا تھا کہ بریک دبا کر معاملہ ٹھیک کر لیا کرو۔ افراتفری کے عالم میں کچھ ایسے اناڑی پن سے بریک دبائی کہ گاڑی ایک دھچکے کے ساتھ رُکی۔ قائدِ اعظم کے ہاتھ سے اُن کا سگار گر پڑا ۔۔۔ فاطمہ جناح صاحبہ اُچھل کر دو بالشت آگے ۔۔۔ لگیں مجھے گالیاں دینے ۔۔۔ کاٹو تو لہو نہیں میرے بدن میں۔ ہاتھ کانپنے لگے۔ دماغ چکرانے لگا۔ قائدِ اعظم نے سگار اٹھایا اور انگریزی میں کچھ کہا۔ جس کا غالباً یہ مطلب تھا کہ واپس لے چلو ۔۔۔ میں نے حکم کی تعمیل کی۔ تو انہوں نے نئی گاڑی اور نیا ڈرائیور طلب فرمایا اور جہاں جانا تھا چلے گئے ۔۔۔ اس واقعہ کیبعد چھ مہینے تک مجھے ان کی خدمت کا موقع نہ ملا۔"

میں نے مسکرا کر پُوچھا۔" ایسی ہی خدمت کا ؟"

آزاد بھی مسکرایا۔" جی ہاں ۔۔۔ بس یوں سمجھئے کہ صاحب نے مجھے اس کا موقع نہ دیا۔ دوسرے ڈرائیور تھے۔ وہ اُن کی وردی میں رہتے تھے۔ مطلوب صاحب رات کو بتا دیتے تھے۔ کہ کون ڈرائیور کب اور کس گاڑی کے لئے چاہیئے۔ میں اگر ان سے اپنے متعلق کچھ دریافت کرتا۔ تو وہ کوئی خاطر خواہ جواب نہ دے سکتے۔ یہ مجھے بعد میں معلوم ہوا۔ صاحب کے دل میں کیا ہے۔ اس کے متعلّق کوئی بھی وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ اور نہ اُن سے کوئی کسی امر کے بارے میں استفسار ہی کر سکتا تھا

وہ صرف مطلب کی بات کرتے تھے۔ اور مطلب کی بات ہی سنتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ میں اُن سے اتنا قریب ہوتے ہوئے بھی یہ معلوم نہ کر سکا۔ کہ اپنے گراج کا فاؤنڈر بنا کر ایک بے کار پرزے کی طرح انہوں نے مجھے کیوں ایک طرف پھینک رکھا ہے۔" میں نے آزاد سے کہا۔ "ہو سکتا ہے وہ تمہیں قطعاً بھول ہی گئے ہوں۔"

آزاد کے حلق سے وزنی قہقہہ بلند ہوا۔ "نہیں جناب نہیں ـــ صاحب بھولے سے بھی کبھی نہیں بھولتے تھے۔ اُن کو اچھی طرح معلوم تھا۔ کہ آزاد چھ مہینے سے گراج میں پڑا روٹیاں توڑ رہا ہے۔ اور منٹو صاحب جب آزاد روٹیاں توڑے تو وہ معمولی روٹیاں نہیں ہوتیں۔ یہ تن و توش ملاحظہ فرمائیے۔"

میں نے آزاد کی طرف دیکھا۔ سن سینتیس، اڑتیس میں جانے اُس کا کیا تن و توش تھا۔ مگر میرے سامنے ایک کافی مضبوط اور تنومند آدمی بیٹھا تھا۔ جس کو آپ ایکٹر کی حیثیت میں یقیناً جانتے ہوں گے۔ تقسیم سے پہلے وہ بمبئی کے فلموں میں کام کرتا تھا۔ اور آج کل یہاں لاہور میں اپنے دوسرے ایکٹر بھائیوں کے ساتھ فلمی صنعت کی زبوں حالی کا شکار کسی نہ کسی حیلے گذر اوقات کر رہا ہے۔

مجھے پچھلے برس ایک دوست سے معلوم ہوا تھا کہ یہ موٹی موٹی آنکھوں، سیاہ رنگ اور کسرتی بدن والا ایکٹر ایک مدّت تک قائدِ اعظم محمد علی جناح کا موٹر ڈرائیور رہ چکا ہے، چنانچہ اُسی وقت سے میری نگاہ اُس پر تھی۔ جب کبھی اس سے ملاقات ہوتی میں اُس کے آقا کا ذکر چھیڑ دیتا اور اس سے باتیں سن سن کر اپنے حافظے میں جمع کرتا رہتا۔

کل جب میں نے یہ مضمون لکھنے کے لئے اُس سے کئی باتیں دوبارہ سنیں تو مجھے قائدِ اعظم کی زندگی کے ایک بہت ہی دلچسپ پہلو کی جھلک نظر آئی۔ محمد حنیف آزاد کے ذہن پر اس بات نے خاص طور پر اثر کیا تھا۔ کہ اس کا آقا طاقت پسند تھا جس طرح علامہ اقبال کو بلند قامت چیزیں پسند تھیں۔ اسی طرح قائدِ اعظم کو تنومند چیزیں مرغوب تھیں، یہی وجہ ہے کہ اپنے لئے ملازموں کا انتخاب کرتے وقت۔ وہ جسمانی صحت اور طاقت سب سے پہلے دیکھتے تھے۔

اُس زمانے میں جس کا ذکر محمد حنیف آزاد کرتا ہے۔ قائدِ اعظم کا سیکرٹری مطلوب بڑا وجیہہ آدمی تھا۔ جتنے ڈرائیور تھے، سب کے سب جسمانی صحّت کا بہترین نمونہ تھے۔ کوٹھی کے پاسبان بھی اسی نقطۂ نظر سے چنے جاتے تھے۔ اس کا نفسیاتی پس منظر اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ کہ جناح مرحوم خود بہت ہی لاغر اور نحیف تھے۔ مگر طبیعت چونکہ بے حد مضبوط اور کسرتی تھی اس لئے کسی ضعیف اور نحیف شے کو خود سے منسوب ہونا پسند نہیں کرتے تھے۔

وہ چیز جو انسان کو مرغوب اور پیاری ہو، اُس کے بناؤ سنگھار کا وہ خاص اہتمام کرتا ہے۔ چنانچہ قائدِ اعظم کو اپنے صحت مند اور طاقتور ملازموں کی پوشش کا بہت خیال رہتا تھا۔ پٹھان چوکیدار کو حکم تھا۔ کہ وہ ہمیشہ اپنا قومی لباس پہنا کرے۔ آزاد پنجابی نہیں تھا۔ لیکن کبھی کبھی ارشاد ہوتا تھا۔ کہ پگڑی پہنے۔ سر کا یہ لباس بڑا طرحدار ہے۔ چونکہ اس سے قد و قامت میں خوش گوار اضافہ ہوتا ہے۔ اس لئے

وہ اُس کے سر پر پگڑی بندھوا کر بہت خوش ہوتے تھے، اور اس خوشی میں اس کو انعام دیا کرتے تھے۔

اگر غور کیا جائے تو جسم کی لاغری کا یہ احساس ہی ان کی مضبوط اور پُر وجاہت زندگی کی سب سے بڑی قوت تھی۔ اُن کے چلنے پھرنے، اُٹھنے، بیٹھنے، کھانے، پینے اور بولنے سوچنے میں یہ قوت ہر وقت کار فرما رہتی۔

محمد حنیف آزاد نے مجھے بتایا کہ قائدِ اعظم کی خوراک بہت ہی قلیل تھی۔ "وہ اتنا کم کھاتے تھے کہ مجھے بعض اوقات تعجب ہوتا تھا کہ وہ جیتے کس طرح ہیں۔ اگر مجھے اُس خوراک پر رکھا جاتا تو یقیناً دوسرے ہی روز میری چربی پگھلنے لگتی۔ لیکن اس کے برعکس ہر روز چار پانچ مرغیاں باورچی خانہ میں ذبح ہوتی تھیں۔ ان میں سے صرف ایک چوزے کی یخنی اور وہ بھی بمشکل ایک چھوٹی پیالی اُن کی خوراک کا جزو بنتی تھی۔ فروٹ ہر روز آتا تھا۔ اور کافی مقدار میں آتا مگر یہ سب ملازموں کے پیٹ میں جاتا تھا۔

"ہر روز رات کے کھانے کے بعد صاحب کاغذ پر اشیائے خوردنی کی فہرست پر نشان لگا دیتے تھے اور ایک سو کا نوٹ میرے حوالے کر دیتے تھے۔ یہ دوسرے روز کے طعام کے اخراجات کے لئے ہوتا تھا۔"

میں نے آزاد سے پوچھا۔ "ہر روز سو روپے؟"

"جی ہاں، پورے سو روپے۔ اور قائدِ اعظم کبھی حساب طلب نہیں فرماتے

تھے۔ جو باقی بچتا وہ سب ملازموں میں تقسیم ہو جاتا تھا۔ کبھی تیس بچ جاتے تھے۔ کبھی چالیس اور کبھی کبھی ساٹھ ستر۔ اُن کو یقیناً اس بات کا علم تھا کہ ہم ہر روز بہت سے روپے گول کرتے ہیں مگر اس کا ذکر انہوں نے کبھی نہ کیا۔ البتہ مس جناح بہت تیز تھیں۔ اکثر بگڑ جاتی تھیں کہ ہم سب چور ہیں۔ ایک آنے کی چیز کا ایک روپیہ لگاتے ہیں۔ مگر صاحب کا سلوک کچھ ایسا تھا۔ کہ ہم سب اُن کے مال کو اپنا مال سمجھنے لگے تھے۔ چنانچہ ان کی جھڑکیاں اور گھرکیاں سُن کر اپنے کان سمیٹ لیتے تھے۔ صاحب ایسے موقعوں پر اپنی ہمشیرہ سے "اِٹ از آل رائٹ۔ اِٹ از آل رائٹ" کہتے اور معاملہ رفع دفع ہو جاتا۔

مگر ایک دفعہ "اِٹ از آل رائٹ" کہنے سے معاملہ رفع نہ ہوُا۔ اور محترمہ مس جناح نے باورچی کو نکال دیا۔ ایک باورچی کو نہیں دونوں باورچیوں کو۔ کیونکہ قائدِ اعظم بیک وقت باورچی خانے کے لیئے دو ملازم رکھتے تھے۔ ایک وہ جو ہندوستانی کھانے پکانا جانتا ہو۔ دوسرا وہ جو انگریزی طرز کے کھانے پکانے کی مہارت رکھتا ہو۔ عام طور پر ہندوستانی باورچی بیکار پڑا رہتا تھا۔ لیکن کبھی کبھی بعض اوقات مہینوں کے بعد اس کی باری آتی تھی۔ اور اس کو حکم ملتا تھا۔ کہ وہ ہندوستانی کھانے تیار کرے۔ مگر قائدِ اعظم کو ان سے دلی رغبت نہیں تھی۔

آزاد نے بتایا۔ "جب دونوں باورچی نکال باہر کیئے گئے تو صاحب نے کچھ نہ کہا۔ وہ اپنی ہمشیرہ کے معاملے میں دخل نہیں دیا کرتے تھے۔ چنانچہ کئی دن

دونوں وقت کا کھانا تاج ہوٹل میں تناول فرماتے رہے۔ اس دوران میں ہم لوگوں نے خوب عیش کیئے۔ گھر سے موٹر لے کر نئے باورچیوں کی تلاش میں نکل جاتے اور گھنٹوں دن اِدھر اُدھر گھوم گھام کر واپس آجاتے تھے کہ کام کا کوئی آدمی نہیں ملا۔ آخر میں مس جناح کے کہنے پر پُرانے باورچی واپس بلا لیئے گئے۔"

جو شخص بہت کم خور ہو وہ دوسروں کو بہت کھاتے دیکھ کر یا تو جلتا بھُنتا ہے یا بہت خوش ہوتا ہے۔ قائدِ اعظم دوسری قبیل کے کم خوروں میں تھے۔ وہ دوسروں کو کھلا کر دلی مسرت محسوس کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر روز سو روپے دے کر وہ حساب کتاب سے بالکل غافل ہو جاتے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اسراف پسند تھے۔ محمد حنیف آزاد ایک دلچسپ واقعہ بیان کرتا ہے۔

"یہ سن انتالیس کا ذکر ہے۔ شام کے وقت ورلی کی سیر ہو رہی تھی۔ میں اُن کی سفید پیکارڈ آہستہ آہستہ چلا رہا تھا۔ سمندر کی موجیں ہولے ہولے ساحل سے ٹکرا رہی تھیں موسم میں گلابی خنکی تھی۔ صاحب کا موڈ بہت اچھا تھا۔ میں نے موقعہ پا کر عید کا ذکر چھیڑا۔ اس سے جو میرا مطلب تھا وہ ظاہر ہے۔ صاحب فوراً تاڑ گئے۔ میں نے بیک ویو مرر میں دیکھا۔ اُن کے پتلے ہونٹ مسکرائے۔ نہ جدا ہونے والا سگار منہ سے نکال کر انہوں نے کہا۔" اوہ — وِل وِل ..... ابھی ٹم ایک دم مسلمان ہو گیا ہے — تھوڑا ہندو بنو۔"

اس سے چار روز پہلے قائدِ اعظم، آزاد کو مسلمان بنا چکے تھے۔ یعنی انعام کے

طور پر اُسے دو سو روپے دے چکے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اُس کو تھوڑا سا ہندو بننے کی تلقین کی ــــ مگر آزاد پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اس عید پر وہ سیّد مرتضےٰ اجیلانی فلم پروڈیوسر کے پاس اپنی مسلمانی مستحکم کرنے کی غرض سے آیا تھا۔ کہ اُس سے میری ملاقات ہوئی اور میں نے یہ مضمون تیار کرنے کے لئے اُس سے مزید معلومات حاصل کیں۔

قائدِ اعظم کی گھریلو زندگی کا صحیح نقشہ مستور رہے اور ہمیشہ مستور رہے گا ــــ عام طور پر یہی کہا جاتا ہے، لیکن جہاں تک میں سمجھا ہوں ان کی گھریلو زندگی، ان کی سیاسی زندگی میں کچھ اس طرح مدغم ہو گئی تھی کہ اس کا وجود ہونے نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا۔ بیوی تھی، وہ مدّت ہوئی ان سے جدا ہو چکی تھی، لڑکی تھی اس نے ان کی مرضی کے خلاف ایک پارسی لڑکے سے شادی کر لی تھی۔

محمد حنیف آزاد نے مجھے بتایا "صاحب کو اس کا سخت صدمہ پہنچا تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ وہ کسی مسلمان سے شادی کرے۔ خواہ وہ کسی بھی رنگ و نسل کا ہو۔ لیکن ان کی لڑکی یہ جواب پیش کرتی تھی کہ "جب صاحب کو اپنی شریکِ زندگی منتخب کرنے میں آزادی حاصل تھی تو وہ یہ آزادی اسے کیوں نہیں بخشتے"؟

قائدِ اعظم نے بمبے کے ایک بہت بڑے پارسی کی لڑکی سے شادی کی تھی۔ یہ تو سب کو معلوم ہے، لیکن یہ بات بہت کم آدمیوں کو معلوم ہے کہ پارسی اس رشتے سے بہت ناخوش تھے، ان کی یہ کوشش اور خواہش تھی کہ جناح صاحب سے بدلہ لیں۔

چنانچہ بعض دقیقہ رس اصحاب کا یہ کہنا ہے کہ قائدِ اعظم کی لڑکی کا پارسی لڑکے سے شادی کرنا ایک منظم سازش کا نتیجہ ہے، میں نے جب اس کا ذکر آزاد سے کیا تو اس نے کہا "اللہ بہتر جانتا ہے، لیکن مجھے صرف اس قدر معلوم ہے کہ صاحب کی زندگی میں اپنی بیوی کی موت کے بعد یہ دوسرا بڑا صدمہ تھا۔ جب ان کو معلوم ہوا کہ انکی صاحبزادی نے ایک پارسی سے شادی کر لی ہے تو وہ بے حد متاثر ہوئے، ان کا چہرہ اس قدر لطیف تھا کہ معمولی سے معمولی واقعہ بھی اس پر اُتار چڑھاؤ پیدا کر دیتا تھا۔ جو دوسروں کو فوراً نظر آجاتا تھا۔ ماتھے پر ہلکی سی شکن ایک خوفناک خط کی صورت اختیار کر جاتی تھی ــــ ان کے دل و دماغ پر اس حادثے سے کیا گذری، اس کے متعلق مرحوم ہی کچھ کہہ سکتے تھے ہمیں صرف خارجی ذریعوں سے جو کچھ معلوم ہوا اس کی بنا پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ بہت مضطرب رہے، پندرہ روز تک وہ کسی سے نہ ملے۔ اس دوران میں انہوں نے سینکڑوں سگار پھونک ڈالے ہوں گے۔ اور سینکڑوں میل ہی اپنے کمرے میں ادھر اُدھر چکر لگا کر طے کئے ہوں گے۔"

سوچ بچار کے عالم میں ان کو ادھر اُدھر ٹہلنے کی عادت تھی۔ رات کے سنّاٹے میں وہ اکثر پختہ اور بے داغ فرش پر ایک عرصے تک ٹہلتے رہتے تھے۔ نپے تلے قدم اِدھر سے اُدھر ایک فاصلہ، خاموش فضا، جب وہ چلتے تو ان کے سفید اور کالے یا سفید اور براؤن شوز ایک عجیب قسم کی یک آہنگ ٹک ٹک پیدا کرتے، جیسے کلاک معیّن وقفوں کے بعد اپنی زندگی کی خبر دے رہا ہے۔ قائدِ اعظم کو اپنے جوتوں سے

پیار تھا، اس لئے کہ وہ ان کے قدموں میں ہوتے تھے اور ہر وقت ان کے اشاروں پر چلتے تھے۔

پندرہ دن مسلسل ذہنی اور روحانی طور پر مضطرب رہنے کے بعد ایک روز ایکا ایکی نمودار ہوئے، ان کے چہرے پر اب اس صدمے کا کوئی اثر باقی نہیں تھا۔ ان کی گردن جس میں فرطِ غم کے باعث خفیف سا خم پیدا ہو گیا تھا، پھر اسی طرح سیدھی اور اکڑی ہوئی تھی۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اس صدمے کو بالکل بھول گئے تھے۔

جب آزاد نے قائدِ اعظم کی زندگی کے اس صدمے کا ذکر دوبارہ چھیڑا تو میں نے اس سے پوچھا۔ "وہ اس صدمے کو نہیں بھولے تھے۔ یہ تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

آزاد نے جواب دیا۔ "ملازموں سے کیا بات چھپی رہتی ہے۔ کبھی کبھی وہ بڑا صندوق کھلوانے کا حکم دیتے تھے۔ جست کے اس جہازی صندوق میں بیشمار کپڑے تھے، ان کی مرحوم بیوی اور نافرمانبردار لڑکی کے، جب وہ چھوٹی سی بچی تھی۔ یہ کپڑے باہر نکالے جاتے تو صاحب بڑی سنگین خاموشی سے ان کو دیکھتے رہتے۔ ایک دم ان کے دبلے پتلے اور شفاف چہرے پر غم و اندوہ کی لکیروں کا ایک جال سا بکھر جاتا۔ اِٹ از آل رائٹ ــــ اِٹ از آل رائٹ، کہہ کر وہ اپنی آنکھ سے مونوکل اُتارتے اور اسے پونچھتے ہوئے ایک طرف چل دیتے۔"

محمد حنیف آزاد کے بیان کے مطابق قائدِ اعظم کی تین بہنیں ہیں۔ "فاطمہ جناح، رحمت جناح، تیسری کا نام مجھے یاد نہیں۔ وہ ڈونگری میں رہتی تھیں۔ چوپاٹی کورنر

نزد چناٹی موٹر ورکس پر رحمت جناح مقیم تھیں، ان کے شوہر کہیں ملازم تھے، آمدن قلیل تھی، صاحب ہر مہینے مجھے ایک بند لفافہ دیتے۔ جس میں کچھ کرنسی نوٹ ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ کبھی کبھی ایک پارسل سا بھی دیتے۔ جس میں غالباً کپڑے وغیرہ ہوتے تھے۔ یہ چیزیں مجھے رحمت جناح کے ہاں پہنچانا ہوتی تھیں۔ یہاں مس فاطمہ جناح اور خود صاحب بھی کبھی کبھی جایا کرتے تھے۔ وہ بہن جو ڈونگری میں رہتی تھیں شادی شدہ تھیں، ان کے متعلق مجھے صرف اتنا معلوم ہے کہ آسودہ حال تھیں، اور کسی امداد کی محتاج نہیں تھیں۔ ایک بھائی تھا۔ اس کی مدد وہ باقاعدہ کرتے تھے۔ مگر اس کو گھر میں آنے کی اجازت نہیں تھی۔"

قائد اعظم کے اس بھائی کو میں نے بمبے میں دیکھا ہے، سوائے بار میں ایک شام کو میں نے دیکھا کہ قائد اعظم کی شکل و صورت کا ایک آدمی آدھا رم کا آرڈر دے رہا ہے ویسا ہی ناک نقشہ، ویسے ہی الٹے کنگھی کئے ہوئے بال۔ قریب قریب ویسی ہی سفید لٹ۔ میں نے کسی سے اس کے بارے میں استفسار کیا تو معلوم ہوا کہ وہ مسٹر محمد علی جناح کا بھائی احمد علی ہے۔ میں بہت دیر اس کو دیکھتا رہا۔ رم کا آدھا پیگ اس نے بڑی شان سے آہستہ آہستہ لبوں کے ذریعے سے چوس چوس کر ختم کیا۔ بل جو ایک روپے سے کم تھا یوں ادا کیا جیسے ایک بہت بڑی رقم ہے۔ اور اس کی نشست سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ بمبے کی ایک گھٹیا بار کے بجائے تاج محل ہوٹل کے شراب خانے میں بیٹھا ہے۔

گاندھی جناح کی تاریخی ملاقات سے کچھ دیر پہلے بمبے میں مسلمانوں کا ایک تاریخی اجتماع ہوا۔ میرے ایک دوست اس جلسے میں موجود تھے۔ انہوں نے مجھے بتایا۔ کہ پلیٹ فارم پر قائدِ اعظم اپنے مخصوص انداز میں تقریر کر رہے تھے۔ اور بہت دور ان کا بھائی احمد علی آنکھ پر مونوکل لگائے کچھ اس انداز سے کھڑا تھا جیسے وہ اپنے بھائی کے الفاظ دانتوں تلے چبا رہا ہے۔

اندرونِ خانہ کھیلوں میں قائدِ اعظم کو صرف بلیئرڈ سے دلچسپی تھی۔ "کبھی کبھی جب ان کو اس کھیل سے شغل فرمانے کی خواہش ہوتی تو وہ بلیئرڈ رُوم کھلوانے کا حکم دیتے۔ صفائی یوں تو ہر کمرے میں ہر روز ہوتی تھی، مگر جب وہ کسی خاص کمرے میں جانے کا ارادہ فرماتے تو ملازمین ان کے داخلے سے پہلے اپنا اچھی طرح اطمینان کر لیتے۔ کہ ہر چیز صاف ستھری اور ٹھیک ٹھاک ہے۔ بلیئرڈ روم میں مجھے جانے کی اجازت تھی۔ اس لئے کہ مجھے بھی اس کھیل سے تھوڑا بہت شغف ہے۔ بارہ گیندیں اُن کی خدمت میں پیش کر دی جاتیں، ان میں سے وہ انتخاب کرتے اور کھیل شروع ہو جاتا۔ محترمہ فاطمہ جناح پاس ہوتیں، صاحب سگار سلگا کر ہونٹوں میں دبا لیتے۔ اور اُس گیند کی پوزیشن کو اچھی طرح جانچتے جس کے ٹھوکر لگانا ہوتی تھی، اس جانچ پڑتال میں وہ کئی منٹ صرف کرتے۔ کبھی ایک زاویے سے دیکھتے۔ کبھی دوسرے زاویے سے۔ ہاتھ میں کیو کو تولتے، اپنی پتلی پتلی انگلیوں پر اسے سارنگی کے گز کی طرح پھیرتے۔ زیرِ لب کچھ کہتے، شست باندھتے۔ مگر کوئی دوسرا مناسب و موزوں زاویہ اُن کے ذہن میں آجاتا اور

وہ اپنی ضرب روک لیتے۔ ہر طرف سے اپنا پورا اطمینان کرنے پر جب کیو گیند کے ساتھ ٹکراتے اور نتیجہ ان کے حساب کے مطابق ٹھیک نکلتا تو اپنی بہن کی طرف فاتحانہ انداز میں دیکھ کر مسکرا دیتے۔"

سیاست کے کھیل میں بھی قائدِ اعظم اسی طرح محتاط تھے۔ وہ ایک دم کوئی فیصلہ نہیں کرتے تھے۔ ہر مسئلے کو وہ بلیئرڈ کے میز پر پڑی ہوئی گیند کی طرح ہر زاویے سے بغور دیکھتے تھے اور صرف اسی وقت اپنے کیو کو حرکت میں لاکر ضرب لگاتے تھے، جب ان کو اس کے کارگر ہونے کا پورا وثوق ہوتا تھا۔ وار کرنے سے پہلے شکار کو اپنی نگاہوں میں اچھی طرح تول لیتے تھے۔ اُس کی نشست کے تمام پہلوؤں پر غور کر لیتے تھے، پھر اس کی جسامت کے مطابق ہتھیار منتخب کرتے تھے، وہ ایسے نشانچی نہیں تھے کہ پستول اُٹھایا اور داغ دیا، اس یقین کے ساتھ کہ نشانہ خطا نہیں جائے گا۔ نشانچی کی ہر ممکن خطا شست باندھنے سے پہلے اُن کے پیشِ نظر رہتی تھی۔

آزاد کے بیان کے مطابق قائدِ اعظم عام ملاقاتوں سے پرہیز کرتے تھے۔ دور از کار باتوں سے انہیں سخت نفرت تھی، صرف مطلب کی بات اور وہ بھی انتہائی اختصار کے ساتھ سننے اور کرنے کی عادت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے خاص کمرے میں جہاں بہت کم لوگوں کو داخلے کی اجازت تھی۔ صرف ایک صوفہ تھا۔ اس صوفے کے ساتھ ایک چھوٹی سی تپائی تھی۔ اس میں صاحب اپنے سگار کی راکھ پھینکتے تھے۔ صوفے کے بالمقابل دو شوکیس تھے۔ ان میں وہ قرآن مجید رکھے رہتے تھے۔ جو

ان کے عقیدت مندوں نے ان کو تحفے کے طور پہ دیئے تھے۔ اس کمرے میں ان کے ذاتی کاغذات بھی محفوظ تھے۔ عام طور پر وہ اپنا زیادہ وقت اسی کمرے میں گذارتے تھے۔ اس میں کوئی میز نہیں تھا۔ مطلوب یا کوئی اور شخص جب بھی اس کمرے میں بلایا جاتا تو اُسے دروازے میں کھڑا رہنا پڑتا۔ یہیں وہ صاحب کے احکام سنتا اور اُلٹے پاؤں چلا جاتا ـــ صوفے کے خالی حصّے پر اُن کے زیرِ مطالعہ کاغذات بکھرے رہتے تھے۔ کوئی خط لکھوانا ہوتا تو مطلوب کو یا اسٹینو کو بلواتے اور خط یا بیان کی عبارت بول دیتے۔ ان کے لہجے میں ایک قسم کی کرختگی تھی۔ میں انگریزی زبان کے مزاج سے واقف نہیں ہوں۔ لیکن جب وہ بولتے تھے تو ایسا محسوس ہوتا کہ وہ زور نہ دینے والے الفاظ پہ بھی زور دے رہے ہیں"

آزاد کے مختلف بیانات سے یہی معلوم ہوتا ہے۔ کہ قائدِ اعظم کی جسمانی کمزوری کا غیر شعوری یا تحت الشعوری احساس ہی ان کرخت مظاہر کا باعث تھا۔ ان کی زندگی حباب برآب تھی، مگر وہ ایک بہت بڑا بھنور بن کے رہتے تھے۔ بعض اصحاب کا تو یہ کہنا ہے کہ وہ اتنے دن صرف اسی قوت کے بل پر جئے ـــ جسمانی کمزوری کے اس احساس کی قوت پر۔

محمد حنیف آزاد کے بیان کے مطابق بہادر یار جنگ مرحوم قائدِ اعظم کے بہترین ... انہر سے اُن کے مراسم بہت بے تکلفانہ تھے۔ وہ جب بھی ان کے یہاں قیام کرتے تو یہ دونو ... میں بھیٹھ دوستانہ انداز میں قومی اور

سیاسی مسائل پر غور کرتی تھیں۔ اُس وقت قائدِ اعظم اپنی آمریت کچھ عرصے کے لئے اپنی شخصیت سے جدا کر دیتے ــــ" میں نے صرف یہی ایک شخص دیکھا جس سے صاحب ہمجولی کی طرح باتیں کرتے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ بچپن کے ساتھی ہیں۔ جب آپس میں باتیں کرتے تو کئی مرتبہ قید و بند سے آزاد قہقہوں کی آواز سنائی دیتی ــــ بہادر یار جنگ کے علاوہ مسلم لیگ کے دوسرے سربر آوردہ اراکین۔ مثال کے طور پر راجہ محمود آباد۔ آئی۔ آئی چندریگر۔ مولانا زاہد حسین۔ نوابزادہ لیاقت علیخاں نواب اسمٰعیل اور علی امام صاحب اکثر تشریف لاتے تھے۔ لیکن صاحب ان سے بالکل دفتری انداز میں پیش آتے ــــ وہ بے تکلفی کہاں جو بہادر یار جنگ کے لئے مخصوص تھی۔"

میں نے آزاد سے پوچھا۔ "خان لیاقت علی خاں تو اکثر آتے ہوں گے؟"

آزاد نے جواب دیا۔ "جی ہاں صاحب اُن سے اس طرح پیش آتے تھے۔ جیسے وہ اُن کے سب سے ہونہار شاگرد ہیں۔ اور خان صاحب بھی بڑے ادب اور بڑی سعادت مندی سے اُن کا ہر حکم سنتے اور بجا لاتے تھے۔ جب اُن کی طلبی ہوتی تو وہ مجھ سے کبھی کبھی پوچھ لیا کرتے تھے۔ کہو آزاد صاحب کا موڈ کیسا ہے۔ اُن کا جیسا موڈ ہوتا میں بتا دیا کرتا تھا۔ جب اس میں کوئی خرابی واقع ہو جاتی تو کوٹھی کے تمام در و دیوار کو فوراً پتہ چل جاتا تھا۔"

قائدِ اعظم اپنے ملازمین کے کردار و اطوار کا بہت خیال رکھتے تھے۔ جس طرح

اُن کو تن کے میل سے نفرت تھی۔ اسی طرح وہ من کے میل سے متنفر تھے۔ مطلوب اُن کو بہت پسند تھا۔ مگر جب اُن کو معلوم ہوا۔ کہ وہ ایک رضا کار لڑکی سے محبت کی پینگیں بڑھا رہا ہے۔ تو ان کو بہت کوفت ہوئی۔ مگر وہ اس قسم کی کوفت زیادہ دیر تک برداشت نہیں کرتے تھے۔ اُس کی طلبی ہوئی اور فوراً ملازمت سے علیحدہ کر دیا گیا۔ مگر اس کو رخصت کرنے کے بعد وہ اُس سے اس طرح پیش آئے جس طرح دوستوں سے آتے ہیں۔

آزاد بیان کرتا ہے۔ "ایک بار میں رات کے دو بجے سیر و تفریح سے فارغ ہو کر کوٹھی آیا۔ وہ دن ایسے تھے۔ جب رگوں میں جوانی کے خون کو کھولانے میں ایک عجیب قسم کی لذّت محسوس ہوا کرتی ہے۔ میرا خیال تھا کہ صاحب کو میرے دیر سے آنے کا علم تک نہ ہوگا۔ مگر اُن کو کسی نہ کسی طرح پتہ چل گیا۔ دوسرے روز ہی مجھے طلب فرمایا۔ اور انگریزی میں کہا کہ تم اپنا کیریکٹر خراب کر رہے ہو۔ پھر ٹوٹی پھوٹی اردو میں ارشاد ہوا۔ "ول، اب ٹمہارا شادی بنائے گا"۔۔۔۔ چنانچہ چار ماہ بعد جب وہ بمبئی سے دہلی اجلاس میں شرکت کے لئے تشریف لے گئے۔ تو ان کی ہدایت کے مطابق میری شادی ہو گئی۔ اور یہ میری خوش قسمتی ہے۔ کہ محض ان کی وجہ سے میرا رشتہ سادات خاندان میں ہوا۔ ورنہ میں تو شیخ تھا۔ لڑکی والوں نے مجھے اس لئے قبول کیا۔ کہ آزاد قائدِ اعظم کا غلام ہے۔"

میں نے آزاد سے دفعتہً ایک سوال کیا۔ "کیا تم نے کبھی قائدِ اعظم کے منہ

سے آئی ایم سوری سنا تھا۔"

آزاد نے اپنی موٹی تومند گردن زور سے نفی میں ہلائی۔ "نہیں — کبھی نہیں" — پھر وہ مسکرایا۔ "اگر اتفاق سے کبھی آئی ایم سوری ان کے منہ سے نکل جاتا تو مجھے یقین ہے کہ ڈکشنری میں سے وہ یہ الفاظ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مٹا دیتے!"

میرا خیال ہے آزاد کے اس بے ساختہ جملے میں قائدِ اعظم محمد علی جناح کا پورا پورا کردار آجاتا ہے۔

محمد حنیف آزاد زندہ ہے، اس پاکستان میں جو اس کے قائدِ اعظم نے اُسے عطا کیا ہے۔ اور جو اب اس کے ہونہار شاگرد خان لیاقت علی خاں کی قیادت میں دنیا کے نقشے پر زندہ رہنے کی جدوجہد کر رہا ہے۔ اس آزاد خطۂ زمین پر آزاد، پنجاب آرٹ پکچرز کے دروازے کے باہر پان والے کی دکان کے پاس ٹوٹی ہوئی کھاٹ پر بیٹھا اکثر اپنے آقا کا منتظر رہتا ہے۔ اور اس اچھے وقت کے لئے دست بدعا رہتا ہے۔ جب وقت پر اس کی تنخواہ مل جایا کرے۔ اب وہ قائدِ اعظم کی تلقین کے مطابق ہندو بننے کے لئے بھی تیار رہے بشرطیکہ اس کو اُس کا موقعہ دیا جائے۔

وہ بے حد متفکر تھا، جب میں نے اُس سے قائدِ اعظم کی زندگی کے بارے میں اس کے تاثرات کے متعلق استفسار کیا۔ اس کے پاس پان کے لئے بھی پیسے نہیں تھے میں نے جب اُس کے تفکرات اِدھر اُدھر کی باتوں سے کسی قدر دور کئے تو اُس نے ایک آہ بھر کر کہا۔ "صاحب انتقال فرما گئے ہیں — کاش ان کے اِس سفر میں میں

بھی شریک ہوتا۔ ان کی سفید اوپن پیکارڈ ہوتی، اس کا وہیل میرے ہاتھوں میں ہوتا، اور میں آہستہ آہستہ ان کو منزلِ مقصود تک لے جاتا۔ ان کی نازک طبیعت دھچکوں کو برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ میں نے سنا ہے واللہ اعلم درست ہے یا غلط۔ جب ان کا جہاز کراچی ایروڈروم پر پہنچا تو ان کو گورنمنٹ ہاؤس تک پہنچانے کے لئے جو ایمبولنس تھی اس کا انجن درست حالت میں نہیں تھا۔ وہ کچھ دُور چل کر رُک گئی تھی۔ اس وقت میرے صاحب کو کس قدر کوفت ہوئی ہوگی۔"

آزاد کی موٹی موٹی آنکھوں میں آنسو تھے۔

آغا حشرؔ سے دو (۲) ملاقاتیں

تاریخیں اور سن مجھے کبھی یاد نہیں رہتے، یہی وجہ ہے کہ یہ مضمون لکھتے وقت مجھے کافی الجھن ہو رہی ہے۔ خدا معلوم کون سا سن تھا اور میری عمر کیا تھی، لیکن صرف اتنا یاد ہے کہ بصد مشکل انٹرنس پاس کرکے اور دو دفعہ ایف۔ اے میں فیل ہونے کے بعد میری طبیعت پڑھائی سے بالکل اچاٹ ہو چکی تھی اور جوئے سے میری دلچسپی دن بدن بڑھ رہی تھی۔ کٹڑا جمیل سنگھ میں وینو یا فضلو کمہار کی دکان کے اوپر ایک بیٹھک تھی جہاں دن رات جوا ہوتا تھا۔ فلش کھیلی جاتی تھی۔ شروع شروع میں تو یہ کھیل میری سمجھ میں نہ آیا۔ لیکن جب آ گیا تو پھر میں اسی کا ہو رہا ——— رات کو جو تھوڑی بہت سونے کی فرصت ملتی تھی۔ اس میں بھی خواب راؤنڈوں اور ترپلوں ہی کے آتے تھے۔

ایک برس کے بعد جوئے سے مجھے کچھ اکتاہٹ ہونے لگی۔ طبیعت اب کوئی اور شغل چاہتی تھی ـــــ کیا؟ ـــــ یہ مجھے معلوم نہیں تھا ـــــ دینو یا فضلو کمہار کی بیٹھک میں ایک روز ابراہیم نے جو کہ امرتسر میونسپلٹی میں تانگوں کا داروغہ تھا، آغا حشر کا ذکر کیا - اور بتایا کہ وہ امرتسر آئے ہوئے ہیں۔ میں نے یہ سنا تو مجھے سکول کے وہ دن یاد آگئے۔ جب تین چار پیشہ ور لفنگوں کے ساتھ مل کر ہم نے ایک ڈرامٹیک کلب کھولی تھی۔ اور آغا حشر کا ایک ڈرامہ اسٹیج کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ یہ کلب صرف پندرہ بیس روز قائم رہ سکی تھی۔ اس لئے کہ والد صاحب نے ایک روز دھاوا بول کر ہارمونیم اور طبلے سب توڑ پھوڑ دیئے تھے۔ اور واضح الفاظ میں ہم کو بتا دیا تھا کہ ایسے واہیات شغل انہیں بالکل پسند نہیں۔

اس کلب کے باقیات آغا حشر کے اس ڈرامے کے چند الفاظ ہیں۔ جو میرے ذہن کے ساتھ ابھی تک چپکے ہوئے ہیں۔ "ارتاتھ اس کے کرم ہیں۔" میرا خیال ہے جب داروغہ ابراہیم نے آغا حشر کا ذکر کیا تو مجھے اس وقت ڈرامے کا پورا ایک پیرا یاد تھا، چنانچہ مجھے اس خبر سے ایک گونہ دلچسپی پیدا ہو گئی۔ کہ آغا حشر امرتسر میں ہے

آغا صاحب کا کوئی ڈرامہ دیکھنے کا مجھے اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اس لئے کہ رات کو گھر سے باہر رہنے کی مجھے قطعاً اجازت نہیں تھی۔ ان کے ڈرامے بھی میں نے نہیں پڑھے تھے۔ اس لئے کہ مجھے مسٹریز آف کورٹ آف لنڈن اور تیرتھ رام فیروزپوری کے ترجمہ کردہ انگریزی جاسوسی ناول جیسی کتابیں پڑھنے کا شوق تھا لیکن

اس کے باوجود امرتسر میں آغا صاحب کی آمد کی خبر نے مجھے کافی متاثر کیا۔
آغا صاحب کے متعلق بے شمار باتیں مشہور تھیں۔ ایک تو یہ کہ وہ کوچہ وکیلاں میں رہا کرتے تھے جو ہماری گلی تھی، جس میں ہمارا مکان تھا۔ آغا صاحب بہت بڑے آدمی تھے ـــــ کشمیری تھے، یعنی میرے ہم قوم ـــــ اور پھر میری گلی میں وہ کبھی اپنے بچپن کے ایام گذار چکے تھے۔ ان تمام باتوں کا نفسیاتی اثر جو مجھ پر ہوا آپ اُس سے بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔

داروغہ ابراہیم سے جب میں نے آغا صاحب کے متعلق کچھ اور پوچھا تو اس نے وہی باتیں بتائیں جو میں اوروں سے ہزار مرتبہ سن چکا تھا کہ وہ پرلے درجے کے عیّاش ہیں۔ دن رات شراب کے نشّے میں وہت رہتے ہیں۔ بے حد گندہ دہن ہیں ـــــ ایسی ایسی گالیاں ایجاد کرتے ہیں کہ مغلّظات میں جن کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ بڑے سے بڑے آدمی کو بھی خاطر میں نہیں لاتے ـــــ کمپنی کے فلاں فلاں سیٹھ نے جب ان سے ایک بار ڈرامے کا تقاضا کیا تو انہوں نے اس کو اتنی موٹی گالی دی جو ہمیشہ کے لئے اس کے دل میں آغا صاحب کے خلاف نفرت پیدا کرنے کے لئے کافی تھی۔ لیکن حیرت ہے کہ سیٹھ نے اُف نہ کی، اور ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا "آغا صاحب ہم آپ کے نوکر ہیں" ـــــ بدیہہ گو تھے ـــــ ایک مرتبہ ریہرسل ہو رہی تھی۔ گرمی کے باعث ایک ایکٹرس بار بار ماتھے پر سے انگلی کے ساتھ پسینہ پونچھ رہی تھی۔ آغا صاحب جھنجھلائے اور ایک شعر موزوں ہو گیا۔

ابرو نہ سنوارا کرو کٹ جائے گی اُنگلی
نادان ہو تلوار سے کھیلا نہیں کرتے

ریہرسل ہو رہی تھی۔ لفظ "فنڈ" ایک ایکٹرس کی زبان پر نہیں چڑھتا تھا۔ آغا صاحب نے گرج کر "فنڈ" کا ایک ہم قافیہ لفظ لڑھکا دیا ـــــ ایکٹرس کی زبان پر فوراً "فنڈ" چڑھ گیا۔

آغا صاحب کے کان تک یہ بات پہنچی کہ حاسد یہ پروپیگنڈا کر رہے ہیں۔ کہ ہندی کے ڈرامے ان کے اپنے لکھے ہوئے نہیں کیونکہ وہ ہندی زبان سے بالکل ناواقف ہیں۔ آغا صاحب سٹیج پر ڈرامہ شروع ہونے سے پہلے آئے اور حاضرین سے کہا۔ "میرے متعلق چند مفسدہ پرداز یہ بات پھیلا رہے ہیں کہ میں نے اپنے ہندی کے ڈرامے کرائے کے پنڈتوں سے لکھوائے ہیں ـــــ میں اب آپ کے سامنے شدھ ہندی میں تقریر کروں گا" ـــــ چنانچہ آغا صاحب دو گھنٹے تک ہندی میں تقریر کرتے رہے جس میں ایک لفظ بھی اردو یا فارسی کا نہیں تھا۔

آغا صاحب جس ایکٹرس کی طرف نگاہ اٹھاتے تھے۔ وہ فوراً ہی ان کے ساتھ خلوت میں چلی جاتی تھی۔

آغا صاحب منشیوں کو حکم دیتے تھے کہ "تیار ہو جاؤ" اور شراب پی کر ٹہلتے ٹہلتے بیک وقت کومیڈی اور ٹریجڈی لکھوانا شروع کر دیتے تھے

آغا صاحب نے کبھی کسی عورت سے عشق نہیں کیا ـــــ لیکن مجھے داروغہ ابراہیم

کی زبانی معلوم ہؤا کہ یہ بات جھوٹ ہے۔ کیونکہ وہ امرتسر کی مشہور طوائف مختار پر عاشق ہیں۔ وہی مختار جس نے "عورت کا پیار" فلم میں ہیروئن کا پارٹ ادا کیا ہے۔

مختار کو میں نے دیکھا ہؤا تھا۔ ہال بازار میں افو ہ پینٹر کی دُکان پہ بیٹھ کر ہم قریب قریب ہر جمعرات کی شام کو مختار عرف داری کو نئے سے نئے فیشن کے کپڑوں میں ملبوس دوسری طوائفوں کے ہمراہ "ظاہرا پیر" کی درگاہ کی طرف جاتے دیکھا کرتے تھے۔

آغا صاحب شکل و صورت کے کیسے تھے۔ یہ مجھے معلوم نہیں تھا۔ کچھ چھپی ہوئی تصویریں دیکھنے میں آئی تھیں۔ مگر ان کی چھپائی اس قدر واہیات تھی کہ صورت پہچانی ہی نہیں جاتی تھی۔ عمر کے متعلق صرف اتنا معلوم تھا۔ کہ وہ اب ضعیف ہو چکے ہیں — اس زمانے میں یعنی عمر کے آخری وقت میں ان کو مختار سے کیسے عشق ہؤا۔ اس پر ہم سب کو جو دینو یا فضلو کمہار کی بیٹھک میں جؤا کھیل رہے تھے سخت تعجب ہؤا تھا — مجھے یاد ہے نال کے پیسے نکالتے ہوئے دینو یا فضلو کمہار نے گردن ہلا کر بڑے فلسفیانہ انداز میں کہا تھا۔ "بڑھاپے کا عشق بڑا قاتل ہوتا ہے۔"

ایک بار آغا صاحب کا ذکر بیٹھک پر ہؤا تو پھر قریب قریب ہر روز ان کی باتیں ہونے لگیں۔ ہم میں سے صرف دار وغہ ابراہیم آغا صاحب کو ذاتی طور پہ جانتا تھا۔ ایک روز اس نے کہا۔ "کل رات ہم مختار کے کوٹھے پہ تھے — آغا صاحب گاؤ تکیئے کا سہارا لئے بیٹھے تھے۔ ہم میں سے باری باری ہر ایک نے ان سے پر زور درخواست کی کہ وہ اپنے نئے فلمی ڈرامے "رستم و سہراب" کا کوئی قصّہ سنائیں، مگر

انہوں نے انکار کر دیا۔ ہم سب مایوس ہو گئے۔ ایک نے مختار کی طرف اشارہ کیا۔ وہ آغا صاحب کی بغل میں بیٹھ گئی اور ان سے کہنے لگی۔ "آغا صاحب ہمارا حکم ہے۔ کہ آپ 'رستم و سہراب' سنائیں!" —— آغا صاحب مسکرائے اور بیٹھ کر رستم کا پُر زور مکالمہ ادا کرنا شروع کر دیا۔ اللہ اللہ کیا گرج دار آواز تھی۔ معلوم ہوتا تھا۔ کہ پانی کا تیز دھارا پہاڑ کے پتھروں کو بہائے لئے چلا جا رہا ہے۔"

ایک دن ابراہیم نے بتایا کہ آغا صاحب نے پینا یک قلم ترک کر دیا ہے۔ جو آغا صاحب کے متعلق زیادہ جانتے تھے۔ ان کو بہت تعجب ہوا۔ ابراہیم نے کہا کہ یہ فیصلہ انہوں نے حال ہی میں مختار سے عشق ہونے کی وجہ سے کیا ہے۔ یہ عشق بھی کیا بلا تھی۔ ہم سمجھ نہ سکے۔ لیکن دینو یا فضلو نے نال کے کل پیسے اپنے تہمد کے ڈب میں باندھتے ہوئے ایک بار پھر کہا۔ "بڑھاپے کے عشق سے خدا بچائے —— بڑی ظالم چیز ہوتی ہے۔"

جوئے سے طبیعت اکتا ہی چکی تھی۔ میں نے بیٹھک جانا آہستہ آہستہ چھوڑ دیا اس دوران میں میری ملاقات باری صاحب اور حاجی لق لق سے ہوئی جو روزنامہ "مساوات" کے ایڈیٹر مقرر ہو کر امرتسر آئے ہوئے تھے۔ جیجے کے ہوٹل "شیراز" میں دونوں چائے پینے آتے تھے اور ادب اور سیاست پر باتیں کرتے تھے۔ ان سے میری ملاقات ہوئی۔ باری صاحب کو میں نے بہت پسند کیا۔ اسی دوران میں جیجے نے اختر شیرانی مرحوم کو مدعو کیا۔ دن رات ٹھرّے کے دور چلنے لگے شعر و ادب سے

میری دلچسپی بڑھنے لگی۔ جو وقت پہلے فلش کھیلنے میں کٹتا تھا۔ اب "مساوات" کے دفتر میں کٹنے لگا۔ کبھی کبھی باری صاحب ایک آدھ خبر ترجمے کے لئے مجھے دے دیتے جو میں ٹوٹی پھوٹی اردو میں کر دیا کرتا تھا۔ آہستہ آہستہ میں نے فلمی خبروں کا ایک کالم سنبھال لیا۔ بعض دوستوں نے کہا کہ محض خرافات ہوتی ہے۔ لیکن باری صاحب کہا، "بکواس کرتے ہیں۔ تم اب طبعزاد مضمون لکھنے شروع کرو۔"

طبعزاد مضمون تو مجھ سے لکھے نہ گئے۔ لیکن فرانسیسی ناول نگار کی ایک کتاب "لاسٹ ڈیز آف کنڈمنڈ" میری الماری میں پڑی تھی۔ باری صاحب اٹھا کر لے گئے دوسرے روز دوپہر کے قریب میں "مساوات" کے دفتر میں گیا تو کاتبوں سے معلوم ہوا کہ باری صاحب کو سرسام ہو گیا ہے۔ ایک کتاب صبح سے بلند آواز میں پڑھ رہے ہیں۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد یہاں آتے ہیں۔ اور ایک لوٹا ٹھنڈے پانی کا سر پر ڈلوا کر اپنے کمرے میں چلے جاتے ہیں۔ میں ادھر گیا تو دروازے بند تھے اور وہ خطیبانہ انداز میں انگریزی کی کوئی نہایت ہی زور دار عبارت پڑھ رہے تھے میں نے دستک دی۔ دروازہ کھلا۔ باری صاحب کرتے پجامے بغیر باہر آئے۔ ہاتھ میں وکٹر ہیوگو کی کتاب تھی۔ اسے میری طرف بڑھا کر انگریزی میں کہا۔ "اٹ از اے ویری ہوٹ ٹک" اور جب کتاب پڑھنے کی گرمی دور ہوئی تو مجھے مشورہ دیا کہ میں اس کا ترجمہ کردوں۔"

میں نے کتاب پڑھی۔ لکھنے کا انداز بہت ہی مؤثر اور خطیبانہ تھا۔ شراب

پی کر ترجمہ کرنے کی کوشش کی۔ مگر نظروں کے سامنے سطریں گڈمڈ ہو گئیں۔ صحن میں پلنگ بچھوا کر حقے کی نے منہ میں لے کر اپنی بہن کو ترجمہ لکھوانے کی کوشش کی۔ مگر اس میں بھی ناکام رہا۔ آخر میں اکیلے بیٹھ کر دس پندرہ دنوں کے اندر اندر ڈکشنری سامنے رکھ کر ساری کتاب کا ترجمہ کر ڈالا۔ باری صاحب نے بہت پسند کیا۔ اس کی اصلاح کی۔ اور یعسوب حسن مالک اردو بک سٹال کے پاس تیس روپے میں بکوا دیا۔ یعسوب حسن نے اسے بہت ہی قلیل عرصے میں چھاپ کر شائع کر دیا۔

اب میں صاحبِ کتاب تھا۔

"مساوات" بند ہو گیا۔ باری صاحب، لاہور کسی اخبار میں چلے گئے۔ جیجے کا ہوٹل سونا ہو گیا۔ میرے لئے کوئی شغل نہ رہا۔ لکھنے کی چاٹ پڑ گئی تھی۔ لیکن چونکہ دوستوں سے داد نہ ملتی تھی۔ اس لئے ادھر کوئی توجہ نہ دی۔ اب پھر دینو یا فضلو کمہار کی بیٹھک تھی۔ جوا کھیلتا تھا۔ مگر اس میں اب وہ پہلا سا لطف اور پہلی سی حرارت نہیں تھی۔

ایک دن داروغہ ابراہیم نے فلش کھیلنے کے دوران میں بتایا کہ آغا حشر آئے ہوئے ہیں۔ اور مختار کے یہاں ٹھیرے ہوئے ہیں۔ میں نے اس سے کہا۔ کسی روز مجھے وہاں لے چلو۔ ابراہیم نے وعدہ تو کر لیا مگر پورا نہ کیا۔ جب میں نے تقاضا کیا تو اس نے یہ کہہ کر ٹرخا دیا۔ "آغا صاحب لاہور چلے گئے ہیں۔"

میرا ایک دوست تھا ہری سنگھ، اللہ بخشے خوب آدمی تھا۔ پانچ مکان بیچ کر

دو مرتبہ سارے یورپ کی سیر کر چکا تھا۔ اور ان دنوں چھٹے اور آخری مکان کو آہستہ آہستہ بڑے سلیقے کے ساتھ کھا رہا تھا۔ فرانس میں صرف چھ مہینے رہا تھا۔ لیکن فرانسیسی زبان بڑی بے تکلفی سے بول لیتا تھا۔ بہت ہی دبلا پتلا، مریل سا انسان تھا، مگر بلا کا پھرتیلا چرب زبان اور دھانسو، یعنی برمے کی طرح اندر دھنس جانے والا۔ ایک روز میں نے اس سے آغا حشر کا ذکر کیا۔ اس نے فوراً ہی پوچھا۔ "کیا تم اس سے ملنا چاہتے ہو؟" میں نے کہا۔ "بہت دیر سے میری خواہش ہے کہ ان کو ایک نظر دیکھوں ـــ" ہری سنگھ نے فوراً ہی کہا۔ "اس میں کیا مشکل ہے۔ جب سے وہ یہاں امرتسر میں، پنڈت محسن کے ہاں ٹھہرا ہوا ہے، قریب قریب ہر روز میری اس سے ملاقات ہوتی ہے ـــ" میں اچھل پڑا۔ "تو ہری کل شام کو تم مجھے ان کے پاس لے چلو۔" ہری نے اپنا وسکی کا گلاس اپنے پتلے ہونٹوں سے لگایا۔ اور بڑی نزاکت سے ایک چھوٹا سا گھونٹ بھر کے فرانسیسی زبان میں کچھ کہا۔ جس کا مطلب تھا، "یقیناً میرے دوست۔"

اور ہری سنگھ دوسرے روز شام کو مجھے آغا حشر کاشمیری کے پاس لے گیا۔

پنڈت محسن جیسا کہ نام سے ظاہر ہے کشمیری پنڈت تھے۔ نام ان کا جانے کیا تھا محسن ان کا تخلص تھا۔ مشاعروں میں پرانی دقیانوسی شاعری کے نمونے کے طور پر پیش ہوتے تھے۔ آپ کا کاروباری تعلق کٹڑہ گھنیاں کے امرت سنیما سے تھا۔

آغا صاحب سے پنڈت جی کی دوستی معلوم نہیں شاعری کی وجہ سے تھی۔ یا

سینما کی وجہ سے۔ یا کٹڑہ گھنیاں اس کا باعث تھا۔ جس میں امرت سینما اور مختار کا بالا خانہ بالکل آمنے سامنے تھے۔ سبب کچھ بھی ہو، آغا صاحب پنڈت محسن کے ہاں ٹھیرے ہوئے تھے اور جیسا کہ مجھے ان کی باہم گفتگو سے پتہ چلا، دونوں ایک دوسرے سے بے تکلّف تھے۔

پنڈت محسن کی بیٹھک یا دفتر کٹڑہ گھنیاں کے پاس نشیم والے بازار سے نکل کر آگے جہاں سبزی کی دکانیں شروع ہوتی ہیں۔ ایک بڑی سی ڈیوڑھی کے اوپر واقع تھا۔ ہری سنگھ آگے تھا۔ میں اس کے پیچھے۔ سیڑھیاں چڑھتے وقت میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ میں آغا حشر کو دیکھنے والا تھا۔

باہر صحن میں کرسیوں پر کچھ آدمی بیٹھے تھے۔ ایک کونے میں تخت پر پنڈت محسن بیٹھے گڑگڑی پی رہے تھے۔ سب سے پہلے ایک عجیب و غریب آدمی میری نگاہوں سے ٹکرایا۔ چیختے ہوئے لال رنگ کی چمکدار ساٹن کا لاچا، دو گھوڑے کی بوسکی کی کالر والی سفید قمیص، کمر پر گہرے نیلے رنگ کا پھندنوں والا آزار بند، بڑی بڑی بے ہنگم آنکھیں —— میں نے سوچا کٹڑہ گھنیاں کا کوئی پیر ہوگا۔ لیکن فوراً ہی کسی نے اس کو "آغا صاحب" کہہ کر مخاطب کیا۔ مجھے دھکّا سا لگا۔

ہری سنگھ نے بڑھ کر اس عجیب و غریب آدمی سے مصافحہ کیا، اور میری طرف اشارہ کر کے اس سے کہا۔ "میرے دوست سعادت حسن منٹو —— آپ سے ملنے کے بہت مشتاق تھے۔"

آغا صاحب نے اپنی بڑی بڑی بے ہنگم آنکھیں میری طرف گھمائیں اور مسکرا کر کہا۔ "لارڈ منٹو سے کیا رشتہ ہے تمہارا؟"

میں تو جواب نہ دے سکا۔ لیکن ہری سنگھ نے کہا۔ "آپ منٹو نہیں منٹو ہیں۔۔۔ کشمیری۔"

آغا صاحب نے ایک لمبی "اوہ" کی۔ اور پنڈت محسن سے کشمیریوں کی "ال" کے متعلق طویل گفتگو شروع کر دی۔ میں پاس ہی بنچ پر بیٹھ گیا۔ پنڈت جی کو قطعاً آغا صاحب کی اس گفتگو سے دلچسپی نہیں تھی۔ کیونکہ وہ بار بار ان سے کہتے تھے۔ "آغا صاحب! اس کو چھوڑیئے۔ یہ بتایئے کہ آپ کب میرے لئے ڈبل کا مزاحیہ ڈرامہ لکھیں گے۔"

آغا صاحب کو اس مزاحیہ ڈرامے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ گفتگو تو کشمیریوں کی "ال" کے بارے میں کر رہے تھے۔ مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دماغ کچھ اور ہی سوچ رہا ہے۔ ایک دو بار انھوں نے دورانِ گفتگو میں اپنے نوکر کو موٹی موٹی گالیاں دے کر یاد کیا کہ وہ ابھی تک آیا کیوں نہیں۔

آغا صاحب جب خاموش ہوئے تو پنڈت محسن نے ان سے کہا۔ "آغا صاحب اس وقت آپ کی طبیعت موزوں ہے۔ میں کاغذ قلم لاتا ہوں، آپ وہ کومیڈی لکھوانا شروع کر دیجئے۔"

آغا صاحب کی ایک آنکھ بھینگی تھی۔ آپ نے اسے گھما کر کچھ عجیب انداز سے پنڈت جی کی طرف دیکھا۔ "ابے چپ کر۔ آغا حشر کی طبیعت ہر وقت موزوں ہوتی ہے۔"

پنڈت جی خاموش ہو گئے اور اپنی گُڑگُڑی گُڑ گُڑانے لگے۔ دفعتہً مجھے محسوس ہُوا کہ میرا سر چکرا رہا ہے۔ تیز خوشبو کے بھبکے آرہے تھے۔ میں نے دیکھا آغا صاحب کے دونوں کانوں میں عطر کے پھوئے ٹھنسے ہوئے تھے۔ اور غالباً سر بھی عطر ہی سے چپڑا ہُوا تھا۔ میں کچھ تو اس تیز خوشبو اور کچھ آغا صاحب کے لاچے اور آزار بند کے شوخ رنگوں میں قریب قریب غرق ہو چکا تھا۔

بازار میں دفعتہً شور و غل برپا ہُوا۔ ایک صاحب نے اُٹھ کر باہر جھانکا اور آغا صاحب سے کہا۔ "آغا صاحب تشریف لائیے۔ مہندی کا جلوس آرہا ہے۔"

آغا صاحب نے کہا۔ "بکواس ہے۔" اور حادثۂ کربلا پر نہایت ہی محققانہ لکچر دینا شروع کر دیا۔ ایسے ایسے نکتے نکالے کہ سب دنگ رہ گئے۔ آخر میں بڑے ڈرامائی انداز میں کہا۔ "دجلے کا منہ بند تھا۔ فرات خشک پڑی تھی۔ پینے کو پانی کی ایک بوند نہیں تھی۔ مہندی گوندھی کس سے گئی ——— آغا حشر......" اس سے آگے کہتے کہتے رُک گئے۔ ایک صاحب جو غالباً شیعہ تھے۔ محفل سے اُٹھ کر چلے گئے۔ آغا صاحب نے موضوع بدل دیا۔

پنڈت محسن کو موقعہ ملا۔ چنانچہ انہوں نے پھر درخواست کی۔ "آغا صاحب دو ریل کی کامیڈی آپ کو لکھنی ہو گی۔"

آغا صاحب نے یہ موٹی گالی دی۔ "کامیڈی کی...... یہاں ٹریجڈی کی باتیں ہو رہی تھیں اور تم اپنی کامیڈی لے آئے ہو۔" یہ کہہ کر آغا صاحب نے حادثۂ کربلا

کے بارے میں پھر عالمانہ انداز میں بحث شروع کر دی۔ کیونکہ وہ جی بھر کے اس موضوع پر اپنی معلومات اور خیالات کا اظہار نہیں کر سکے تھے۔ مگر فوراً جانے کیا جی میں آئی کہ ایک دم اپنے نوکر کو گالیاں دینا شروع کر دیں۔ کہ وہ ابھی تک آیا کیوں نہیں۔ چنانچہ وہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد ادھر اُدھر کی باتیں شروع ہوئیں کسی نے آغا صاحب سے مولانا ابوالکلام کے تبحر علم کے بارے میں پوچھا تو آپ نے اس کا جواب کچھ یوں دیا۔ "محی الدین کے متعلق پوچھتے ہو۔ ہم دونوں اکٹھے امرکی اور عیسائی مبلغوں سے مناظرے لڑتے رہے ہیں۔ گھنٹوں اپنا گلا پھاڑتے تھے عجیب دن تھے وہ بھی۔"

یہ کہہ کر آغا صاحب لاچے اور آزار بند کے بھڑکیلے رنگوں اور کانوں میں اڑسے ہوئے پھوئے اور سر میں چپڑے ہوئے عطر کی تیز خوشبو سمیت بیتے ہوئے دنوں کی یاد میں کچھ عرصے کے لئے کھو گئے۔ آپ نے اپنی موٹی موٹی آنکھیں بند کر لیں۔ جو ہیئت آپ نے بنا رکھی تھی۔ اس سے گو آپ رنڈیوں کے پیر دکھائی دیتے تھے۔ لیکن ان کا چہرہ بہت ہی بارعب تھا۔ آنکھیں بند تھیں۔ جھکے ہوئے پپوٹوں کی جھریوں والی پتلی جلد کے نیچے موٹی موٹی کانچ کی گولیاں سی ہلتے ہوئے حرکت کر رہی تھیں۔ انہوں نے جب آنکھیں کھولیں تو میں نے سوچا کتنے برسوں کا نشہ ان میں منجمد ہے۔ کس قدر سرخی ان کے ڈوروں میں جذب ہو چکی ہے۔

آغا صاحب نے پھر کہا۔ "عجیب دن تھے وہ ــــ آزاد ڈھیل کے پیچ لڑانے کا عادی تھا۔ مجھے آتا تھا مزا کھینچ کے پیچ لڑانے میں۔ ایک ہاتھ مارا۔ اور پٹیا کاٹ لیا۔ حریف منہ دیکھتے رہ گئے۔ ایک دفعہ آزاد بہت بُری طرح گھر گیا۔ مقابلہ چار نہایت ہی ہٹ دھرم عیسائی مشنریوں سے تھا۔ میں پہنچا تو آزاد کی جان میں جان آئی۔ اس نے ان مشنریوں کو میرے حوالے کیا۔ میں نے دو تین ایسے اڑنگے دیئے کہ بوکھلا گئے۔ میدان ہمارے ہاتھ رہا۔ لیکن میرا حلق سوکھ گیا۔ قیامت کی گرمی تھی۔ مسجد دوزخ بنی ہوئی تھی۔ میں نے آزاد سے کہا۔ "وہ بوتل کہاں ہے؟ اس نے جواب دیا۔ "میری جیب میں" میں نے کہا خدا کے لئے چلو۔ میرا حلق سوکھ کے لکڑی ہو گیا ہے۔" دور جانے کی تاب نہیں تھی۔ وہیں مسجد میں ایک غسل خانے کے اندر جھک مارنی پڑی۔"

اتنے میں آغا صاحب کا نوکر آ گیا۔ آغا صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں اس کو گالیاں دیں اور وجہ پوچھی کہ اس نے اتنی دیر کیوں کی۔ نوکر نے جو گالیوں کا عادی معلوم ہوتا تھا کاغذ کا ایک بنڈل نکالا اور کھول کر آگے بڑھایا۔ "ایسی چیز لایا ہوں۔ کہ آپ کی طبیعت خوش ہو جائے۔"

آغا صاحب نے کھلا ہوا بنڈل ہاتھ میں لیا۔ شوخ رنگ کے چار ازار بند تھے۔ آغا صاحب نے ایک نظر ان کو دیکھا اور آنکھوں کو بہت ہی خوفناک انداز میں اوپر اٹھا کر اپنے نوکر پر گرجے ..... "یہ چیز لایا ہے تو ...... ایسے واہیات ازار بند

تو اس شہر کے کنجڑے بھی نہیں پہنتے۔" یہ کہہ کر انہوں نے بنڈل فرش پر دے مارا۔ کچھ دیر نوکر پر برسے، پھر جیب میں غالباً دو تین ہزار روپے کے نوٹ نکالے اور اسے حکم دیا۔ "جاؤ، پان لاؤ۔"

پنڈت محسن نے گڑگڑی ایک طرف رکھی اور کہا۔ "نہیں نہیں آغا صاحب، میں منگواتا ہوں۔"

آغا صاحب نے سب نوٹ تماش بینوں کے انداز میں اپنی جیب میں رکھے اور کہا۔ "جاؤ تمہارے پاس کچھ باقی بچا ہوا ہے۔"

نوکر جانے لگا تو انہوں نے اسے روکا۔ "ٹھیرو —— وہاں سے پتہ بھی لیتے آؤ کہ وہ ابھی تک کیوں نہیں آئیں۔"

نوکر چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد سیڑھیوں کی جانب سے ہلکی سی مہک آئی پھر ریشمیں سرسراہٹیں سنائی دیں —— آغا صاحب کا چہرہ بشاش ہو گیا —— مختار جو ہرگز ہرگز حسین نہیں تھی۔ خوش وضع کپڑوں میں ملبوس صحن میں داخل ہوئی۔ آغا صاحب اور حاضرین کو تسلیمات عرض کی اور اندر کمرے میں چلی گئی۔ آغا صاحب کی آنکھیں اس کو وہاں تک چھوڑنے گئیں۔

اتنے میں پان آ گئے۔ جو اخبار کے کاغذ میں لپٹے ہوئے تھے۔ نوکر اندر چلا تو آغا صاحب نے کہا۔ "کاغذ پھینکنا نہیں سنبھال کے رکھنا۔"

میں نے ایک دم حیرت سے پوچھا۔ "آپ اس کاغذ کو کیا کریں گے آغا صاحب؟"

آغا صاحب نے جواب دیا۔ "پڑھوں گا۔ چھپے ہوئے کاغذ کا کوئی بھی ٹکڑہ جو مجھے ملا ہے۔ میں نے ضرور پڑھا ہے۔" یہ کہہ کر وہ اُٹھے۔ "معافی چاہتا ہوں، اندر ایک معشوق میرا انتظار کر رہا ہے۔"

پنڈت محسن نے گڑگڑی اٹھائی اور اسے گڑگڑانے لگے۔ میں اور ہری سنگھ تھوڑی دیر کے بعد وہاں سے چل دیئے۔

میں کئی دنوں تک اس ملاقات پر غور کرتا رہا۔ آغا صاحب عجیب و غریب ہزار پہلو شخصیّت کے مالک تھے۔ میں نے ان کے چند ڈرامے پڑھے جو اغلاط سے پُر تھے اور نہایت ہی ادنےٰ کاغذ پر چھپے ہوئے تھے۔ جہاں جہاں کومیڈی آتی تھی وہاں پھکڑّپن ملتا تھا۔ ڈرامائی مقاموں پر مکالمہ بہت ہی زوردار تھا۔ بعض اشعار سوقیانہ تھے، بعض نہایت ہی لطیف۔ سب سے پُر لطف بات یہ ہے کہ ان ڈراموں کا موضوع طوائف تھا۔ جن میں آغا صاحب نے اس کے وجود کو سوسائٹی کے حق میں زہر ثابت کیا تھا...... اور آغا صاحب عمر کے اس آخری حصّے میں شراب چھوڑ کر ایک طوائف سے بہت پر جوش قسم کا "عشق" فرما رہے تھے۔ پنڈت محسن سے ایک دفعہ ملاقات ہوئی تو انہوں نے کہا۔ "عشق" کے متعلق تو میں نہیں جانتا۔ لیکن ترکِ شراب نوشی بہت جلد ان کو لے مرے گی۔"

آغا صاحب تو کچھ دیر زندہ رہے لیکن پنڈت محسن یہ فرمانے کے تقریباً ایک ماہ بعد اس دنیا سے چل بسے۔

میں نے اب مختلف اخباروں میں لکھنا شروع کر دیا تھا چند مہینے گذر گئے۔ لوگوں سے معلوم ہوا کہ آغا حشر لاہور میں "رستم وسہراب" نام کا ایک فلم بنا رہے ہیں جس کی تیاری پر روپیہ پانی کی طرح بہایا جا رہا ہے۔ اس فلم کی ہیروئن جیسا کہ ظاہر ہے مختار تھی۔

امرتسر سے لاہور صرف ایک گھنٹے کا سفر ہے۔ آغا صاحب سے پھر ملنے کو جی تو بہت چاہتا تھا۔ مگر خدا معلوم ایسی کون سی رکاوٹ تھی کہ لاہور جانا ہی نہ ہو سکا۔ بہت دنوں کے بعد باری صاحب نے بلایا تو میں لاہور گیا۔ وہاں پہنچ کر کچھ ایسا مشغول ہوا کہ آغا صاحب کو بھول ہی گیا۔ شام کے قریب ہم نے سوچا کہ چلو اُردو بک اسٹال چلیں۔ چنانچہ میں اور باری صاحب دونوں عرب ہوٹل سے چائے پی کر ادھر روانہ ہوئے۔ اردو بک اسٹال پہنچے تو میں نے دیکھا آغا صاحب یعسوب کے میز کے پاس کرسی پر بیٹھے ہیں۔ میں نے باری صاحب کو بتایا کہ آغا حشر ہیں۔ انھوں نے غور سے ان کی طرف دیکھا۔ "یہ ہیں آغا حشر؟"

آغا صاحب کا لباس اسی قسم کا تھا۔ سفید بوسکی کی قمیص، گہرے نیلے رنگ کا ریشمی لاچا، سر سے ننگے بیٹھے ایک کتاب کی ورق گردانی کر رہے تھے۔ پاس پہنچا تو ایک دم میرا دل دھڑکنے لگا۔ کیونکہ آغا صاحب کے ہاتھ میں میری ترجمہ کی ہوئی کتاب "سرگذشتِ اسیر" تھی۔

یعسوب نے اٹھ کر میرا اور باری صاحب کا آغا حشر سے تعارف کرایا اور کہا۔ "یہ کتاب جو آپ دیکھ رہے ہیں مسٹر منٹو کی ترجمہ کی ہوئی ہے۔" آغا صاحب نے اپنی موٹی موٹی آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھے پہچان لیں گے۔ لیکن

انہوں نے مجھے دیکھنے کے بعد کتاب کے چند اوراق پلٹے اور کہا۔ "کیسا لکھنے والا ہے وکٹر ہیوگو۔"

باری صاحب نے جواب دیا۔" فرانسیسی ادب میں وکٹر ہیوگو کا رتبہ بہت بلند ہے۔"

آغا صاحب ورق پلٹتے رہے۔" ڈراماٹسٹ تھا؟"

اب کی پھر باری صاحب نے جواب دیا۔" ڈراماٹسٹ بھی تھا۔"

آغا صاحب نے پوچھا۔" کیا مطلب؟"

باری صاحب نے انہیں بتایا۔ کہ "ہیوگو اصل میں شاعر تھا۔ فرانس کی رومانی تحریک کا امام۔ اس نے ڈرامے اور ناول بھی لکھے۔ ایک ناول "مصیبت زدہ" اتنا مشہور ہوا کہ اس کی شاعری کو لوگ بھول گئے اور اسے ناولسٹ کی حیثیت سے جاننے لگے۔"

آغا صاحب یہ معلومات بڑی دلچسپی سے سنتے رہے۔ آخر میں انہوں نے یعسوب سے کہا۔ "سرگذشتِ اسیر" بھی ان کتابوں میں شامل کر لی جائے جو وہ خرید رہے تھے۔ میں بہت خوش ہوا۔

اس کے بعد باری صاحب سے باتیں کرتے کرتے اٹھے اور اندر شوروم میں چلے گئے۔ باری صاحب کی گفتگو سے آغا صاحب متاثر ہوئے تھے۔ چنانچہ انہوں نے باری صاحب کی سفارش پر کئی کتابیں خریدیں۔ اس دوران میں باری صاحب نے ان سے کہا۔" آغا صاحب آپ ہندوستانی ڈرامے کی تاریخ کیوں نہیں لکھتے۔ ایسی

کتاب کی اشد ضرورت ہے۔"

آغا صاحب نے جواب دیا۔" ایسی کتاب صرف آغا حشر ہی لکھ سکتا ہے۔ اس کا ارادہ بھی تھا۔ مگر وہ کم بخت آج کل قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہے —— اس کے دروازے پر موت دستک دے رہی ہے۔"

میں نے ان سے پوچھا۔" آغا صاحب، آپ کے ڈرامے جو بازار میں بکتے ہیں..."

میں نے ابھی اپنا جملہ پورا بھی نہ کیا تھا کہ آغا صاحب نے بلند آواز میں کہا —— " لاحول ولا...... آغا حشر کے ڈرامے اور...... کے جیبھڑوں پہ چھپیں —— بغیر اجازت کے، اِدھر اُدھر سے سن سنا کر چھاپ دیتے ہیں۔" اس کے بعد انہوں نے بہت ہی موٹی گالی ان پبلشروں کو دی۔ جنہوں نے ان کے ڈرامے چھاپے تھے۔

میں نے ان سے کہا۔" آپ ان پر دعوے دائر کیوں نہیں کرتے۔"

آغا صاحب ہنسے۔" کیا وصول کر لوں گا ان ٹٹ پونجیوں سے۔"

بات درست تھی۔ میں خاموش ہو گیا۔

آغا صاحب نے باہر آ کر یعسوب سے بل طلب کیا اور جیب سے تماش بینوں کے انداز میں تین چار ہزار روپے کے بالکل نئے نوٹ نکالے۔ ان دنوں دس دس اور پانچ پانچ کے نئے نوٹ نکلے تھے۔ جو پہلے نوٹوں کی بہ نسبت چھوٹے تھے —— آغا صاحب نے بتایا کہ چیک کیش کرانے کے لئے جب بنک گئے تو وقت ہو چکا تھا آپ نے کلرک سے کہا۔" آغا حشر کا وقت ابھی پورا نہیں ہوا۔ جلدی چیک کیش کراؤ۔"

"کلرک کو جب معلوم ہوا کہ آغا حشر ہیں تو وہ بھاگتا ہوا منیجر کے پاس گیا۔ فوراً ہی منیجر دوڑا دوڑا ان کے پاس آیا اور اپنے کمرے میں لے گیا۔ نئے نوٹ منگوا کر اس نے بڑے ادب سے آغا صاحب کو پیش کئے اور کہا۔ "میں آپ کی اور کوئی سیوا تو نہیں کر سکتا۔ یہ نئے نوٹ آئے ہیں، سب سے پہلے آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔"

باری صاحب نے ایک نوٹ آغا صاحب سے لیا اور اُس کو انگلیوں میں پکڑ کر کہا۔ "آغا صاحب گرفت کچھ کم ہو گئی ہے، ٹھیک اسی طرح جس طرح حکومت کی۔"

آغا صاحب نے اس فقرے کی بہت داد دی۔ "خوب! بہت خوب—— گرفت کچھ کم ہو گئی ہے۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح حکومت کی —— میں کسی نہ کسی ڈرامے میں اسے ضرور استعمال کروں گا۔"

باری صاحب بہت خوش ہوئے۔ اتنے میں وہ نوکر آیا، وہی جو پنڈت محسن کے دفتر میں ازار بند لایا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں چار قندھاری انار تھے۔ آغا صاحب نے ایک انار لیا اور ناک بھوں چڑھا کر گالی دی۔ "نہایت ہی واہیات انار ہیں۔"

نوکر نے پوچھا۔ "واپس کر آؤں؟"

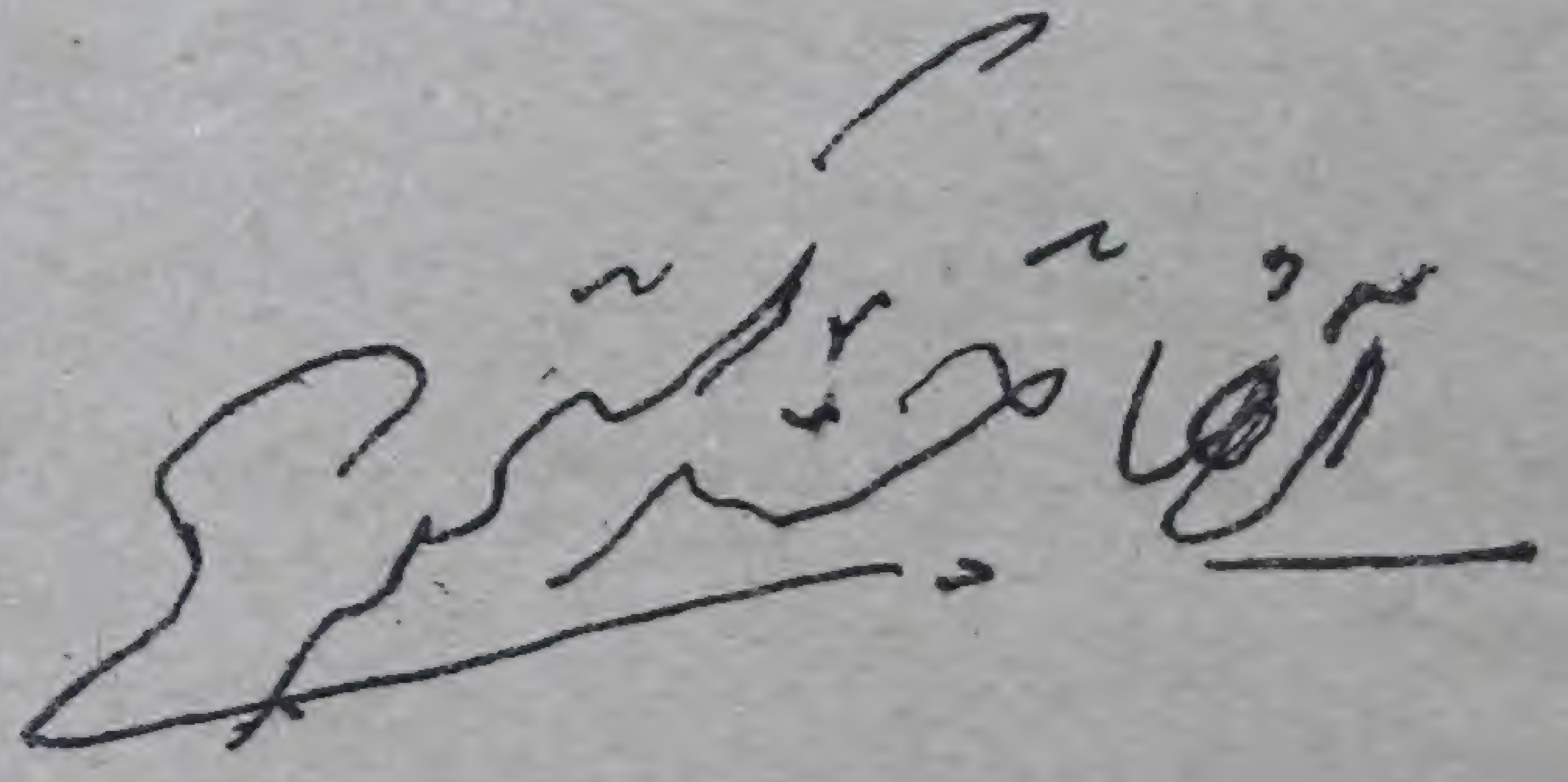
آغا صاحب بولے۔ "نہیں بے۔ تو کھا لے۔" اس کے بعد انھوں نے ایک وزن دار گالی لڑھکا دی۔

آغا صاحب جانے لگے تو میں نے آٹو گراف بُک نکال کر ان کے دستخط لئے۔ آغا صاحب جب کانپتے ہوئے ہاتھ سے اپنا نام لکھ چکے تو کہا —— "ایک زمانے

کے بعد میں نے یہ چند حرف لکھے ہیں۔"

میں امرتسر چلا آیا۔ کچھ عرصے کے بعد یہ خبر آئی۔ کہ لاہور میں مختصر علالت کے بعد آغا حشر کاشمیری کا انتقال ہو گیا ہے۔ جنازے کے ساتھ گنتی کے چند آدمی تھے۔

دینو یا فضلو کمہار کی بیٹھک پر جب آغا صاحب کی موت کا ذکر ہوا تو اس نے نال کے پیسے نکال کر اپنی جالی دار ٹوپی میں رکھتے ہوئے بڑے ہی فلسفیانہ انداز میں کہا۔ "بڑھاپے کا عشق بہت ظالم ہوتا ہے۔"



۲۶ اپریل ۱۹۳۴ء

اختر شیرانی سے چند مُلاقاتیں

خدا معلوم کتنے برس گذر چکے ہیں۔ حافظہ اس قدر کمزور ہے کہ نام، سن اور تاریخ کبھی یاد ہی نہیں رہتے۔ امرتسر میں غازی عبدالرحمٰن صاحب نے ایک روزانہ پرچہ "مساوات" جاری کیا۔ اس کی ادارت کے لئے باری علیگ (مرحوم) اور ابوالعلاء چشتی الصحافی (حاجی لق لق) بلائے گئے۔ ان دنوں میری آوارہ گردی معراج پر تھی۔ بے مقصد سارا دن گھومتا رہتا تھا۔ دماغ بے حد منتشر تھا۔ اس وقت تو میں نے محسوس نہیں کیا تھا۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ یہ دماغی انتشار میرے لئے کوئی راستہ تلاش کرنے کے لئے بیتاب تھا۔

جیجے کے ہوٹل (شیراز) میں قریب قریب ہر روز گپ بازی کی محفل جمتی تھی۔ بالا، انور پینٹر، عاشق فوٹو گرافر، فقیر حسین سلیس اور ایک صاحب جن کا

نام میں بھول گیا ہوں۔ باقاعدگی کے ساتھ اس محفل میں شریک ہوتے تھے۔ ہر قسم کے موضوع زیر بحث لائے جاتے تھے۔ باآلا بڑا خوش گو اور بذلہ سنج نوجوان تھا اگر وہ غیر حاضر ہوتا تو محفل سونی رہتی۔ شعر بھی کہتا تھا۔ اس کا ایک شعر ابھی تک مجھے یاد ہے۔

اشک مژگاں پہ ہے اٹک سا گیا
نوک سی چبھ گئی ہے چھالے ہیں

جیجے سے لے کر انور پینٹر تک سب موسیقی اور شاعری سے شغف رکھتے تھے۔ وہ صاحب جن کا نام میں بھول گیا تھا کیپٹن وحید تھے۔ نیلی نیلی آنکھوں والے۔ لمبے تڑنگے۔ مضبوط جسم۔ آپ کا محبوب مشغلہ گوروں سے لڑنا تھا۔ چنانچہ کئی گورے ان کے ہاتھوں پٹ چکے تھے۔ انگریزی بہت اچھی بولتے تھے۔ اور طبلہ ماہر طبلچیوں کی طرح بجاتے تھے۔

ان دنوں جیجے کے ہوٹل میں ایک شاعر اختر شیرانی کا بہت چرچا تھا۔ قریب قریب ہر محفل میں اس کے اشعار پڑھے یا گائے جاتے تھے۔ جیجا (عزیز) عام طور پر "میں اپنے عشق میں سب کچھ تباہ کر لوں گا" (بہت ممکن ہے کہ یہ مصرع غلط ہو) گایا کرتا تھا۔ یہ نئے قسم کا جذبہ سب کے ذہن پر مسلّط ہو گیا تھا۔ معشوق کو جو دھمکی دی گئی تھی۔ سب کو بہت پسند آئی تھی

جیجا تو اختر شیرانی کا دیوانہ تھا۔ کاؤنٹر کے پاس کھڑا گاہک سے بل وصول کر

رہا ہے اور گنگنا رہا ہے۔ "اے عشق کہیں لے چل"۔ مسافروں کو کمرے دکھا رہا ہے اور زیرِ لب گا رہا ہے۔ "کیا بگڑ جائے گا رہ جاؤ یہیں رات کی رات۔"

عاشق فوٹو گرافر کی آواز گو بہت پتلی تھی۔ لیکن وہ "اے عشق کہیں لے چل" بڑے سوز سے گایا کرتا تھا۔ میں نے جب بھی اُس کے منہ سے یہ نظم سنی۔ مجھ پر بہت اثر ہوا اُس زمانے میں چونکہ طبیعت میں انتشار تھا۔ اس لئے یہ نظم مجھے اپنے کندھوں پر اٹھا کر دُور ــــ بہت دُور ان دیکھے جزیروں میں لے جاتی تھی۔

اتنا زمانہ بیت چکا ہے۔ مگر وہ کیفیّت جو اس وقت مجھ پر طاری ہوتی تھی میں اب بھی محسوس کر سکتا ہوں ــــ عجیب و غریب کیفیّت تھی۔ جیجے کے ہوٹل کے بہت اندر اندھیری مگر ٹھنڈی کوٹھڑی میں بیٹھا میں یوں محسوس کرتا۔ کشتی میں بیٹھا ہوں ــــ پریاں اسے کھے رہی ہیں۔ نازک نازک پروں والی پریاں۔ رات کا وقت ہے۔ اس لئے مجھے ان پریوں کا صرف سایہ سا نظر آتا ہے۔ سمندر پُر سکوں ہے کشتی ہلکورے کھائے بغیر چل رہی ہے۔ کسی نامعلوم منزل کی طرف۔ پاپوں کی بستی بہت پیچھے رہ گئی ہے۔ ہم دنیوی شور و غل سے ہزاروں میل آگے بڑھ گئے ہیں۔

جیجے کے ہوٹل میں کچھ عرصے کے بعد باری صاحب اور چشتی صاحب کا آنا جانا بھی شروع ہو گیا۔ دونو کھانا کھاتے یا چائے پیتے اور چلے جاتے۔ مگر جب جیجے کو معلوم ہوا کہ وہ اخباری آدمی ہیں تو فوراً ان سے بے تکلف مراسم پیدا کر لئے۔

باری صاحب اختر شیرانی کے کلام سے واقف تھے۔ لیکن ذاتی طور پر شاعر کو نہ

جانتے تھے۔ چشتی صاحب ایک مدّت کے بعد بغداد اور مصر وغیرہ کی سیاحت کے بعد تازہ تازہ واپس آئے تھے۔ اس لئے وہ یہاں کے شعراء کے متعلق کچھ نہیں جانتے تھے۔ پھر بھی جب انہوں نے مجھ سے اختر شیرانی کا کلام سنا تو بہت متاثر ہوئے۔

اس دوران میں باری صاحب کے ساتھ میں گھل مل گیا۔ اُن کی سنجیدگی اور متانت بھری ظرافت مجھے بہت پسند آئی۔ میرے ذہنی انتشار کو بھانپ کر انہوں نے مجھے صحافت کی طرف مائل کیا۔ آہستہ آہستہ ادب سے روشناس کرایا۔ پہلے میں تیرتھ رام فیروزپوری کے ناول پڑھا کرتا تھا۔ اب باری صاحب کی وجہ سے آسکر وائلڈ اور وکٹر ہیوگو میرے زیرِ مطالعہ رہنے لگے۔ ہیوگو مجھے بہت پسند آیا۔ بعد میں مَیں نے محسوس کیا کہ اس فرانسیسی مصنّف کا خطیبانہ انداز باری صاحب کی تحریروں میں موجود ہے۔ آج کل میں جو کچھ بھی ہوں۔ اس کو بنانے میں سب سے پہلا ہاتھ باری صاحب کا ہے۔ اگر امرتسر میں اُن سے ملاقات نہ ہوتی اور متواتر تین مہینے میں نے اُن کی صحبت میں نہ گذارے ہوتے تو یقیناً میں کسی اور ہی راستے پر گامزن ہوتا۔

چونکہ اب میں کسی حد تک ادب سے روشناس ہو چکا تھا۔ اس لئے میں نے اختر شیرانی کے کلام کو ایک نئے زاویے سے دیکھنا شروع کیا۔ اس کی شاعری ہلکی پھلکی اور رومانی تھی۔ میں اب غور کرتا ہوں تو اختر شیرانی مجھے کالج کے لڑکوں کا شاعر معلوم ہوتا ہے۔ ایک خاص عمر کے نوجوانوں کا شاعر، جن کے دل و دماغ

پر ہر وقت رومان کی مکڑی مہین مہین جالے تنتی رہتی ہے۔ مجھے اس وادی میں قدم رکھے زیادہ دیر نہ ہوئی تھی۔ کہ ایک دوست سے معلوم ہوا، اختر شیرانی آئے ہوئے ہیں اور "شیراز ہوٹل" میں ٹھہرے ہیں۔ اسی وقت وہاں پہنچا مگر معلوم ہوا۔ کہ وہ بھیجے کے ساتھ کہیں باہر گئے ہیں۔ دیر تک ہوٹل میں بیٹھا انتظار کرتا رہا۔ مگر یہ لوگ واپس نہ آئے۔

شام کو پہنچا تو ہوٹل کے سندھی باورچی نے کہا۔ کہ سب اوپر کوٹھے پر بیٹھے ہیں۔ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ میں اوپر گیا۔ چھڑکاؤ کر کے چارپائیاں بچھائی گئی تھیں۔ کچھ کرسیاں بھی تھیں۔ دیسی شراب کا دور چل رہا تھا۔ دس بارہ آدمی بیٹھے تھے جو میرے جانے پہچانے تھے۔ صرف ایک صورت اجنبی تھی اور وہ اختر شیرانی کی تھی چپٹا چہرہ۔ سپاٹ پیشانی۔ موٹی ناک۔ موٹے ہونٹ۔ گہرا سانولا رنگ۔ چھدرے بال آنکھیں بڑی بڑی اور پرکشش، ان میں تھوڑی سی اداسی بھی تھی۔ بڑی شستہ ورفتہ اردو میں حاضرین سے گفتگو کر رہے تھے۔

میں پاس پہنچا تو باتے نے ان سے میرا تعارف کرایا۔ بڑی خندہ پیشانی سے پیش آئے۔ اور مجھ سے بیٹھنے کے لئے کہا۔ میں چارپائی کے پاس کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کے بعد اختر صاحب بھیجے سے مخاطب ہوئے۔ "عزیز (میری طرف اشارہ کر کے) ان کے لئے گلاس منگواؤ۔"

گلاس آیا تو اختر صاحب نے مجھے ایک پیگ بنا کر دیا۔ جو میں نے شکریے

کے ساتھ قبول کیا۔ دو تین دور ہوئے تو کسی نے اختر صاحب سے اپنا کلام سنانے کی فرمائش کی۔ اس پر انہوں نے کہا۔ "نہیں بھائی میں کچھ نہیں سناؤں گا —— میں سنوں گا۔" پھر جیجے سے مخاطب ہوئے۔ "عزیز، سناؤ۔" رسیلی انکھڑیوں سے نیند بر ساتے ہوئے آنا۔" یہ کہا اور ایک ٹھنڈی سانس لی جیسے بیتے ہوئے لمحات یاد آ گئے ہیں۔ جیجے کو مجالِ انکار نہیں تھی۔ گلا صاف کیا اور اختر صاحب کی ایک مشہور غزل گانا شروع کر دی۔ سر تال سب ٹھیک۔ مگر آواز پھٹی پھٹی سی تھی۔ پھر بھی رنگ جم گیا۔ اختر صاحب پیتے رہے اور جھومتے رہے۔

دوسرے روز دوپہر کے وقت میں شیراز ہوٹل میں بیٹھا اختر صاحب کا انتظار کر رہا تھا (وہ کسی دعوت پر گئے تھے) کہ ایک برقعہ پوش خاتون ٹانگے میں آئیں۔ آپ نے ایک ملازم سے اختر صاحب کے بارے میں پوچھا۔ اُس نے کہا۔ کہیں باہر تشریف لے گئے ہیں۔ آپ اپنا نام بتا دیجئے۔ برقعہ پوش خاتون نے اپنا نام نہ بتایا اور چلی گئی۔

اختر صاحب آئے تو میں نے اس خاتون کی آمد کا ذکر کیا۔ آپ نے بڑی شاعرانہ دلچسپی سے ساری بات سنی اور مسکرا دیئے۔ یوں وہ خاتون ایک اسرار سا بن گئی۔ کھانا کھانے سے پہلے شام کو جب ٹھرّے کا دَور شروع ہوا۔ تو جیجے نے اس برقعہ پوش خاتون کے متعلق اختر صاحب سے پوچھا۔ "حضرت وہ کون تھیں جو آج دوپہر کو تشریف لائی تھیں؟"

اختر صاحب مسکرائے اور جواب گول کر گئے۔ باآئے نے ان سے کہا۔ "کہیں سلمیٰ صاحبہ تو نہیں تھیں؟"

اختر صاحب نے ہولے سے باآئے کے گال پر طمانچہ مارا اور صرف اتنا کہا۔ "شریر" ــــ بات اور بھی زیادہ پُراسرار ہو گئی۔ جو آج تک صیغۂ راز میں ہے۔ معلوم نہیں وہ برقعہ پوش خاتون کون تھیں۔ اس زمانے میں صرف اتنا معلوم ہُوا تھا کہ اختر صاحب کے جانے کے بعد وہ ایک بار پھر شیراز ہوٹل آئی تھی اور اختر صاحب کے بارے میں اس نے پوچھا تھا کہ کہاں ہیں۔

سب باری باری اختر صاحب کی دعوت کر چکے تھے۔ وہیں شیراز ہوٹل میں۔ دعوت دینے کا یہ طریقہ تھا کہ دن اور رات میں ٹھرّے کی جتنی بوتلیں ختم ہوں اُن کے دام ادا کر دئیے جائیں۔ میں نے یہ طریقہ بھونڈا سمجھا اور دو بوتلیں اسکاچ وسکی کی لے کر ایک شام وہاں پہنچا۔ ایک بوتل پر سے کاغذ ہٹایا ــ تو اختر صاحب نے کہا۔ "بھائی، یہ تم نے کیا کیا۔ دیسی شراب ٹھیک رہتی۔ ایک کے بدلے دو آجاتیں۔"

میں نے عرض کی۔ "اختر صاحب۔ یہ ختم ہو جائے تو دوسری موجود ہے۔"

اختر صاحب مسکرائے۔ "وہ ختم ہو گئی تو۔"

میں نے کہا۔ "اور آجائے گی۔"

آپ نے میرے سر پہ ہاتھ پھیرا۔ "زندہ رہو۔"

دونوں بوتلیں ختم ہو گئیں۔ میں نے محسوس کیا کہ اختر صاحب اسکاچ سے مطمئن نہیں تھے۔ چنانچہ ملازم سے امرتسر ڈسٹلری کے کشید کردہ ٹھرّے کی ایک بوتل منگوائی۔ اس نے اختر صاحب کے نشے میں جو خالی جگہیں تھیں پُر کر دیں۔

چونکہ یہ محفلیں خالص ادبی نہیں تھیں اور ان کے پیچھے صرف وہ عقیدت تھی۔ جو اُن لوگوں کو اختر صاحب سے تھی۔ اس لئے زیادہ تر اُن ہی کا کلام پڑھا یا گایا جاتا۔ شعر و سخن کے متعلق کوئی بصیرت افروز بات نہ ہوتی۔ لیکن اختر صاحب کی گفتگوؤں سے میں نے اتنا اندازہ لگا لیا تھا کہ اُردو شاعری پر ان کی نظر بہت وسیع ہے۔

چند روز کے بعد میں نے گھر پر اختر صاحب کی دعوت کی۔ مگر یہ صرف چاء کی تھی۔ جس سے اختر صاحب جیسے رند بلانوش کو کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ لیکن انہوں نے قبول کی اور میری خاطر ایک پیالی چائے بھی پی۔

ان محفلوں میں باری صاحب بہت کم شریک ہوئے۔ البتہ چشتی صاحب جو پینے کے معاملے میں اختر صاحب سے چند پیگ آگے ہی تھے۔ اکثر ان محفلوں میں شریک ہوتے اور اپنا کلام بھی سناتے جو عام طور پر بے ربط ہوتا تھا۔

اختر صاحب غالباً دس دن امرتسر میں رہے۔ اس دوران میں نیجے کے بہم اصرار پر آپ نے شیراز ہوٹل پر ایک نظم کہی۔ نیجے نے اسے باری صاحب کی وساطت سے بڑے کاغذ پر خوشخط لکھوایا اور فریم میں جڑوا کر اپنے ہوٹل کی زینت بنایا۔ وہ بہت خوش تھا۔ کیونکہ نظم میں اُس کا نام موجود تھا۔

اختر صاحب چلے گئے تو جیجے کے ہوٹل کی رونق غائب ہو گئی۔ باری صاحب نے اب میرے گھر آنا شروع کر دیا تھا۔ میرا شراب پینا ان کو اچھا نہیں لگتا تھا۔ خشک واعظ نہیں تھے۔ اشاروں ہی اشاروں میں کئی دفعہ مجھے اس علت سے باز رہنے کے لئے کہا۔ مگر میں باز نہ آیا۔

باری صاحب تین مہینے امرتسر میں رہے۔ اس دوران میں انہوں نے مجھ سے وکٹر ہیوگو کی ایک کتاب "سرگذشتِ اسیر" کے نام سے ترجمہ کرائی۔ جب وہ چھپ کر پریس سے باہر آئی۔ تو آپ لاہور میں تھے۔ میں نے طبع شدہ کتاب دیکھی۔ تو اکساہٹ پیدا ہوئی۔ کہ اور ترجمہ کروں۔ چنانچہ میں نے آسکر وائلڈ کے اشتراکی ڈرامے "ویرا" کا ترجمہ شروع کر دیا۔ جب ختم ہؤا تو باری صاحب کو اصلاح کے لئے دیا مگر مصیبت یہ تھی۔ کہ وہ میری تحریروں میں بہت ہی کم کانٹ چھانٹ کرتے تھے۔ زبان کی کئی غلطیاں رہ جاتی تھیں۔ جب کوئی ان کی طرف اشارہ کرتا تو مجھے بہت ہی کوفت ہوتی۔ چنانچہ میں نے سوچا کہ باری صاحب کے بعد اختر صاحب کو ترجمے کا مسوّدہ دکھاؤں گا۔

عرب ہوٹل میں آنے جانے سے مظفر حسین شمیم صاحب سے اچھے خاصے تعلقات پیدا ہو گئے تھے۔ میں نے اُن سے اصلاح کی بات کی تو وہ مجھے اسی وقت اختر شیرانی صاحب کے پاس لے گئے۔ چھوٹا سا غلیظ کمرہ تھا۔ آپ چارپائی پر تکیہ سینے کے ساتھ دبائے بیٹھے تھے۔ علیک سلیک ہوئی۔ اختر صاحب مجھے

پہچان گئے ——— یارانِ شیراز ہوٹل کے بارے میں پوچھا۔ جو کچھ مجھے معلوم تھا میں نے ان کو بتا دیا۔

شمیم صاحب اور اختر صاحب کی گفتگو بہت پُر تصنّع اور پُر تکلّف تھی۔ حالانکہ مجھ سے کسی شخص نے کہا تھا۔ کہ وہ دونو کسی زمانے میں یک جان و دو قالب تھے۔ بہر حال شمیم صاحب نے میرے آنے کا مدّعا بیان کیا۔ اختر صاحب نے کہا "میں حاضر ہوں۔ آج رات ہی سارا مسوّدہ دیکھ لوں گا۔"

اختر صاحب نے سینے کے ساتھ تکیہ اس لئے دبایا ہوا تھا۔ کہ ان کے جگر میں تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد ٹیس سی اٹھتی تھی۔ اس زمانے ہی میں ان کا جگر قریب قریب ماؤف ہو چکا تھا ——— میں نے ان سے رخصت لی اور شام کو حاضر ہونے کا کہہ کر شمیم صاحب کے ساتھ واپس عرب ہوٹل چلا آیا۔ انہوں نے مجھ سے اشارتاً کہا کہ اگر تم اختر سے اپنا کام جلدی کرانا چاہتے ہو تو ساتھ "وہ چیز" لیتے جانا۔

میں جب شام کو اختر صاحب کے پاس پہنچا تو "وہ چیز" میرے پاس موجود تھی جو میں نے بڑے سلیقے سے پیش کی۔ بوتل ڈرتے ڈرتے باہر نکالی اور ان سے کہا۔ "کیا یہاں اس کی اجازت ہے۔ معاف کیجئے گا یہ پوچھنا ہی بڑی بدتمیزی ہے۔"

اختر صاحب کی آنکھیں تمتما اٹھیں۔ میرا خیال ہے وہ صبح کے پیاسے تھے۔ مسکرائے اور میرے سر پر بڑی شفقت سے ہاتھ پھیرا۔ "شراب پینا کوئی بدتمیزی نہیں۔" یہ کہہ کر بوتل میرے ہاتھ سے لی اور تکیہ فرش پر رکھ کر اس پر بوتل کا نچلا حصّہ

ٹھونکنا شروع کیا۔ تاکہ کورک باہر نکل آئے۔

ان دنوں پیتا تھا مگر یوں کہئے کہ زیادہ پی نہیں سکتا تھا۔ چار پیگ کافی تھے۔ مقدار اس سے اگر بڑھ جاتی۔ تو طبیعت خراب ہو جاتی اور سارا لطف غارت ہو جاتا۔

اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے اور پیتے کافی دیر ہو گئی۔ اختر صاحب کا کھانا آیا اور جس طریقے سے آیا اس سے میں نے یہ جانا۔ کہ ان کے گھر والوں کے تعلّقات ان سے کشیدہ ہیں۔ بعد میں اس کی تصدیق بھی ہو گئی۔ ان کے والدِ مکرم حافظ محمود شیرانی صاحب (مرحوم و مغفور) ان کی شراب نوشی کے باعث بہت نالاں تھے۔ تھک ہار کر انہوں نے اختر صاحب کو اُن کے اپنے حال پر چھوڑ دیا تھا۔

رات زیادہ گذر گئی تو میں نے اختر صاحب سے درخواست کی کہ وہ مسوّدہ دیکھنا شروع کر دیں۔ آپ نے یہ درخواست قبول کی اور مسوّدے کی اصلاح شروع کر دی۔ چند صفحات دیکھے تو آسکر وائلڈ کی رنگین زندگی کی باتیں شروع کر دیں۔ جو غالباً انہوں نے کسی اور سے سنی تھیں۔ آسکر وائلڈ اور لارڈ الفرڈ ڈگلس کے معاشقے کا ذکر آپ نے بڑے مزے لے لے کر بیان کیا۔ وائلڈ کیسے قید ہوا یہ بھی بتایا۔ پھر ان کا ذہن ایک دم لارڈ بائرن کی طرف چلا گیا۔ اس شاعر کی ہر ادا انہیں پسند تھی۔ اُسکے معاشقے جو کہ لاتعداد تھے اختر صاحب کی نگاہوں میں ایک جداگانہ شان رکھتے تھے۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ لارڈ بائرن کے نام سے انہوں نے کئی غزلیں

اور نظمیں بھی لکھی تھیں۔

لارڈ بائرن ایک سنگدل، بے رحم اور بے پروا انسان تھا۔ اس کے علاوہ وہ ایک بہت بڑا نواب تھا جس کے پاس دولت تھی۔ اختر صاحب قلّاش تھے۔ بڑے رحم دل اور انسانیت دوست۔ بائرن کو بڑھیا سے بڑھیا شراب میّسر تھی۔ اختر کو بمشکل ٹھرّا ملتا تھا۔ بائرن کے ملک کی فضا اور تھی، اختر کے ملک کی فضا اور۔ وہ کسی صورت میں بھی لارڈ بائرن نہیں بن سکتے تھے۔ لیکن پھر بھی انہوں نے اپنے دل کی تسکین کے لئے دو معشوق اختراع کر لئے تھے۔ سلمیٰ اور عذرا۔

سلمیٰ کے متعلق کئی کہانیاں مشہور ہیں۔ بعض کہتے ہیں۔ کہ سلمیٰ حقیقتاً کوئی سلمیٰ تھی۔ ہو سکتا ہے ایسا ہی ہو مگر جو سلمیٰ ہمیں اختر کے کلام میں نظر آتی ہے یکسر تخیلی ہے۔ اس کا وجود اس قدر شفاف ہے۔ کہ صاف ابخری معلوم ہوتا ہے۔ ایک اور بات بھی ہے۔ اگر سلمیٰ کوئی گوشت پوست کی زندہ عورت ہوتی تو شاعر اس سے اتنی والہانہ محبّت کبھی نہ کرتا۔ مگر چونکہ وہ اس کی اپنی تخلیق تھی۔ اس لئے وہ اس سے بے پناہ محبّت کرتا تھا۔

لارڈ بائرن کی باتیں سنتے سنتے مجھے نیند آ گئی۔ اور وہیں سو گیا۔ صبح اٹھا۔ تو دیکھا۔ اختر صاحب فرش پر بیٹھے مسودہ دیکھنے میں مصروف ہیں۔ بوتل میں تھوڑی سی بچی ہوئی تھی۔ یہ آپ نے پی اور آخری صفحات دیکھ کر مسودہ میرے حوالے کیا۔ اور کہا۔ "ترجمہ بہت اچھا ہے۔ کہیں کہیں زبان کی اغلاط تھیں۔ وہ میں نے درست

کر دی ہیں۔"

میں نے مناسب و موزوں الفاظ میں ان کا شکریہ ادا کیا اور امرتسر روانہ ہو گیا اس کے بعد میں جب کبھی لاہور جاتا۔ اختر صاحب کے نیاز ضرور حاصل کرتا۔ ایک بار گیا تو دیکھا کہ آپ کے سر پر پٹیاں بندھی ہیں۔ ان سے دریافت کیا تو انہوں نے جواب دیا۔ "مجھے تو قطعاً یاد نہیں لیکن لوگ کہتے ہیں کل رات میں نے تانگے میں سوار ہونے کی کوشش کی۔ مگر گر پڑا اور یہ چوٹیں اس وجہ سے آئیں۔"

اختر صاحب کی اپنی ذات کے بارے میں یہ صاف گوئی مجھے بہت پسند آئی۔ بعض اوقات وہ بالکل بچے بن جاتے تھے۔ ان کی گفتگو اور حرکات بالکل بچوں کی سی ہوتیں جہاں تک میں سمجھتا ہوں بچہ بن کر وہ بچگانہ قسم ہی کی مسرت محسوس کرتے تھے۔

کچھ عرصے کے بعد میں بمبئی چلا گیا۔ اختر صاحب سے اتنے مراسم نہیں تھے کہ خط و کتابت ہوتی۔ لیکن جب انہوں نے رسالہ رومان جاری کیا۔ تو میں نے انھیں مبارکباد کا خط لکھا۔ اب میں افسانہ نگاری کے میدان میں قدم رکھ چکا تھا۔ ترجمے کا دور وہیں لاہور اور امرتسر میں ختم ہو گیا تھا۔ میں نے طبع زاد افسانے لکھنے شروع کر دیئے تھے۔ جو مقبول ہوئے تھے۔ "رومان" میں احمد ندیم قاسمی کا ایک افسانہ مجھے بہت پسند آیا۔ بمبئی کے ہفتہ وار "مصور" میں "رومان" پر تبصرہ کرتے ہوئے میں نے اس کی تعریف کی۔ اختر صاحب کو علیحدہ خط لکھا۔ تو اس میں بھی اس افسانے کو بہت سراہا۔ چند دنوں کے بعد احمد ندیم قاسمی کا محبت بھرا خط موصول ہوا۔ جو

ایک طویل سلسلۂ خط و کتابت کا پیش خیمہ تھا۔

کچھ عرصے کے بعد "رومان" بند ہو گیا اور اختر میری نظروں سے مکمّل طور پر اوجھل ہو گئے۔ کئی برس گذر گئے۔ ملک کی سیاسیات نے کئی رنگ بدلے۔ حتیٰ کہ بٹوارہ آن پہنچا۔ اس سے پہلے جو ہُلّڑ مچا اس سے آپ سب واقف ہیں۔ اس دوران میں اخباروں میں خبر چھپی کہ اختر صاحب ٹونک سے پاکستان آ رہے تھے کہ راستے میں بلوائیوں نے ان کو شہید کر دیا۔ بہت افسوس ہُوا۔ مَیں، عصمت اور شاہد لطیف دیر تک ان کی باتیں کرتے اور افسوس کرتے رہے۔

کئی اخباروں میں ان کی موت پر مضامین شائع ہوئے۔ اُن کی پرانی نظمیں چھپیں لیکن کچھ عرصے کے بعد ان کی موت کی اس خبر کی تردید ہو گئی۔ معلوم ہُوا کہ وہ بخیر و عافیت لاہور پہنچ گئے ہیں۔ اس سے بمبئی کے ادبی حلقے کو بہت خوشی ہوئی۔

تقسیم کے پانچ مہینے بعد میں بمبئی چھوڑ کر لاہور چلا آیا۔ کیوں کہ سب عزیز و اقارب یہیں جمع تھے۔ افراط و تفریط کا عالم تھا۔ اختر صاحب سے ملنے کا خیال تک دماغ میں نہ آیا۔ بڑی مدّت کے بعد یوم اقبال کے جلسے میں ان کو دیکھا مگر نہایت ہی ابتر حالت میں۔

رات کے جلسے کی صدارت اختر صاحب کو کرنا تھی۔ یونیورسٹی ہال میں حاضرین کی تعداد خاصی تھی۔ جلسے میں شرکت کے لئے ہندوستان سے علی سردار جعفری

اور کیفی اعظمی آئے ہوئے تھے۔ وقت ہو چکا تھا مگر صاحبِ صدر موجود نہیں تھے۔ میں نے ساحر لدھیانوی سے پوچھا تو اس نے مجھے بتایا کہ اختر شیرانی صاحب ہال کے باہر پی رہے ہیں۔ ان کی حالت بہت غیر ہے۔ اس لئے ہم کوشش کر رہے ہیں۔ کہ وہ صدارت نہ کریں۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ وہ مُصر ہیں۔

میں باہر گیا تو دیکھا وہ دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑے ہیں اور پی رہے ہیں — ظہیر کاشمیری کے ہاتھ میں بوتل ہے۔ آپ نے گلاس ختم کیا اور ظہیر سے کہا۔ "چلو اجلاس کا وقت ہو گیا ہے۔" ظہیر نے ان کو روکا۔ "جی نہیں۔ ابھی کہاں ہوا ہے۔" مگر اندر ہال سے نظم پڑھنے کی آواز آ رہی تھی۔ آپ نے لڑکھڑاتے ہوئے الفاظ کے اپنے منہ میں کئی کئی ٹکڑے کرتے ہوئے کہا۔ "جلسہ شروع ہو چکا ہے۔ مجھے آواز آ رہی ہے۔" یہ کہہ کر انہوں نے ظہیر کو دھکا دیا۔ اس موقعے پر میں آگے بڑھا۔ اختر صاحب نے تھوڑی دیر کے لئے مجھے بالکل نہ پہچانا۔ نشے سے ان کی آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں۔ میں نے ان کو جھنجھوڑا اور اپنا نام بتایا۔ اس پر انہوں نے ایک لمبی "آہ" کی اور مجھے گلے لگا لیا اور سوالوں کی بوچھاڑ شروع کر دی۔ الفاظ چونکہ ان کے منہ میں تلے اوپر ہو کر ٹوٹ ٹوٹ جاتے تھے۔ اس لئے میں کچھ نہ سمجھ سکا۔ ظہیر نے میرے کان میں کہا کہ میں انہیں اندر ہال میں نہ جانے دوں۔ مگر یہ میرے بس کی بات نہیں تھی۔ میں نے اور تو کچھ نہ کیا۔ اختر صاحب سے یہ کہا۔ "اتنی دیر کے بعد آپ سے ملاقات ہوئی ہے۔ کیا اس کی خوشی میں بوتل میں سے مجھے کچھ نہ ملے گا۔"

آپ نے ظہیر کاشمیری سے کچھ کہا جس کا غالباً یہ مطلب تھا کہ سعادت کو ایک گلاس بنا کر دو۔ ظہیر گلاس میں آتشِ سیال انڈیلنے لگا۔ کہ اختر صاحب تیزی سے لڑکھڑاتے ہوئے ہال کے اندر داخل ہو گئے اور ہمیں اس کی اس وقت خبر ہوئی جب ان کو روکا نہیں جا سکتا تھا پھر بھی میں دوڑ کر اندر گیا اور چبوترے پر چڑھنے سے پہلے ان کو روک لیا۔ مگر وہ میری گرفت سے نکل کر کرسیٔ صدارت پر جا بیٹھے۔ جلسے کے منتظمین بہت پریشان ہوئے۔ کیا کریں کیا نہ کریں۔ سب اسی مخمصے میں گرفتار تھے۔ ان کی حالت بہت بری تھی۔ کچھ دیر تو وہ خاموش بیٹھے کرسی پر جھولتے رہے لیکن جب انہوں نے اٹھ کر تقریر کرنا چاہی تو معاملہ بڑا سنگین ہو گیا۔ مائکروفون کے سامنے آپ بار بار اپنی ڈھیلی پتلون ٹھیک کرتے اور ثابت قدم رہنے کی ناکام کوشش میں بار بار لڑکھڑاتے تھے۔ آپ کی لکنت زدہ زبان سے خدا معلوم کیا نکل رہا تھا۔

حاضرین میں سے کسی شخص نے بلند آواز میں کہا "یہ شرابی ہے۔ اسے باہر نکالو" بس طوفان برپا ہو گیا۔ ایک نے بنچوں پر کھڑے ہو کر بڑے غصّے میں کہا "پاکستان میں کیا یہی کچھ ہو گا" —— دوسرا چلّایا "اور جلسے میں خواتین بھی موجود ہیں"

اختر صاحب برابر بولتے رہے۔ ایک تو ویسے ہی اُن کی کوئی بات سمجھ میں نہ آتی تھی۔ شور میں تو وہ شور کا ایک حصّہ بن گئی تھی۔ جب معاملہ بڑھ گیا تو دوست احباب اختر صاحب کو زبردستی ہال سے باہر لے گئے۔ فضا بہت خراب ہو گئی تھی لیکن شورش کاشمیری کی بروقت تقریر نے مدد کی اور ہال پرسکون ہو گیا۔

اس کے بعد اختر صاحب سے آخری ملاقات میو ہسپتال میں ہوئی۔ میں "پرویز پروڈکشنز لمیٹڈ" کے لئے ایک فلمی کہانی لکھنے میں مصروف تھا کہ احمد ندیم قاسمی آئے۔ آپ نے بتایا۔ "میں نے کسی سے سنا ہے کہ اختر صاحب دو تین روز سے خطرناک طور پر علیل ہیں اور میو ہسپتال میں پڑے ہیں۔ بڑی کس مپرسی کی حالت میں کیا ہم اُن کی کوئی مدد کر سکتے ہیں؟"

ہم سب نے آپس میں مشورہ کیا۔ مسعود پرویز نے ایک راہ نکالی جو یہ تھی۔ کہ ان کی دو تین غزلیں یا نظمیں فلم کے لئے لے لی جائیں اور "پرویز پروڈکشنز" کی طرف سے پانچ سو روپے بطور معاوضے کے ان کو دے دیئے جائیں۔ بات معقول تھی۔ چنانچہ ہم اسی وقت موٹر میں بیٹھ کر میو ہسپتال پہنچے۔

مریضوں سے ملنے کے لئے ہسپتال میں خاص اوقات مقرر ہیں۔ اس لئے ہمیں وارڈ میں جانے کی اجازت نہ ملی۔ ڈیوٹی پہ اس وقت جو ڈاکٹر تھے اُن سے ملے۔ جب آپ کو معلوم ہوا کہ ہم اختر شیرانی سے ملنا چاہتے ہیں۔ تو آپ نے بڑے افسوسناک لہجے میں کہا۔ "ان سے ملاقات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔"

میں نے پوچھا۔ "کیوں؟"

ڈاکٹر صاحب نے اس لہجے میں جواب دیا۔ "وہ بے ہوش ہیں۔ جب سے یہاں آئے ہیں، ان پر غشی طاری ہے۔ یعنی الکوہلک کوما۔"

یہ سن کر ہمیں اختر صاحب کو دیکھنے کا اور زیادہ اشتیاق پیدا ہوا۔ ہم نے

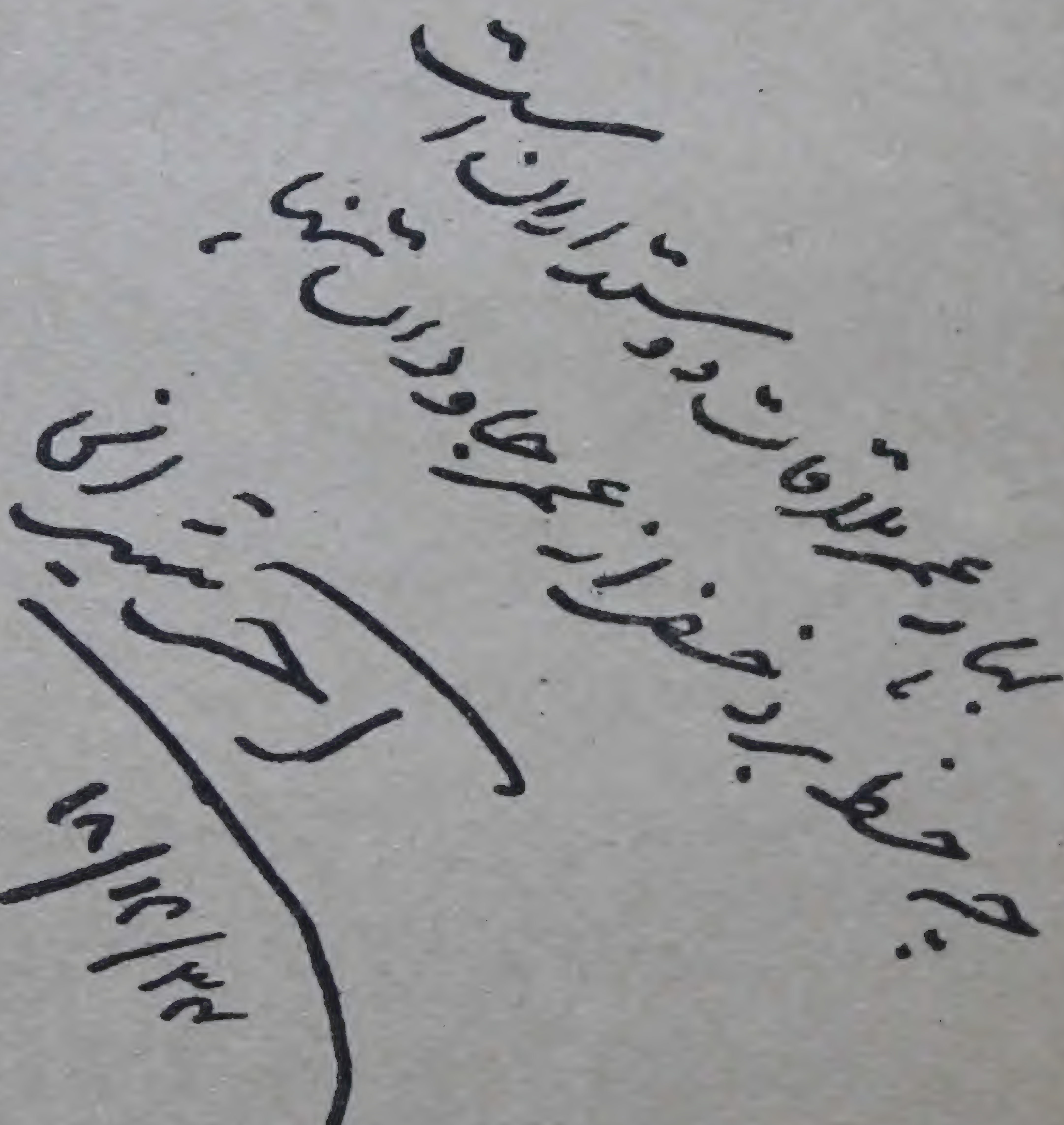
اس کا اظہار کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب اُٹھے اور ہمیں وہاں لے گئے۔ جہاں ہمارا اردو مانی شاعر۔ سلمیٰ اور عذرا کا خالق بے ہوش پڑا تھا۔ بیڈ کے ارد گرد کپڑا تنا تھا۔ ہم نے دیکھا اختر صاحب آنکھیں بند کئے پڑے ہیں۔ لمبے لمبے ناہموار سانس لے رہے ہیں۔ ہونٹ آواز کے ساتھ کھلتے اور بند ہوتے تھے۔ ہم تینوں ان کو اس حالت میں دیکھ کر پژمردہ ہو گئے۔

میں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا۔ "کیا ہم ان کی کوئی مدد کر سکتے ہیں؟"

ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا۔ "ہم امکان بھر کوشش کر چکے ہیں۔ اور امکان بھر کوشش کر رہے ہیں۔ مریض کی حالت بہت نازک ہے۔ گُردے اور جگر بالکل کام نہیں کر رہے۔ انتڑیاں بھی جواب دے چکی ہیں۔ ایک صرف دل اچھی حالت میں ہے۔ گھپ اندھیرے میں امید کی بس یہی ایک چھوٹی سی کرن ہے۔"

جب ہم نے خواہش ظاہر کی کہ اختر صاحب کے اس وقت میں کسی نہ کسی طرح کام آنا چاہتے ہیں۔ تو ڈاکٹر صاحب نے کہا۔ "اچھا تو میں آپ کو ایک دوا کا نام بتاتا ہوں۔ آپ اسے حاصل کرنے کی کوشش کیجئے۔ یہاں پاکستان میں تو بالکل نایاب ہے۔ ممکن ہے ہندوستان میں مل جائے۔"

ڈاکٹر صاحب سے دوا کا نام لکھوا کر میں فیض صاحب کے پاس پہنچا۔ اور ان کو ساری بات بتائی۔ آپ نے اُسی وقت امرتسر ٹیلی فون کرایا۔ اور اپنے اخبار کے ایجنٹ سے کہا کہ وہ دوا حاصل کر کے فوراً لاہور بھجوا دے۔ لیکن افسوس دوا نہ ملی۔ مسعود پرویز نے دلّی فون کیا۔ وہاں سے ابھی جواب نہیں آیا تھا۔ کہ اختر صاحب بے ہوشی کے عالم میں اپنی سلمیٰ اور عذرا کو پیارے ہو گئے۔



تین گولے

حسن بلڈنگز کے فلیٹ نمبر ایک میں تین گولے میرے سامنے میز پر پڑے تھے میں غور سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اور میراجی کی باتیں سُن رہا تھا۔ اس شخص کو پہلی بار میں نے نہیں دیکھا۔ غالباً سن چالیس تھا۔ بمبے چھوڑ کر مجھے دہلی آئے کوئی زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا۔ مجھے یاد نہیں کہ وہ فلیٹ نمبر ایک والوں کا دوست تھا یا ایسے ہی چلا آیا تھا۔ لیکن مجھے اتنا یاد ہے کہ اس نے یہ کہا تھا۔ کہ اس کو ریڈیو سٹیشن سے پتہ چلا تھا کہ میں نکلسن روڈ پر سعادت حسن بلڈنگز میں رہتا ہوں۔

اس ملاقات سے قبل میرے اور اس کے درمیان معمولی سی خط و کتابت ہو چکی تھی۔ میں بمبئی میں تھا۔ جب اس نے ادبی دنیا کے لئے مجھ سے ایک افسانہ طلب کیا تھا۔ میں نے اس کی خواہش کے مطابق افسانہ بھیج دیا۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی لکھ دیا۔

کہ اس کا معاوضہ مجھے ضرور ملنا چاہیئے۔ اس کے جواب میں اس نے ایک خط لکھا۔ کہ میں افسانہ واپس بھیج رہا ہوں۔ اس لئے کہ "ادبی دنیا" کے مالک مفت خور قسم کے آدمی ہیں۔ افسانے کا نام "موسم کی شرارت" تھا۔ اس پر اُس نے اعتراض کیا تھا کہ اس شرارت کا موضوع سے کوئی تعلق نہیں۔ اس لئے اسے تبدیل کر دیا جائے۔ میں نے اس کے جواب میں اس کو لکھا کہ موسم کی شرارت ہی اس افسانے کا موضوع ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ یہ تمہیں کیوں نظر نہ آئی۔ میراجی کا دوسرا خط آیا۔ جس میں اُس نے اپنی غلطی تسلیم کر لی۔ اور اپنی حیرت کا اظہار کیا کہ موسم کی شرارت وہ "موسم کی شرارت" میں کیوں دیکھ نہ سکا۔

میراجی کی لکھائی بہت صاف اور واضح تھی۔ موٹے خط کے نب سے نکلے ہوئے بڑے صحیح نشست کے حروف، تکون کی سی آسانی سے بنے ہوئے، ہر جوڑ نمایاں میں اس سے بہت متاثر ہوا تھا۔ لیکن عجیب بات ہے کہ مجھے اس میں مولانا حامد علیخاں مدیر ہمایوں کی خطاطی کی جھلک نظر آئی۔ یہ ہلکی سی مگر کافی مرئی مماثلت و مشابہت اپنے اندر کیا گہرائی رکھتی ہے۔ اس کے متعلق میں اب بھی غور کرتا ہوں تو مجھے ایسا کوئی شوشہ یا نکتہ سجھائی نہیں دیتا۔ جس پر میں کسی مفروضے کی بنیادیں کھڑی کر سکوں۔

حسن بلڈنگز کے فلیٹ نمبر ایک میں تین گولے میرے سامنے میز پر پڑے تھے۔ اور میراجی لم تڑنگے اور گول مٹول شعر کہنے والا شاعر مجھ سے بڑے صحیح قد و قامت اور بڑی صحیح نوک پلک کی باتیں کر رہا تھا۔ جو میرے افسانوں کے متعلق تھیں۔ وہ

تعریف کررہا تھا نہ تنقیص۔ ایک مختصر سا تبصرہ تھا۔ ایک سرسری سی تنقید تھی۔ مگر اس سے پتہ چلتا تھا۔ کہ میراجی کے دماغ میں مکڑی کے جالے نہیں۔ اس کی باتوں میں الجھاؤ نہیں تھا۔ اور یہ چیز میرے لئے باعثِ حیرت تھی۔ اس لئے کہ اس کی اکثر نظمیں ابہام اور الجھاؤ کی وجہ سے ہمیشہ میری فہم سے بالاتر رہی تھیں لیکن شکل وصورت اور وضع قطع کے اعتبار سے وہ بالکل ایسا ہی تھا۔ جیسا اس کا بے قافیہ مبہم کلام۔ اس کو دیکھ کر اس کی شاعری میرے لئے اور بھی پیچیدہ ہو گئی۔

ن، م، راشد بے قافیہ شاعری کا امام مانا جاتا ہے۔ اس کو دیکھنے کا اتفاق بھی دہلی ہی میں ہؤا تھا۔ اس کا کلام میری سمجھ میں آجاتا تھا۔ اور اس کو ایک نظر دیکھنے سے اس کی شکل وصورت بھی میری سمجھ میں آگئی۔ چنانچہ ایک بار میں نے ریڈیو سٹیشن کے برآمدے میں پڑی ہوئی بغیر مڈگارڈوں کی سائیکل دیکھ کر اس سے ازراہِ مذاق کہا تھا۔ "لو۔ یہ تم ہو اور تمہاری شاعری۔" لیکن میراجی کو دیکھ کر میرے ذہن میں سوائے اس کی مبہم نظموں کے اور کوئی شکل نہیں بنتی تھی

میرے سامنے میز پر تین گولے پڑے تھے۔ تین آہنی گولے۔ سگرٹ کی پنّیوں میں لپٹے ہوئے۔ دو بڑے ایک چھوٹا۔ میں نے میراجی کی طرف دیکھا۔ اسکی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ اور ان کے اُوپر اُس کا بڑا بھورے بالوں سے اٹا ہؤا سر․․․․ یہ بھی تین گولے تھے۔ دو چھوٹے چھوٹے۔ ایک بڑا۔ میں نے یہ مماثلت محسوس کی تو اس کا ردِّ عمل میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ میں نمودار ہؤا۔ میراجی دوسروں کا ردِّ عمل تاڑنے

ہیں بڑا ہوشیار تھا۔ اس نے فوراً اپنی شروع کی ہوئی بات ادھوری چھوڑ کر مجھ سے پوچھا۔ "کیوں بھیّا، کس بات پر مسکرائے ؟"

میں نے میز پر پڑے ہوئے ان تین گولوں کی طرف اشارہ کیا۔ اب میراجی کی باری تھی۔ اس کے پتلے پتلے ہونٹ مہین مہین بھوری مونچھوں کے نیچے گول گول انداز میں مسکرائے۔

اس کے گلے میں موٹے موٹے گول منکوں کی مالا تھی۔ جس کا صرف بالائی حصّہ قمیص کے کھلے ہوئے کالر سے نظر آتا تھا ——— میں نے سوچا۔ "اس انسان نے اپنی کیا ہیئت کذائی بنا رکھی ہے ——— لمبے لمبے غلیظ بال جو گردن سے نیچے لٹکتے تھے ——— فرنچ کٹ سی داڑھی۔ میل سے بھرے ہوئے ناخن۔ سردیوں کے دن تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ مہینوں سے اس کے بدن نے پانی کی شکل نہیں دیکھی۔

یہ اس زمانے کی بات ہے جب شاعر، ادیب اور ایڈیٹر عام طور پر لانڈری میں ننگے بیٹھ کر ڈبل ریٹ پر اپنے کپڑے دُھلوایا کرتے تھے۔ اور بڑی میلی کچیلی زندگی بسر کرتے تھے۔ میں نے سوچا۔ شاید میراجی بھی اسی قسم کا شاعر اور ایڈیٹر ہے۔ لیکن اُس کی غلاظت۔ اس کے لمبے بال، اُس کی فرنچ کٹ داڑھی، گلے کی مالا اور وہ تین آہنی گولے ——— معاشی حالات کے مظہر معلوم نہیں ہوتے تھے۔ اُن میں ایک درویشانہ پن تھا۔ ایک قسم کی راہبیّت ...... جب میں نے راہبیّت کے متعلق سوچا تو میرا دماغ روس کے دیوانے راہب راسپوٹین کی طرف چلا گیا۔ میں نے کہیں

پڑھا تھا۔ کہ وہ بہت غلاظت پسند تھا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ غلاظت کا اس کو کوئی احساس ہی نہیں تھا۔ اس کے ناخنوں میں بھی ہر وقت میل بھرا رہتا تھا۔ کھانا کھانے کے بعد اس کی انگلیاں لتھڑی ہوتی تھیں۔ جب اُسے ان کی صفائی مطلوب ہوتی۔ تو وہ پاس بیٹھی شہزادیوں اور رئیس زادیوں کی طرف بڑھا دیتا۔ جو ان کی تمام آلودگی اپنی زبان سے چاٹ لیتی تھیں۔

کیا میراجی اسی قسم کا درویش اور راہب تھا ---؟ یہ سوال اس وقت اور بعد میں بھی کئی بار میرے دماغ میں پیدا ہوا --- میں امرتسر میں سائیں گھوڑے شاہ کو دیکھ چکا تھا جو الف ننگا رہتا تھا اور کبھی نہاتا نہیں تھا۔ اسی طرح کے اور بھی کئی سائیں اور درویش میری نظر سے گذر چکے تھے جو غلاظت کے پتلے تھے۔ مگر اُن سے مجھے گھن آتی تھی۔ میراجی کی غلاظت سے مجھے نفرت کبھی نہیں ہوئی۔ الجھن البتہ بہت ہوتی تھی۔

گھوڑے شاہ کی قبیل کے سائیں عام طور پر بقدرِ توفیق مغلظات بکتے ہیں۔ مگر میراجی کے منہ سے میں نے کبھی کوئی غلیظ کلمہ نہ سنا۔ اس قسم کے سائیں بظاہر مجرد مگر درپردہ ہر قسم کے جنسی فعل کے مرتکب ہوتے ہیں۔ میراجی بھی مجرد تھا۔ مگر اُس نے اپنی جنسی تسکین کے لئے صرف اپنے دل و دماغ کو اپنا شریکِ کار بنا لیا تھا۔ اس لحاظ سے گو اُس میں اور گھوڑے شاہ کی قبیل کے سائیوں میں ایک گونہ مماثلت تھی۔ مگر وہ اُن سے بہت مختلف تھا۔ وہ تین گولے تھا .... جن کو لڑھکانے کے لئے

اس کو کسی خارجی مدد کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ ہاتھ کی ذراسی حرکت اور تخیل کی ہلکی سی جنبش سے وہ ان تین اجسام کو اونچی سے اونچی بلندی اور نیچی سے نیچی گہرائی کی سیر کرا سکتا تھا اور یہ گُر اس کو انہی تین گولوں نے بتایا تھا جو غالباً اس کو کہیں پڑے ہوئے ملے تھے۔ ان خارجی اشاروں ہی نے اس پر ایک ازلی و ابدی حقیقت کو منکشف کیا تھا۔ حسن، عشق اور موت ...... اس تثلیث کے تمام اقلیدسی زاویے صرف ان تین گولوں کی بدولت اس کی سمجھ میں آئے تھے۔ لیکن حسن اور عشق کے انجام کو چونکہ اس نے شکست خوردہ عینک سے دیکھا تھا جس کے شیشوں میں تریڑے تھے۔ اس لئے اُس کو جس شکل میں اُس نے دیکھا تھا۔ صحیح نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے۔ کہ اس کے سارے وجود میں ایک ناقابلِ بیان ابہام کا زہر پھیل گیا تھا۔ جو ایک نقطے سے شروع ہو کر ایک دائرے میں تبدیل ہو گیا تھا۔ اس طور پر کہ اس کا ہر نقطہ اس کا نقطہ آغاز ہے اور وہی نقطۂ انجام۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا ابہام نوکیلا نہیں تھا۔ اس کا رُخ موت کی طرف تھا نہ زندگی کی طرف۔ رجائیت کی سمت، نہ قنوطیت کی جانب۔ اس نے آغاز اور انجام کو اپنی مٹھی میں اس زور سے بھینچ رکھا تھا۔ کہ ان دونوں کا لہو نچڑ نچڑ کر اس میں سے ٹپکتا رہتا تھا۔ لیکن سادیت پسندوں کی طرح وہ اس سے مسرور نظر نہیں آتا تھا۔ یہاں پھر اُس کے جذبات گدل ہو جاتے تھے۔ اُن تین آہنی گولوں کی طرح، جن کو میں نے پہلی مرتبہ حسن بلڈنگز کے فلیٹ نمبر ایک میں دیکھا تھا۔

اس کے شعر کا ایک مصرع ہے:

نگری نگری پھرا مسافر گھر کا رستہ بھول گیا

مسافر کو رستہ بھولنا ہی تھا۔ اس لئے کہ اس نے چلتے وقت نقطۂ آغاز پر کوئی نشان نہیں بنایا تھا۔ اپنے بنائے ہوئے دائرے کے خط کے ساتھ ساتھ گھومتا وہ یقیناً کئی بار ادھر سے گذرا۔ مگر اُسے یاد نہ رہا۔ کہ اس نے اپنا یہ طویل سفر کہاں سے شروع کیا تھا۔ اور میں تو سمجھتا ہوں۔ کہ میراجی یہ بھول گیا تھا۔ کہ وہ مسافر ہے سفر ہے یا راستہ۔ یہ تثلیث بھی اس کے دل و دماغ کے خلیوں میں دائرے کی شکل اختیار کر گئی تھی۔

اس نے ایک لڑکی میرا سے محبّت کی۔ اور وہ ثناء اللہ سے میراجی بن گیا۔ اسی میرا کے نام کی رعایت سے اُس نے میرا بائی کے کلام کو پسند کرنا شروع کر دیا۔ جب اپنی اس محبوبہ کا جسم میسّر نہ آیا۔ تو کوزہ گر کی طرح چاک گھما کر اپنے تخیل کی مٹی سے شروع شروع میں اُسی شکل وصورت کے جسم تیار کرنے شروع کر دیئے۔ لیکن بعد میں آہستہ آہستہ اس جسم کی ساخت کے تمام ممیّزات، اُس کی تمام نمایاں خصوصیتیں تیز رفتار چاک پر گھوم گھوم کر نت نئی ہیئت اختیار کرتی گئیں۔ اور ایک وقت ایسا آیا۔ کہ میراجی کے ہاتھ، اس کے تخیّل کی نرم نرم مٹّی اور چاک متواتر گردش سے بالکل گول ہو گئے۔ کوئی بھی ٹانگ میرا کی ٹانگ ہو سکتی تھی۔ کوئی بھی چیتھڑا میرا کا پیراہن بن سکتا تھا۔ کوئی بھی رہگذر میرا کی رہگذر میں تبدیل ہو سکتی تھی۔ اور انتہا یہ ہوئی کہ تخیل کی نرم نرم مٹی کی ' دندھی سوندھی باس سڑاند بن گئی۔ اور وہ شکل دینے سے پہلے

ہی اس کو چاک سے اتارنے لگا۔

پہلے میرا بلند بام محلوں میں رہتی تھی۔ میراجی ایسا بھٹکا کہ راستہ بھول کر اُس نے نیچے اُترنا شروع کر دیا۔ اس کو اس گراوٹ کا مطلقاً احساس نہ تھا۔ اس لیے کہ اُترائی میں ہر قدم پر میرا کا تخیل اس کے ساتھ تھا۔ جو اُس کے جُوتے کے تلووں کی طرح گھستا گیا۔ پہلے میرا عام محبوباؤں کی طرح بڑی خوبصورت تھی۔ لیکن یہ خوبصورتی ہر نسوانی پوشاک میں ملبوس دیکھ دیکھ کر کچھ اس طور پر اُس کے دل و دماغ میں مسخ ہو گئی تھی۔ کہ اس کے صحیح تصوّر کی المناک جدائی کا بھی میراجی کو احساس نہ تھا۔ اگر احساس ہوتا تو اتنے بڑے المیے کے جلوس کے چند غیر مبہم نشانات اس کے کلام میں یقیناً موجود ہوتے۔ جو میرا سے محبّت کرتے ہی اس کے دل و دماغ میں نکلنا شروع ہو گیا تھا۔

حُسن، عشق اور موت۔ یہ تکون یچک کر میراجی کے وجود میں گول ہو گئی تھی۔ صرف یہی نہیں دنیا کی ہر مثلث اُس کے دل و دماغ میں مدوّر ہو گئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے ارکانِ ثلاثہ کچھ اس طرح آپس میں گڈمڈ ہو گئے تھے۔ کہ ان کی ترتیب درہم برہم ہو گئی تھی۔ کبھی موت پہلے حسن آخر اور عشق درمیان میں۔ کبھی عشق پہلے موت اس کے بعد اور حسن آخر میں۔ اور یہ چکّر نامحسوس طور پر چلتا رہتا تھا۔

کسی بھی عورت سے عشق کیا جائے تکونا ایک ہی قسم کا بنتا ہے۔ حسن، عشق اور موت — عاشق، معشوق اور وصل۔ میرا سے ثناء اللہ کا وصال جیسا کہ جاننے والوں

کو معلوم ہے، نہ ہؤا یا نہ ہو سکا۔ اس نہ ہونے یا نہ ہو سکنے کا ردِّ عمل میراجی تھا۔ اُس نے اس معاشقے میں شکست کھا کر اس تثلیث کے ٹکڑوں کو اس طرح جوڑا تھا۔ کہ اُن میں ایک سالمیّت تو آگئی تھی۔ مگر اصلیت مسخ ہوگئی تھی۔ وہ تین نوکیں جن کا رُخ خطِ مستقیم میں ایک دوسرے کی طرف ہوتا ہے، دب گئی تھیں۔ وصالِ محبوب کے لئے اب یہ لازم نہیں تھا۔ کہ محبوب موجود ہو۔ وہ خود ہی عاشق تھا خود ہی معشوق اور خود ہی وصال۔

مجھے معلوم نہیں اُس نے یہ گولے کہاں سے لئے تھے۔ خود حاصل کئے تھے۔ یا کہیں پڑے ہوئے مل گئے تھے۔ مجھے یاد ہے، ایک مرتبہ ان کے متعلق میں نے بمبئی میں اس سے استفسار کیا تھا۔ تو اُس نے سرسری طور پہ اتنا کہا تھا۔ "میں نے یہ خود پیدا نہیں کئے اپنے آپ پیدا ہو گئے ہیں۔"

پھر اُس نے اس گولے کی طرف اشارہ کیا تھا جو سب سے بڑا تھا۔ "پہلے یہ وجود میں آیا تھا۔ اس کے بعد یہ دوسرا جو اس سے چھوٹا ہے۔ اس کے پیچھے یہ کوچک!"

میں نے مسکرا کر اُس سے کہا تھا۔ "بڑے تو باوا آدم علیہ السلام ہوئے۔ خدا اُن کو وہ جنّت نصیب کرے جس سے وہ نکالے گئے تھے ـــــ دوسرے کو ہم امّاں حوا کہہ لیتے ہیں۔ اور تیسرے کو ان کی اولاد!"

میری اس بات پہ میراجی خوب کُھل کر ہنسا تھا۔ میں اب سوچتا ہوں تو مجھے

ان تین گولوں پر ساری دنیا گھومتی نظر آتی ہے۔ تثلیث کیا تخلیق کا دوسرا نام نہیں؟ وہ تمام تثلیثیں جو ہماری زندگی کی اقلیدس میں موجود ہیں۔ کیا اُن میں انسان کی تخلیقی قوتوں کا نشان نہیں ہے۔

خدا، بیٹا اور روح القدس، عیسائیت کے اقانیم ــ ترسول مہادیو کا سہ شاخہ بھالا ــ تین دیوتا۔ برہما، وشنو، ترلوک ــ آسمان زمین اور پاتال ــ خشکی، تری اور ہوا ــ تین بنیادی رنگ۔ سرخ، نیلا اور زرد۔ پھر ہمارے رسوم اور مذہبی احکام، یہ تیجے۔ سوئم اور تلینڈیاں۔ وضو میں تین مرتبہ ہاتھ منہ دھونے کی شرط، تین طلاقیں اور سہ گونہ معانقے۔ اور جوئے میں نرد بازی کے تین پانسوں کے تین نقطے یعنی تین کانے۔ موسیقی کے تیتے ــ حیاتِ انسانی کے ملبے کو اگر کھود کر دیکھا جائے تو میرا خیال ہے، ایسی کئی تثلیثیں مل جائیں گی، اس لئے کہ اُس کے توالد و تناسل کے افعال کا محور بھی اعضائے ثلاثہ ہے۔

اقلیدس میں مثلث بہت اہم حیثیت رکھتی ہے۔ دوسری اشکال کے مقابلے میں یہ ایسی کٹر اور بے لوچ شکل ہے۔ جسے آپ کسی اور شکل میں تبدیل نہیں کر سکتے۔ لیکن میراجی نے اپنے دل و دماغ اور جسم میں اس تکون کو جس کا ذکر اُوپر ہو چکا ہے۔ کچھ اس طرح دبایا کہ اُس کے رُکن اپنی جگہوں سے ہٹ گئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ آس پاس کی دوسری چیزیں بھی اس تکون کے ساتھ مسخ ہو گئیں اور میراجی کی شاعری ظہور میں آئی۔

پہلی ملاقات ہی میں میری اسکی بے تکلفی ہو گئی تھی۔ اُس نے مجھے دہلی میں بتایا تھا۔ کہ اُس کی جنسی اجابت عام طور پر ریڈیو سٹیشن کے اسٹڈیوز میں ہوتی ہے۔ جب یہ کمرے خالی ہوتے تھے۔ تو وہ بڑے اطمینان سے اپنی حاجت رفع کر لیا کرتا تھا۔ اس کی یہ جنسی ضلالت ہی، جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس کی مبہم منظومات کا باعث ہے ورنہ جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں۔ عام گفتگو میں وہ بڑا واضح دماغ تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ جو کچھ اس پر بیتی ہے اشعار میں بیان ہو جائے۔ مگر مصیبت یہ تھی۔ کہ جو مصیبت اس پر ٹوٹی تھی۔ اس کو اُس نے بڑے بے ڈھنگے طریقے سے جوڑ کر اپنی نگاہوں کے سامنے رکھا تھا۔ اُس کو اس کا علم تھا۔ اس ضمن میں وہ اپنی بے چارگی اچھی طرح محسوس کرتا تھا۔ لیکن عام آدمیوں کی طرح اُس نے اپنی اس کمزوری کو اپنا خاص رنگ بنانے کی کوشش کی اور آہستہ آہستہ اس میراکو بھی اپنی گمراہی کی سُولی پہ چڑھا دیا۔

بحیثیت شاعر کے اُس کی حیثیت وہی ہے جو گلے سڑے پتوں کی ہوتی ہے جسے کھاد کے طور پہ استعمال کیا جا سکتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں اس کا کلام بڑی عمدہ کھاد ہے جس کی افادیت ایک نہ ایک دن ضرور ظاہر ہو کے رہے گی۔ اُس کی شاعری ایک گمراہ انسان کا کلام ہے۔ جو انسانیت کی عمیق ترین پستیوں سے متعلق ہونے کے باوجود دوسرے انسانوں کے لئے اُونچی فضاؤں میں مرغِ باد نما کا کام دے سکتا ہے۔ اس کا کلام ایک "جِگ سا پزل" ہے جس کے ٹکڑے بڑے اطمینان اور سکون سے جوڑ کر دیکھنے چاہئیں۔

بحیثیت انسان کے وہ بڑا دلچسپ تھا۔ پرلے درجے کا مخلص جس کو اپنی اس قریب قریب نایاب صفت کا مطلقاً احساس نہیں تھا۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ وہ اشخاص جو اپنی خواہشاتِ جسمانی کا فیصلہ اپنے ہاتھوں کو سونپ دیتے ہیں، عام طور پر اسی قسم کے مخلص ہوتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ خود کو صریحاً دھوکا دیتے ہیں۔ مگر اس فریب دہی میں جو خلوص ہوتا ہے۔ وہ ظاہر ہے۔

میراجی نے شاعری کی، بڑے خلوص کے ساتھ۔ شراب پی، بڑے خلوص کے ساتھ، بھنگ پی، وہ بھی بڑے خلوص کے ساتھ۔ لوگوں سے دوستی کی، اور اسے نبھایا۔ اپنی زندگی کی ایک عظیم ترین خواہش کو جُل دینے کے بعد وہ کسی اور سے دھوکا فریب کرنے کا اہل ہی نہیں رہا تھا اس اہلیت کے اخراج کے بعد وہ اس قدر بے ضرر ہو گیا تھا کہ بے مصرف سا معلوم ہوتا تھا۔ ایک بھٹکا ہوا مسافر جو نگری نگری پھر رہا ہے۔ منزلیں قدم قدم پہ اپنی آغوش اس کے لیے وا کرتی ہیں، مگر وہ ان کی طرف دیکھے بغیر آگے نکلتا جا رہا ہے...... کسی ایسی جگہ، جس کی کوئی سمت ہے نہ رقبہ...... ایک ایسی تکون کی جانب جس کے ارکان اپنی جگہ سے ہٹ کر تین دائروں کی شکل میں اس کے گرد گھوم رہے ہیں۔

میں نے میراجی سے اُس کے کلام کے متعلق دو تین جملوں سے زیادہ کبھی گفتگو نہیں کی، میں اُسے بکواس کہا کرتا تھا۔ اور وہ اُسے تسلیم کرتا تھا۔ ان تین گولوں اور موٹے موٹے دانوں کی مالا کو میں اُس کا فراڈ کہتا تھا اسے بھی وہ تسلیم کرتا تھا۔

حالانکہ ہم دونو جانتے تھے کہ یہ چیزیں فراڈ نہیں ہیں۔

ایک دفعہ اُس کے ہاتھ میں تین کے بجائے دو گولے دیکھ کر مجھے بہت تعجب ہُوا، میں نے جب اس کا اظہار کیا تو میراجی نے کہا۔ "برخوردار کا انتقال ہو گیا ہے۔ مگر اپنے وقت پر ایک اور پیدا ہو جائے گا!"

میں جب تک بمبئی میں رہا، یہ دوسرا برخوردار پیدا نہ ہُوا۔ یا تو اماں حوّا عقیم ہو گئی تھی یا باوا آدم مردم خیز نہیں رہے تھے۔ یہ رہی سہی خارجی تثلیث بھی ٹوٹ گئی تھی۔ اور یہ بُری فال تھی۔ بعد میں مجھے معلوم ہُوا کہ میراجی کو اس کا احساس تھا، چنانچہ جیسا کہ سننے میں آیا ہے، اُس نے اس کے باقی کے دو اقنوم بھی اپنے ہاتھ سے علیحدہ کر دیئے تھے۔

مجھے معلوم نہیں میراجی گھومتا گھامتا کب بمبئی پہنچا میں ان دنوں فلمستان میں تھا۔ جب وہ مجھ سے ملنے کے لئے آیا۔ بہت خستہ حالت میں تھا، ہاتھ میں تین گولے بدستور موجود تھے۔ بوسیدہ سی کاپی بھی تھی۔ جس میں غالباً میرابائی کا کلام اُس نے اپنے ہاتھ سے لکھا ہُوا تھا۔ ساتھ ہی ایک عجیب شکل کی بوتل تھی۔ جس کی گردن مڑی ہوئی تھی، اس میں میراجی نے شراب ڈال رکھی تھی، بوقتِ طلب وہ اس کا کاگ کھولتا اور ایک گھونٹ چڑھا لیتا تھا۔

داڑھی غائب تھی، سر کے بال بہت ہلکے تھے۔ مگر بدن کی غلاظت بدستور موجود چپل کا ایک پیر درست حالت میں تھا، دوسرا مرمّت طلب تھا۔ یہ کمی

اُس نے پاؤں پر رسّی باندھ کر دور کر رکھی تھی۔ تھوڑی دیر ادھر اُدھر کی باتیں ہوئیں۔ ان دنوں غالباً "آٹھ دن" کی شوٹنگ ہو رہی تھی۔ اس کی کہانی میری تھی۔ جس کے لئے دو ایک گانوں کی ضرورت تھی۔ میں نے اس خیال سے کہ میراجی کو کچھ روپے مل جائیں۔ اُس سے یہ گانے لکھنے کے لئے کہا۔ جو اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے لکھ دیئے۔ مگر کھڑے کھڑے قسم کے، نہایت واہیات جو یکسر غیر فلمی تھے۔ میں نے جب اس کو اپنا فیصلہ سنایا تو وہ خاموش رہا۔ واپس جاتے ہوئے اُس نے مجھ سے سات روپے طلب کئے کہ اُسے ایک اَدّھا لینا تھا۔

اس کے بعد بہت دیر تک اس کو ہر روز ساڑھے سات روپے دینا میرا فرض ہو گیا۔ میں خود بوتل کا رسیا تھا۔ یہ منہ نہ لگے تو جی پر کیا گذرتی ہے۔ اس کا مجھے بخوبی علم تھا۔ اس لئے میں اس رقم کا انتظام کر رکھتا۔ سات روپے میں رم کا اَدّھا آتا تھا، باقی آٹھ آنے اس کے آنے جانے کے لئے ہوتے تھے۔

بارشوں کا موسم آیا۔ تو اُسے بڑی دقّت محسوس ہوئی۔ بمبئی میں اتنی شدید بارش ہوتی ہے کہ آدمی کی ہڈیاں تک بھیگ جاتی ہیں۔ اس کے پاس فالتو کپڑے نہیں تھے۔ اس لئے یہ موسم اس کے لئے اور بھی زیادہ تکلیف دہ تھا۔ اتفاق سے میرے پاس ایک برساتی تھی۔ جو میرا ایک ہٹا کٹا فوجی دوست صرف اس لئے میرے گھر بھول گیا تھا۔ کہ وہ بہت وزنی تھی اور اس کے کندھے شل کر دیتی تھی۔ میں نے اس کا ذکر میراجی سے کیا، اور اس کے وزن سے بھی اس کو آگاہ کر دیا۔ میراجی نے

کہا۔ "کوئی پروا نہیں، میرے کندھے اس کا بوجھ برداشت کریں گے!" چنانچہ میں نے وہ برساتی اس کے حوالے کر دی۔ جو ساری برسات اس کے کندھوں پر رہی۔

مرحوم کو سمندر سے بہت دلچسپی تھی۔ میرا ایک دور کا رشتہ دار اشرف ہے۔ وہ اُن دنوں پائلٹ تھا۔ جوہو میں سمندر کے کنارے رہتا تھا۔ یہ میراجی کا دوست تھا معلوم نہیں ان کی دوستی کی بنا کیا تھی، کیونکہ اشرف کو شعر و شاعری سے دُور کا واسطہ بھی نہیں ہے۔ بہرحال میراجی اُس کے ہاں رہتا تھا۔ اور دن کو اُس کے حساب میں پیتا تھا۔

اشرف جب اپنے جھونپڑے میں نہیں ہوتا تھا تو میراجی ساحل کی نرم نرم اور گیلی گیلی ریت پر وہ برساتی بچھا کر لیٹ جاتا۔ اور مبہم شعر فکر کیا کرتا تھا۔

ان دنوں ہر اتوار کو جوہو جانا اور دن بھر پینا میرا معمول سا ہو گیا تھا۔ دو تین دوست اکٹھے ہو کر صبح نکل جاتے اور سارا دن ساحل پر گذارتے۔ میراجی وہیں مل جاتا۔ اوٹ پٹانگ قسم کے مشاغل رہتے۔ ہم نے اِس دوران میں شاذ ہی کبھی ادب کے بارے میں گفتگو کی ہو۔ مردوں اور عورتوں کے تین چوتھائی ننگے جسم دیکھتے تھے دہی بڑے اور چاٹ کھاتے تھے، ناریل کے پانی کے ساتھ شراب ملا کر پیتے تھے اور میراجی کو وہیں چھوڑ کر واپس گھر چلے آتے تھے۔

اشرف کچھ عرصے کے بعد میراجی کا بوجھ محسوس کرنے لگا تھا۔ وہ خود پیتا تھا مگر اپنی مقررہ حد سے آگے نہیں بڑھتا تھا، لیکن میراجی کے متعلق اُسے شکایت تھی۔

کہ وہ اپنی حد سے گذر کر ایک اور حد قائم کر لیتا ہے جس کی کوئی حد نہیں ہوتی۔۔
بے ہوش پڑا ہے، مگر اور مانگے جا رہا ہے۔ اپنی اس طلب کا دائرہ بنا لیتا ہے۔ اور بھول جاتا ہے کہ یہ کہاں سے شروع ہوئی تھی اور اسے کہاں ختم ہونا تھا۔

مجھے اُس کی شراب نوشی کے اس پہلو کا علم نہیں تھا۔ لیکن ایک دن اس کا تجربہ بھی ہو گیا۔ جس کو یاد کر کے میرا دل آج بھی افسردہ ہو جاتا ہے۔

سخت بارش ہو رہی تھی۔ جس کے باعث برقی گاڑیوں کی نقل و حرکت کا سلسلہ درہم برہم ہو گیا تھا۔ "خشک دن" ہونے کی وجہ سے شہر میں شراب کی دکانیں بند تھیں۔ مضافات میں صرف باندرہ ہی ایک ایسی جگہ تھی۔ جہاں سے مقررہ داموں پر یہ چیز مل سکتی تھی۔ میراجی میرے ساتھ تھا۔ اس کے علاوہ میرا پرانا لنگوٹیا حسن عباس جو دہلی سے میرے ساتھ چند دن گذارنے کے لئے آیا تھا۔ ہم تینوں باندرہ اتر گئے اور ڈیڑھ بوتل رم خرید لی۔ واپس اسٹیشن پہ آئے تو راجہ مہدی علی خاں مل گیا، میری بیوی لاہور گئی ہوئی تھی۔ اس لئے پروگرام یہ بنا کہ میراجی اور راجہ، رات میرے ہی ہاں رہیں گے۔

ایک بجے تک رم کے دور چلتے رہے، بڑی بوتل ختم ہو گئی۔ راجہ کے لئے دو پگ کافی تھے، ان کو ختم کر کے وہ ایک کونے میں بیٹھ گیا اور فلمی گیت لکھنے کی پریکٹس کرتا رہا۔ میں، حسن عباس اور میراجی پیتے اور فضول فضول باتیں کرتے رہے جن کا سر تھا نہ پیر۔ کرفیو کے باعث بازار سنسان تھا۔ میں نے کہا اب سونا چاہیئے عباس اور راجہ نے

میرے اس فیصلے پر صاد کیا۔ میراجی نہ مانا۔ ادّھے کی موجودگی اس کے علم میں تھی۔ اس لئے وہ اور پینا چاہتا تھا، معلوم نہیں کیوں، میں اور عبّاس ضد میں آ گئے اور وہ ادّھا کھولنے سے انکار کر دیا۔ میراجی نے پہلے منّتیں کیں، پھر حکم دینے لگا۔ میں اور عبّاس دونوں انتہا درجے کے سفلے ہو گئے۔ ہم نے اس سے ایسی باتیں کیں کہ ان کی یاد سے مجھے ندامت محسوس ہوتی ہے۔ لڑ جھگڑ کر ہم دوسرے کمرے میں چلے گئے۔

میں صبح خیز ہوں سب سے پہلے اٹھا اور ساتھ والے کمرے میں گیا۔ میں نے رات کو راجہ سے کہہ دیا تھا۔ کہ وہ میراجی کے لئے اسٹریچر بچھا دے۔ اور خود صوفے پر سو جائے۔ راجہ اسٹریچر میں لبالب بھرا تھا۔ مگر صوفے پر میراجی موجود نہیں تھا۔ مجھے سخت حیرت ہوئی، غسل خانے اور باورچی خانے میں دیکھا۔ وہاں بھی کوئی نہیں تھا۔ میں نے سوچا شاید وہ ناراضی کی حالت میں چلا گیا ہے۔ چنانچہ واقعات معلوم کرنے کے لئے میں نے راجہ کو جگایا۔ اس نے بتایا کہ میراجی موجود تھا۔ اُس نے خود اُسے صوفے پر لٹایا تھا، ہم یہ گفتگو کر ہی رہے تھے۔ کہ میراجی کی آواز آئی "میں یہاں موجود ہوں"۔

وہ فرش پر راجہ مہدی علی خان کے اسٹریچر کے نیچے لیٹا ہوا تھا۔ اسٹریچر اُٹھا کر اس کو باہر نکالا گیا۔ رات کی بات ہم سب کے دل و دماغ میں عود کر آئی۔ لیکن کسی نے اس پر تبصرہ نہ کیا۔ میراجی نے مجھ سے آٹھ آنے لئے اور بھاری بھر کم

برساتی اُٹھا کر چلا گیا۔ مجھے اُس پر بہت ترس آیا اور اپنے پر بہت غصّہ۔ چنانچہ میں نے دل ہی دل میں خود کو بہت لعنت ملامت کی کہ میں رات کو ایک نکمّی سی بات پر اس کو دُکھ پہنچانے کا باعث بنا۔

اس کے بعد بھی میراجی مجھ سے ملتا رہا۔ فلم انڈسٹری کے حالات منقلب ہو جانے کے باعث میرا ہاتھ تنگ ہو گیا تھا۔ اب میں ہر روز میراجی کی شراب کا خرچ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے اُس سے کبھی اس کا ذکر نہیں کیا۔ لیکن اس کو علم ہو گیا تھا، چنانچہ ایک دن مجھے اُس سے معلوم ہُوا کہ اُس نے شراب چھوڑنے کے قصد سے بھنگ کھانی شروع کر دی ہے۔

بھنگ سے مجھے سخت نفرت ہے۔ ایک دو بار استعمال کرنے سے میں اس کے ذلّت آفریں نشے اور اُس کے ردِّ عمل کا تجربہ کر چکا ہوں۔ میں نے میراجی سے جب اس کے بارے میں گفتگو کی تو اُس نے کہا۔ "نہیں..... میرا خیال ہے یہ نشہ بھی کوئی بُرا نہیں، اس کا اپنا رنگ ہے۔ اپنی کیفیت ہے، اپنا مزاج ہے۔" اس نے بھنگ کے نشے کی خصوصیات پر ایک لکچر سا شروع کر دیا۔۔ افسوس ہے کہ مجھے پوری طرح یاد نہیں کہ اُس نے کیا کہا تھا۔ اس وقت میں اپنے دفتر میں تھا اور "آٹھ دن" کے ایک مشکل باب کی منظر نویسی میں مشغول تھا۔ اور میرا دماغ ایک وقت میں صرف ایک کام کرنے کا عادی ہے۔ وہ باتیں کرتا رہا اور میں مناظر سوچنے میں مشغول رہا۔

بھنگ پینے کے بعد دماغ پر کیا گذرتی ہے۔ مجھے اس کے متعلق صرف اتنا ہی معلوم تھا کہ گردوپیش کی چیزیں یا تو بہت چھوٹی ہو جاتی ہیں۔ یا بہت بڑی۔ آدمی حد سے زیادہ ذکی الحس ہو جاتا ہے۔ کانوں میں ایسا شور مچتا ہے۔ جیسے ان میں لوہے کے کارخانے کھل گئے ہیں۔ دریا پانی کی ہلکی سی لکیر بن جاتے ہیں۔ اور پانی کی ہلکی سی لکیریں بہت بڑے دریا۔ آدمی ہنسنا شروع کرے تو ہنستا ہی جاتا ہے۔ روئے تو روتے نہیں تھکتا۔

میراجی نے اس نشے کی جو کیفیت بیان کی وہ میرا خیال ہے اس سے بہت مختلف تھی۔ اُس نے مجھے اس کے مختلف مدارج بتائے تھے، اس وقت جب کہ وہ بھنگ کھائے ہوئے تھا۔ غالباً لہروں کی بات کر رہا تھا۔ "لو وہ کچھ گڑبڑ سی ہوئی ...... کوئی چیز ادھر اُدھر کی چیزوں سے مل ملا کر اُوپر کو اُٹھی ...... نیچے آگئی ...... پھر گڑبڑ سی ہوئی ...... اور ...... آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگی ...... دماغ کی نالیوں میں رینگنے لگی، سرسراہٹ محسوس ہو رہی ہے ...... پر بڑی نرم نرم ...... پہلے لون تھا ...... پورے اعلان کے ساتھ ...... اب یہ غنّے میں تبدیل ہو رہا ہے ...... دھیرے دھیرے ...... ہولے ہولے ...... جیسے بلی گدگدے پنجوں پر چل رہی ہے ...... اوہ ...... زور سے میاؤں ہوئی ...... لہر ٹوٹ گئی ...... غائب ہو گئی۔" اور وہ چونک پڑتا۔

تھوڑے وقفے کے بعد وہ پھر ہی کیفیت نئے سرے سے محسوس کرتا۔ "لو،

اب پھر نون کے اعلان کی تیاریاں ہونے لگیں۔ گڑبڑ شروع ہو گئی ہے .... آس پاس کی چیزیں یہ اعلان سننے کے لئے جمع ہو رہی ہیں۔ کانا پھوسیاں بھی ہو رہی ہیں .... ہو گیا .... اعلان ہو گیا ــــ نون اوپر کو اٹھا .... آہستہ آہستہ نیچے آیا .... پھر وہی گڑبڑ ــــ وہی کانا پھوسیاں .... آس پاس کی چیزوں کے ہجوم میں نون نے انگڑائی لی اور رینگنے لگا .... غنّہ کھنچ کر لمبا ہوتا جا رہا ہے .... کوئی اسے کوٹ رہا ہے، روئی کے ہتوڑوں سے .... ضربیں سنائی نہیں دیتیں، لیکن ان کا ننھا منا پرسے بھی ہلکا لمس محسوس ہو رہا ہے .... غوں، غوں، غوں .... جیسے بچّہ ماں کا دودھ پیتے پیتے سو رہا ہے .... ٹھہرو، دودھ کا بلبلہ بن گیا ہے .... لو وہ پھٹ بھی گیا ...." اور وہ پھر چونک پڑتا۔

مجھے یاد ہے، میں نے اُس سے کہا تھا کہ وہ اپنے اس تجربے، اپنی اس کیفیت کو اشعار میں من وعن بیان کرے۔ اس نے وعدہ کیا تھا معلوم نہیں اُس نے ادھر توجہ دی یا بھول گیا۔

کرید کرید کر میں کسی سے کچھ پوچھا نہیں کرتا۔ سرسری گفتگوؤں کے دوران میں میراجی سے مختلف موضوعوں پر تبادلۂ خیالات ہوتا تھا، لیکن اس کی ذاتیات کبھی معرضِ گفتگو میں نہیں آتی تھیں۔ ایک مرتبہ معلوم نہیں کس سلسلے میں اُس کی اجابتِ جنسی کے خاص ذریعے کا ذکر آ گیا۔ اُس نے مجھے بتایا۔ اس کے لئے

اب مجھے خارجی چیزوں سے مدد لینی پڑتی ہے۔ مثال کے طور پہ ایسی ٹانگیں جن پہ سے مَیل اتارا جا رہا ہے.........خون میں لتھڑی ہوئی خاموشیاں......"

یہ سُن کر میں نے محسوس کیا تھا کہ میراجی کی ضلالت اب اس انتہا کو پہنچ گئی ہے کہ اُسے خارجی ذرائع کی امداد طلب کرنی پڑ گئی ہے۔ اچھا ہوُا جو وہ جلدی مر گیا۔ کیونکہ اس کی زندگی کے خرابے میں اور زیادہ خراب ہونے کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔ وہ اگر کچھ دیر سے مرتا تو یقیناً اس کی موت بھی ایک دردناک ابہام بن جاتی۔

باری صاحب

مستبد اور جابر حکمرانوں کا عبرت ناک انجام
رُوس کے گلی کوچوں میں صدائے انتقام
زارّیت کے تابوت میں آخری کیل

اِن تین جلی سُرخیوں کے قدِ آدم اشتہار امرتسر کی متعدد دیواروں پر چسپاں تھے۔ لوگ زیادہ تر صرف یہ سرخیاں ہی پڑھتے تھے۔ اور آپس میں چہ میگوئیاں کرتے چلے جاتے تھے۔ معلوم نہیں سن کونسا تھا۔ مگر موسم گرفتاریوں کا تھا۔ اور ایسے موسم امرتسر میں آتے ہی رہتے تھے۔ غالباً اُن دنوں بموں کی واردا تیں بھی ہوتی تھیں خط ڈالنے والے لال لال ڈبوں میں آگ لگانے والی چیزیں ڈالنے کا شغل بھی جاری تھا۔ فضا خاصی سہمی ہوئی تھی۔ اس لئے یہ اشتہار جو امرتسر کی دیواروں پہ جابجا

چسپاں تھے۔ پاس سے گزرنے والوں کی توجہ اپنی طرف کھینچتے تو تھے، مگر وہ جلدی جلدی نظروں سے اشتہار کی عبارت کے چند نوالے اُٹھا کر اپنا رستہ پکڑتے تھے۔ کہ کہیں اسی جرم میں نہ دھر لئے جائیں۔

یہ اشتہار آسکر وائلڈ کے ایک گھٹیا سے ڈرامے "ویرا" کے اُردو ترجمے کا تھا جو میں نے اور میرے لنگوٹیے حسن عباس نے مل کر کیا تھا، اور اصلاح اختر شیرانی سے لی تھی۔ باری صاحب نے جو میرے اور حسن عباس دونو کے گُرو تھے۔ اس ترجمے میں ہماری بڑی مدد کی تھی۔ کتاب ہم نے خود تنائی برقی پریس میں چھپوائی تھی۔ باری صاحب اس کے تمام فرمے خود اپنے کندھوں پہ لاد لاد کر گھر لائے تھے۔ تاکہ محفوظ رہیں اُن کو خطرہ تھا کہ پولیس چھاپہ مار کر پریس میں سے ساری کتاب اُٹھا لے جائے گی۔ میرے اور حسن عباس کے لئے یہ سب سلسلہ بڑا دلچسپ اور حرارت بخش تھا جیل میں کیا کیا صعوبتیں اٹھانا پڑتی ہیں، تھانوں میں کیا دُرگت ہوتی ہے۔ اس کے متعلق ہمارے پُرجوش اور کھلنڈرے دماغ کچھ سوچنا ہی نہیں چاہتے تھے۔ کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اگر قید ہو گئے تو یہ وطن کے لئے بڑی قربانی ہو گی۔ رہا ہو کر آئیں گے تو لوگ ہار پہنائیں گے اور جلوس نکالیں گے۔

ڈرامہ، روس کے دہشت پسندوں اور نراجیوں کی سرگرمیوں کے متعلق تھا۔ جن کے پاس ہر قسم کے ہتھیار موجود تھے۔ امرتسر میں اُن دنوں اگر کوئی ہوائی بندوق سے بھی مسلح ہونا چاہتا تو یقیناً اُسے توپ دم کر دیا جاتا۔ کہاں ماسکو، کہاں امرتسر،

مگر میں اور حسن عباس نئے نئے باغی نہیں تھے۔ دسویں جماعت میں دنیا کا نقشہ نکال کر ہم کئی بار خشکی کے رستے روس پہنچنے کی اسکیمیں بنا چکے تھے۔ حالانکہ اُن دنوں فیروزالدین منصور بھی کامریڈ ایف۔ڈی منصور نہیں بنے تھے۔ اور کامریڈ سجّاد ظہیر شاید بنّے میاں ہی تھے۔ ہم نے امرتسر ہی کو ماسکو متصوّر کر لیا تھا۔ اور اسی کے گلی کوچوں میں مستبد اور جابر حکمرانوں کا عبرت ناک انجام دیکھنا چاہتے تھے۔ کٹڑہ جیمل سنگھ، کرموں ڈیوڑھی، یا چوک فرید میں زاریت کا تابوت گھسیٹ کر اُس میں آخری کیل ٹھونکنا چاہتے تھے۔ کیل ٹیڑھی ہو جاتی، یا ہتھوڑے کی ضرب اُس کے بجائے ہماری کسی اُنگلی کو زخمی کر دیتی۔ اس کے متعلّق سوچنے کی ضرورت ہی کیا تھی —— باری صاحب —— "اشتراکی ادیب باری" ہمارے گرو تھے۔ سوچنا اُن کا کام تھا۔ لیکن مجھے بار بار محسوس ہوتا تھا کہ یہ آدمی جس کو ہم نے اپنا رہنما بنایا ہے۔ بڑے کمزور دل کا آدمی ہے۔ ذرا سا پتّا کھڑکتا تھا تو وہ چونک پڑتے تھے۔ پر ہماری پُر خلوص گرمجوشی اُن کے متزلزل قدموں کو ہمیشہ مضبوط بنا دیتی تھی۔

۶ اب سوچا جائے تو اس زمانے کی یہ سب حرکتیں چھوٹے چھوٹے کھلونے معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن اُس وقت یہ کھلونے ہی عظیم الجثّہ اور قوی ہیکل تھے۔ ان سے پنجہ لڑانا گویا کسی دیو سے زور آزمائی کرنا تھا۔ ہمارے خلیفہ صاحب یعنی باری اگر بزدل نہ ہوتے تو یقیناً ہم چاروں (کچھ عرصے کے بعد ابو سعید قریشی بھی ہمارے تگڈّے میں شامل ہو گیا تھا) اُسی زمانے میں ان کھلونوں سے اپنا جی بہلانے کے جرم میں

پھانسی پا گئے ہوتے۔ اور امرتسر کی خونیں تاریخ میں ایسے شہیدوں کے نام کا اضافہ ہو گیا ہوتا جو اب خلوصِ دل سے کہہ سکتے ہیں کہ اُن کو اس وقت اپنے اُس جوش کے رُخ کا بھی صحیح علم نہیں تھا۔"

میں نے باری صاحب کو بزدل کہا ہے۔ اُن کی شخصیت پر کسی حملے کی غرض سے نہیں۔ اصل میں اُن کی شخصیت کی ترتیب و تدوین میں اس بزدلی کا بہت نمایاں حصہ تھا۔ اگر کسی وجہ سے اُن کے دماغی اور جسمانی نظام سے یہ کمزوری نکل جاتی تو وہ، وہ باری نہ ہوتے جو وہ تھے۔ اُن کا تشخص بالکل جدا قسم کا ہوتا۔ ہو سکتا ہے۔ وہ ہاکی کے مشہورِ عالم کھلاڑی ہوتے اور دوسرے نامور کھلاڑیوں کی طرح اُن کی عمر کسی ریاست کی نوکری میں گزرتی، یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ پرائمری اسکول کے استاد سے ترقی کرتے کرتے کسی یونیورسٹی کے ریڈر ہو جاتے۔ اور یہ بھی ممکن تھا۔ کہ وہ بھگت سنگھ کی طرح بمباز ہوتے۔ بھگت سنگھ اُنہی کے ضلع یعنی لائلپور کا رہنے والا تھا۔ اور باری صاحب اُس کو اچھی طرح جانتے تھے — یہ صرف بزدلی ہی کا باعث ہے کہ وہ ہمیشہ ادھر کے رہے، نہ اُدھر کے۔ ساری عمر جہاں رہے معلّق رہے۔ اور میں تو سمجھتا ہوں اس دوران میں اُن کے بلا کے تیز دماغ میں جو خیال بھی پیدا ہوا، بزدلی کی کھونٹی سے لٹکا رہا۔

باری صاحب بڑی بڑی نرالی باتیں اور اسکیمیں سوچتے تھے۔ ایسی جو کسی اور کے ذہن میں آسانی کے ساتھ نہیں آسکتیں۔ مگر یہ اتنی سرعت سے غائب ہو جاتی تھیں۔

کہ اُن کے آثار تک بھی باقی نہ رہتے

بعض اوقات ایسا بھی ہوتا کہ انہوں نے زندگی کے سمندر میں اچانک کسی دلچسپ ٹاپو کی موجودگی کا انکشاف کیا، اس کو سر کرنے کے لئے کیا کیا تدابیر عمل میں لائی جانی چاہئیں۔ سب کی سب سمجھا دیں۔ وہاں پہنچ کر جو نعمتیں اور گڑی ہوئی دولتیں میسر آئیں گی، اُن کی تصویر کشی بھی کر دی۔ سننے والے کمر باندھ کر اس مہم کے لئے تیار ہو گئے۔ ان میں سے کچھ رختِ سفر باندھ کر روانہ بھی ہو گئے۔ لیکن جب مڑ کے دیکھا تو باری صاحب غائب...... واپس آ کر اُن سے استفسار کرنا چاہا تو انہوں نے کسی اور دلچسپ جزیرے کا ذکر چھیڑ دیا۔ جو وہ اِس دوران میں دریافت کر چکے تھے۔

متذکرہ صدر اشتہار چسپاں کرنے کے بعد چنانچہ یہی ہوا، مَیں اور عباس دونو رات بھر گرفتار ہو جانے کی سنسنی کے ساتھ آدھے سوئے، آدھے جاگتے رہے۔ دوسرے روز نئے نویلے دولہوں کی طرح ہم تجربہ کار باری کو ڈھونڈتے رہے کہ اُن سے پوچھیں آگے کیا ہو گا، مگر وہ غائب تھے۔ دو تین جگہیں تھیں جہاں وہ جاتے تھے، مگر ان میں سے کسی ایک پر بھی وہ موجود نہیں تھے۔ پندرہ روز کے بعد اچانک نمودار ہوئے، تو انہوں نے ایک ہفتہ وار پرچہ جاری کرنے کی اسکیم سے ہمیں اپنے مخصوص انداز میں مطلع کیا۔ ”میں آپ کی طرح بیکار نہیں تھا۔ سارے انتظامات مکمل کر لئے ہیں۔ بس ڈیکلریشن داخل کرنا ہے ـــ مضمون میں آج ہی سے لکھنا شروع کر دوں گا۔“

امرتسر کی دیواروں پر زاریت کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکنے والے اشتہار کچھ

تو اُکھڑ گئے۔ اور کچھ قوتِ مردمی کی دواؤں کے پوسٹروں تلے دب گئے اور ہمارا جوش اُدھر سے منتقل ہو کر ہفتہ وار پرچے کی ابتدائی کارروائیوں میں داخل ہو گیا۔

"ویرا" ناقص کتابت اور واہیات طباعت کے باعث میرے گھر میں مقفل پڑی رہی۔ لیکن "خلق" کے صوری حُسن کے لئے ہم نے اپنی پہلی فروگذاشتوں سے فائدہ اُٹھایا۔ جب اس پرچے کا پہلا شمارہ ثنائی برقی پریس سے میں اور باری صاحب کندھوں پر اُٹھا کر گھر لائے تو اس کی گوارا کتابت و طباعت سے ہم بہت مطمئن تھے۔

باری صاحب کے ایک کرم فرما تھے۔ میں اُن کا نام بھول گیا ہوں، لیکن اتنا یاد ہے کہ وہ سیاہ داڑھی والے ایک صاحب تھے جو غالباً چمڑے کے سوداگر تھے۔ "خلق" کے اجراء میں مالی ہاتھ اُن کا تھا۔ وہ اور بھی سرمایہ لگانے کے لئے تیار تھے۔ مگر باری صاحب میدان چھوڑ کے بھاگ گئے۔

پہلے شمارے میں سرورق پر اُن کا ایک مضمون تھا "ہیگل سے لے کر کارل مارکس تک"۔ ایک مختصر سا خاکہ تھا۔ اشتراکی فلسفے کے ارتقا کے بارے میں جو میری اور حسن عباس کی فہم سے بالاتر تھا۔ اصل میں ہم ہیگل سے واقف تھے نہ کارل مارکس سے۔ آخر الذکر کا نام باری صاحب سے کئی مرتبہ سنا تھا جس سے ہم کو اتنا معلوم تھا کہ وہ مزدوروں کا بہت بڑا حامی تھا۔ اُس کا فلسفہ کیا تھا اور اُس کے ڈانڈے حکیم ہیگل سے کہاں اور کیونکر ملتے تھے۔ ایمان کی بات ہے۔ اِس کے متعلق ہماری معلومات صفر تھیں۔ اپنے افسانوں کے قارئین کی دلچسپی کے لئے ایک بات بتانا چاہتا ہوں۔ کہ

میرا سب سے پہلا طبعزاد افسانہ "تماشا" کے عنوان سے "خلق" کے اسی شمارے میں شائع ہوا تھا۔ میں نے اس پر اپنا نام نہیں دیا تھا۔ اس ڈر سے کہ لوگ مذاق اڑائیں گے اُن دنوں میرے جاننے والے از راہِ تمسخر میری سقیم تحریروں پر خوب ہنسا کرتے تھے۔ لیکن عجیب بات ہے کہ باری صاحب نے جن کو میری محدود علمیت کا پتہ تھا۔ میری ہمیشہ حوصلہ افزائی کی۔ یہاں تک کہ مجھے میری اغلاط سے بھی کبھی روشناس نہ کیا۔ وہ کہا کرتے تھے۔ "سب ٹھیک ہے۔"

بات میں سے بات نکل آتی ہے۔ مجھے باری صاحب کے میدان چھوڑ کر بھاگ جانے کے متعلق کچھ کہنا تھا۔ "خلق" کا پہلا شمارہ شائع ہوا، تو چند روز بڑے جوش و خروش میں گزرے۔ میں اور عباس یوں محسوس کرتے تھے، جیسے ہم سے کوئی بڑا کارنامہ سرزد ہو گیا ہے۔ کٹڑہ جیمل سنگھ اور ہال بازار میں ہم ایک نئی شان سے چلتے تھے۔ لیکن آہستہ آہستہ ہمیں محسوس ہوا کہ امرتسر کی نظروں میں ہم ویسے کے ویسے آوارہ گرد ہیں۔ پان سگرٹ والے بدستور اپنے پیسوں کا تقاضا کرتے اور خاندان کے بزرگ برابر اپنا وہی فیصلہ سناتے تھے کہ ہمارے لچھن اچھے نہیں ۔۔۔ لچھن واقعی کچھ اچھے نہیں تھے اس لئے کہ خفیہ پولیس نے پوچھ گچھ شروع کر دی اور اسی سلسلے میں کوچہ وکیلاں تک پہنچ گئی۔ میرے بہنوئی خواجہ عبدالحمید صاحب اُن دنوں نئے نئے ریٹائر ہوئے تھے۔ آپ ایک عرصے تک پھلور کے پولیس اسکول میں اُستاد رہ چکے تھے۔ اس لئے پنجاب پولیس کے قریب قریب تمام آدمیوں کو جانتے تھے۔

خفیہ پولیس کے سپاہی جب باری صاحب کا اتا پتا معلوم کرنے کے لئے کوچہ وکیلاں میں پہنچے تو ان کی خواجہ صاحب سے مڈبھیڑ ہوئی۔ وہ باری صاحب کا وہ خطرناک مضمون "ہیگل سے کارل مارکس تک" پڑھ چکے تھے۔ اس کے علاوہ باری صاحب کو بھی اچھی طرح جانتے تھے اور تاریخ سے جو اُن کو دلچسپی تھی۔ اُس کی قدر کرتے تھے۔ اُن کا اندازِ بیان جو خطیبانہ ہوا کرتا تھا انہیں پسند تھا۔ اس لئے انہوں نے خفیہ پولیس کے سپاہیوں سے کہا "جاؤ، کوئی اور کام کرو۔ ہیگل اور کارل مارکس تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گا — غریب باری بھی ابھی تک ان کے فلسفے کو اچھی طرح نہیں سمجھا"۔

خواجہ صاحب نے جب اُن کو یقین دلایا کہ مضمون میں کوئی بغاوت انگیز چیز نہیں جس سے سرکارِ برطانیہ کا تختہ اُلٹنے کا اندیشہ ہو۔ تو وہ چلے گئے۔ لیکن جب باری صاحب کو اس کا پتہ چلا کہ حکومت کی مشینری حرکت میں آگئی ہے تو انھوں نے "خلق" کا صرف دوسرا پرچہ نکالا اور اسے میرے پاس چھوڑ کر کہیں غائب ہو گئے اور بہت دیر تک معلوم نہیں کہاں کہاں گھومتے رہے۔ مجھے یاد ہے کہ اُن کا ایک کارڈ ملتان سے آیا تھا۔ جس میں کچھ اس قسم کا مضمون تھا۔ "ملتان کی رسد گاہوں میں اپنے ستاروں کا مطالعہ کر رہا ہوں"۔

یہ عجیب بات ہے کہ گردش کے دوران میں جب کبھی اُن کا خط کسی شہر سے آتا تھا تو اُس میں یہ اطلاع انہی الفاظ میں ضرور ہوتی کہ وہ اس کی رسد گاہوں میں

اپنے ستاروں یا نجوم کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ یہ مطالعہ، میرا خیال ہے۔ وہ ہر اُس گلی، ہر اُس کوچے کی رسد گاہ میں کرتے رہے جہاں انہوں نے کچھ عرصے کے لئے قیام کیا قبر کی تاریک رسد گاہوں میں بھی وہ یقیناً ان ہی ستاروں کے مطالعے میں مصروف ہوں گے۔ مگر افسوس ہے کہ وہ یہاں سے مجھے کوئی پوسٹ کارڈ نہیں بھیج سکتے۔

مرحوم کو پوسٹ کارڈ بہت پسند تھے۔ اس لئے کہ لفافوں کے مقابلے میں ان پہ خرچ کم ہوتا ہے۔ خطوں کا جواب دینے کے معاملے میں وہ بہت سست تھے۔ مجھے یاد ہے۔ ایک بار میں نے انہیں امرتسر سے پے در پے کئی خط لکھے۔ جب کوئی جواب نہ آیا۔ تو میں نے پانچ پانچ پیسے کے دو ٹکٹ اُن کو روانہ کئے اور یہ تاکید کی کہ وہ اب جواب ضرور دیں۔ اُن کا جواب آیا، مگر پوسٹ کارڈ پر، لکھا تھا، تمہارے بھیجے ہوئے ٹکٹ میں نے بیچ ڈالے۔ ایک کارڈ خرید کر تمہیں لکھ رہا ہوں کہ تمہارے سب خط مجھے مل چکے ہیں۔

مجھے بہت غصہ آیا، فوراً لاہور پہنچا، ارادہ تھا کہ ان کی طبیعت صاف کر دوں گا، مگر جب ہم عرب ہوٹل میں بیٹھے اور میں نے اُن کی ذلیل حرکت کے متعلق بات کرنا چاہی تو انہوں نے لاہور کی رسد گاہوں میں میرے ستاروں کا مطالعہ شروع کر دیا۔ اور آخر میں فیصلہ یہ ہوا "تم گھر کے معاملات ٹھیک ٹھاک کر کے فوراً لاہور چلے آؤ اور کسی اخبار میں ملازمت کر لو۔"

ایسے کئی موقعے آئے کہ میں نے بڑی سنجیدگی سے باری صاحب پر اپنی خفگی و

ناراضی کا اظہار کیا اور وہ بھی اس ارادے کے ساتھ کہ اُن کی میری کُشتی ہو جائے، مگر اُن کی باتیں کچھ ایسی تھیں کہ مجھے غیر مسلح کر دیتی تھیں۔ موٹا موٹا گول چہرہ، سیاہی مائل گندمی رنگ، بہت بڑا سر، قد متوسط، کالے کالے ہونٹ، مسوڑھے بھی کالے، مگر جب اُن کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوتی تھی تو آس پاس کے تمام خط و خال اپنی سیاہ قبا اتار پھینکتے۔ جو عدالتوں کی سی خشک سنجیدگی اور متانت کا باعث ہوتی تھی۔ صرف ان مسکراتے ہوئے لمحات کی رسد گاہوں میں وہ اپنے ستاروں کا مطالعہ نہیں کرتے تھے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ صرف انہی لمحات میں اُن کے مسلسل مطالعے سے اُکتائے ہوئے یہ ستارے بھی تھوڑی دیر کے لئے مسکرا لیتے تھے۔

باری صاحب بزدل تھے۔ خدا کی قسم بہت بزدل تھے۔ زیادہ کھا لیتے تو ڈرتے رہتے تھے کہ اُن کی توند نکل آئے گی۔ حالانکہ فاقوں کے زمانے میں بھی اُن کے جسم کا یہ حصہ بڑھتا رہا۔ زیادہ تیز بھاگتے نہیں تھے کہ اُن کے دل پر اس کا اثر پڑے گا۔ حالانکہ ان کے جسم کے اسی رئیس عضو نے اُن کا ساتھ چھوڑا۔ بڑی بڑی سرخ بغاوتوں کے نیلے نقشے تیار کرتے تھے، اور پٹاخے کی آواز سن کر زرد ہو جاتے تھے۔ اُن کو ایک لڑکی سے محبت تھی لیکن ماں باپ کسی اور سے اُن کا رشتہ پکا کر چکے تھے۔ جب اُن کو معلوم ہوا کہ وہ عشق فرما رہے ہیں۔ تو انھوں نے شادی کی تاریخ پکّی کر دی۔ باری صاحب اُن دنوں میرے ساتھ رہتے تھے۔ جب تاریخ نزدیک آئی تو غائب ہو گئے۔ لیکن بکرے کی ماں زیادہ دیر تک خیر نہ منا سکی۔ اُن کی ہونے والی دولہن نے ایک بڑا معر کے

کا خط لکھا جس میں یہ دھمکی درج تھی کہ اگر انھوں نے اس سے شادی نہ کی تو وہ اُن کے پیٹ میں چھری بھونک دے گی ـــــ باری صاحب ڈر گئے اور شادی کر لی۔

برما کی رسد گاہوں میں اپنے ستاروں کا مطالعہ کرنے کے لیے پہنچے تو وہاں ایک برمی لڑکی کا ستارہ اُن کے ستاروں سے ٹکرا کر اُن میں اُلجھ گیا۔ آپ نے اپنی بیوی کو وہاں بُلا لیا۔ لیکن ستاروں کا الجھاؤ بدستور قائم رہا۔ آخر جنگ چھڑنے پر اُن کو ایک موقعہ ملا اور وہاں سے بھاگ آئے۔

بڑے رن چھوڑ قسم کے آدمی تھے ـــــ اقبال کی خودی کا فلسفہ ان کو اس قدر پسند آگیا تھا کہ اس کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔ مگر سرویوں میں معلوم ہوا کہ یہ کام نہیں دے سکتا۔ اقبال کے ارشاد کے مطابق انھوں نے اپنی خودی کو مقدور بھر اونچا کرنے کی کوشش کی۔ مگر باری تعالیٰ نے اُن سے کبھی یہ پوچھنے کی تکلیف گوارا نہ کی کہ اے باری بتا تیری رضا کیا ہے۔ آخر ایک دن وہ خود ہی اقبال سے پوچھنے گئے کہ یہ گڑبڑ کیا ہے۔

اُن دنوں باری صاحب کی اپنے اخبار کے دفتر میں رات پالی ہوتی تھی۔ آخری کاپی پریس بھیج کر جب فارغ ہوتے تو علامہ اقبال مرحوم کی قبر پر چلے جاتے اور دیر تک اُن کی رُوح سے فلسفۂ خودی پر بات چیت کرتے رہتے۔ بہت تنگ حال تھے۔ تنخواہ کبھی کبھی ملتی تھی اور وہ بھی قسطوں کی صورت میں۔ اخباروں کے مالک یہ سمجھتے تھے کہ ان کے عملے کے آدمی بارہ بروار حیوان ہیں۔ جس کو جو کچھ دے دیا جائے وہی بہت ہوتا ہے۔ باری صاحب حسّاس آدمی تھے۔ قرض لیتے تھے۔ مگر بوجھ محسوس

کرتے تھے۔ خودی کو وہ کافی بلندی پر لے گئے تھے۔ مگر اب اس میں اور زیادہ بلندی تک پہنچنے کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔ چنانچہ بھنا کر علامہ کی قبر پر گئے اور ان کی روح سے بڑے باغیانہ سوال کرنے شروع کر دیئے۔ میرا خیال ہے اگر علامہ زندہ ہوتے تو انھیں ان سوالوں کا جواب دیتے وقت بڑی مشکل کا سامنا کرنا پڑتا۔ بغاوت کا یہ جوش بھی ان کے دل و دماغ میں ٹھنڈا ہو گیا۔ اگر بزدل نہ ہوتے تو میرا خیال ہے کہ عام انسانی زندگی پر اقبال کے فلسفۂ خودی کے تطبیق و اطلاق کے مسئلے پر یقیناً بصیرت افروز روشنی ڈال سکتے۔ مگر وہ تمام کونپلیں جو ان کے حساس دل و دماغ کی شاخوں سے جوش کے باعث پھوٹی تھیں، اس بزدلی کے باعث مرجھا گئیں۔ معلوم نہیں، ان کے دوسرے دوست مجھ سے اتفاق کریں یا نہ کریں لیکن میں سمجھتا ہوں۔ اگر وہ ثابت قدم ہوتے اور گردوپیش کی مخالف قوتوں کا مقابلہ ڈٹ کر کرتے تو ان کے قلم سے "انقلابِ فرانس" کے بجائے "انقلابِ ہندوستان" نکلتی اور یہ بھی ممکن ہے کہ اٹھارہ سو ستاون کا تانتیا ٹوپی ان کے قالب میں دوسرا جنم لیتا۔

اقبال کی طرح وہ بھی خدا سے یہ کہتے رہے۔ "کارِ جہاں دراز ہے، اب میرا انتظار کر" ـــــ مگر اس وقت جب کہ ان کو خدا کی طرف سے کوئی بلاوا نہیں آتا تھا۔ لیکن جب بلاوا آیا تو وہ کارِ جہاں دراز ہے، اب میرا انتظار کر نہ کہہ سکے، اور اقبال کے مانند چل دیئے۔ وہ کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑانے کے لئے تیار کرتے رہتے۔ مگر جب اسے پالی میں اتارنے کا مرحلہ آتا تو پنجرہ وہیں چھوڑ کے بھاگ جاتے

اس غریب کو دو دو چونچیں لینے اور شکست کھانے کا بھی موقعہ نہ ملتا۔

باری صاحب خیالی پلاؤ پکانے کے معاملے میں اوّل درجے کے بکاول تھے۔ ایسے ایسے لذیذ پلاؤ اور بریانیاں تیار کرتے تھے کہ ان کا ذائقہ دیر تک دوسروں کے دل و دماغ سے محو نہیں ہوتا تھا۔ مجھے یاد ہے جب "خلق" دو اشاعتوں کے بعد انہوں نے بند کر دیا اور چند اخباروں میں کام کرنے کے بعد انہیں کچھ حاصل وصول نہ ہوا تو انھوں نے ایک ہفتہ وار اخبار "موچنا" نکالنے کا ارادہ کیا۔ اس کی سرخیاں کیسی ہوں گی۔ مضامین کس نوعیت کے ہوں گے۔ اس کے متعلق انھوں نے لفظوں کے ذریعے سے ایسی تصویر کشی کی کہ اس مجوّزہ پرچے کے کئی شمارے آنکھوں کے سامنے سے گذر گئے اور دیر تک فضائے آسمانی سے ہم پر جو برس رہے تھے، موچنوں کی بارش ہوتی رہی۔ ایک بار اور صحافت کے پیشے سے تنگ آئے تو جنگ کا یہ رستہ نکالا کہ وہ اسے چھوڑ چھاڑ کے چارہ کاٹنے کی مشین لگالیں گے اور مزے کی زندگی بسر کریں گے اس مزے کی زندگی کو انھوں نے تصوّر کی آنکھوں سے دیکھا اور اپنے مخصوص انداز میں بیان کرنا شروع کر دیا جو میرے ذہن پر مرتسم ہو گیا۔ چنانچہ بہت بعد میں جب کہ میں آل انڈیا ریڈیو دہلی میں ملازم تھا۔ میں نے ایک ریڈیائی ڈرامہ "جرنلسٹ" کے عنوان سے لکھا۔ اس کے مرکزی کردار کا نام باری ہی تھا۔ جب یہ نشر ہوا تو ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ ہندوستان کے قریب قریب ہر اردو اخبار نے اس کے خلاف نوٹ لکھے۔ اس لئے کہ اس سے اخبار کے مالکوں کی توہین ہوتی تھی۔ لیکن ٹریجڈی یہ

تھی کہ ان صحافیوں سے اس کے خلاف لکھوایا گیا جن کی ناگفتہ بہ حالت کی عکاسی اس

میں کی گئی تھی۔

یہاں پر اس ڈرامے کے چند اقتباس نقل کرنے شاید بے محل نہیں ہوں گے۔ جرنلسٹ باری صحافت چھوڑ کر چارہ کاٹنے کی مشین لگا لیتا ہے۔ اور بہت خوش ہے۔ اس کی خود کلامی ملاحظہ ہو۔

باری: روز ڈیڑھ دو روپے کی آمدن ہو جاتی ہے۔ سارا دن یہاں دکان پر گذارتا ہوں۔ شام کو ٹھیکے پر چلا جاتا ہوں اور گپیں ہانک کر پھر ٹہلتا ٹہلتا یہاں آجاتا ہوں ——— خبریں ترجمہ کرنا پڑتی ہیں نہ کاپی جوڑنا پڑتی ہے ٹیلیفون کی بک بک نہ مراسلوں کی بکواس۔ کاتب نہ رائٹر کی سروس۔ واللہ کیا گر بتایا ہے میرے دوست نے۔ سردیاں آئیں گی۔ تو اندر گھاس کے پاس چارپائی بچھا لیا کروں گا ——— کتنی اچھی زندگی ہے ——— میری تو یہ مرضی ہے کہ سب ایڈیٹروں کو جو اخباروں میں اپنی زندگی تباہ کر رہے ہیں، یہ گر بتا دوں۔ اپنے اپنے شہر میں ایسی مشین لگوا لیں اور مجھے دعائیں دیں۔"

اس کی زندگی بڑی ہموار گذر رہی تھی کہ اچانک دوسری جنگِ عظیم چھڑ گئی۔ اطلاع باری کو شراب خانے میں ملتی ہے۔ اور اس کے دل و دماغ میں سویا ہوا صحافی جاگ پڑتا ہے۔ اس کو بہت کوفت ہوتی ہے۔ جب وہ آس پاس بیٹھے ہوئے شرابیوں کی گفتگو سنتا ہے۔ جو بیروں سے متعلق ہے۔ تنگ آکر وہ چلا اٹھتا ہے۔

باری: خاموش۔ یہ تم نے کیا بکواس شروع کر دی ہے۔ تم لوگ واقعی بالکل جاہل ہو۔ یوروپ میں ایک ایسی جنگ شروع ہوئی ہے۔ جو کئی ملکوں کو دنیا کے نقشے سے ہمیشہ کے لئے مٹا دے گی۔ لاکھوں کروڑوں آدمی ہلاک ہو جائیں گے۔ دنیا میں ایک طوفان مچ جائے گا۔ اور تم لوگ بٹیروں کی لڑائی کا حال بیان کر رہے ہو۔ آخر تمہیں کیا ہو گیا ہے؟

ایک شرابی: کیا بکتا ہے یہ۔

دوسرا شرابی: (قہقہہ لگا کر) میں تو کچھ نہ سمجھا ــــ (باری سے) باری ــــ یہ آج تو کیسی باتیں لے بیٹھا ہے۔

پہلا شرابی: زیادہ پی گیا ہے۔

دوسرا شرابی: بڑی نامراد چیز ہے۔

باری: تم بکواس کرتے ہو۔ میں بالکل ہوش میں ہوں۔ تم بے ہوش ہو رہے ہو۔ جو کچھ میں اس وقت سوچ رہا ہوں، تمہارا فلاک بھی نہیں سوچ سکتا۔

پہلا شرابی: ارے واہ رے میرے مولوی۔

باری: تم میری باتوں کا مضحکہ نہ اڑاؤ (ہنستا ہے) مگر یہ تمہارا قصور نہیں، میرا اپنا ہے۔ میں نے اب تک اپنی اصلیت تم سے چھپائے رکھی ہے ــــ تم نہیں جانتے میں کون ہوں اور سیاسی دنیا میں میری کس قدر اہمیت ہے۔

پہلا شرابی: میاں تم رستم ہو، لے بس، اب جانے دو۔ کوئی اور بات کرو
باری: تمہیں جب تک میری اصل شخصیت معلوم نہیں ہو گی، تم میرا مضحکہ
اڑاتے رہو گے۔ جانتے ہو میں کون ہوں۔ میرا نام عبدالباری ہے ——
مولانا عبدالباری روزنامہ "خلق" کا ایڈیٹر۔

اس آخری جملے میں جو المیہ پوشیدہ ہے۔ وہ کسی تبصرے کا محتاج نہیں۔ باری مرحوم نے بالآخر صحافت چھوڑ دی تھی اور چارہ کاٹنے کی مشین لگالی تھی۔ گویہ مشین ان کی نہیں سرکارِ برطانیہ کی ملکیت تھی (وہ آخری دنوں میں برٹش انفورمیشن ڈیپارٹمنٹ میں ملازم ہو گئے تھے) لوگ اکثر ان کا مضحکہ اڑاتے تھے۔ اس لئے کہ ساری عمر انگریز کو گالیاں دینے کے بعد انھوں نے اسی کی نوکری قبول کر لی تھی۔ لیکن وہ یقیناً دل ہی دل میں یہ ضرور پکارتے رہے ہوں گے۔ "تمھیں جب تک میری اصل شخصیت معلوم نہیں ہو گی۔ تم میرا مضحکہ اڑاتے رہو گے —— مگر یہ تمہارا قصور نہیں میرا اپنا ہے —— میں نے اب تک اپنی اصلیت تم سے چھپائے رکھی!"

یہ میری اپنی تاویل و تعبیر ہے کہ باری صاحب نے اپنی زندگی میں ہمیشہ فرار کے راستے اختیار کئے اور ان راستوں پر بھی انھوں نے ہمیشہ پھونک پھونک کر قدم رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی رُوح لوگوں کی نگاہوں سے پوشیدہ رہی اور اس میں قصور سراسر ان کا اپنا تھا۔ وہ بڑی بڑی چٹانوں سے ٹکر لینے کے لئے آگے بڑھتے تھے۔ لیکن اُن کا رُخ کسی اور طرف ہو جاتا تھا۔ اور یہ سب کچھ ان کے اپنے زعم میں

ہوتا تھا۔

اس ڈرامے میں باری ایک جگہ اپنی رو میں یہ کہتا ہے۔

باری: پہلی جنگ سے لے کر اس جنگ کے آغاز تک کے واقعات کو اگر ہم پیشِ نظر رکھیں تو یہ معلوم کرکے بڑا دکھ ہوتا ہے۔ کہ مہذّب دنیا ذلت کی دلدل میں دھنس گئی ہے۔ سائنس کی ترقی جاری رہی ہے لیکن اخلاقی ذمہ داری کا احساس کم ہوتا چلا گیا ہے۔ نوعِ انسانی جہاں تھی وہیں کی وہیں کھڑی ہے۔ نسلی امتیاز اور مذہبی عداوت بڑھتی گئی ہے۔ نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔ پہلے جنگ نما صلح پھر صلح نما جنگ ـــــ میں پوچھتا ہوں آخر یہ ہماری مہذّب دنیا کدھر جا رہی ہے۔ کیا ہم پھر جہالت کے زمانے میں جا رہے ہیں۔ کیا ایک بار پھر انسان کا خون پانی سے بھی ارزاں بکے گا ـــــ کیا پھر ہمارا گوشت پوست دوسری اجناس کی طرح بازاروں میں بیچا جائے گا ـــــ؟ ـــــ کیا ہونے والا ہے؟ کوئی مجھے بتائے کیا ہونے والا ہے۔ بے اصولی نے سینکڑوں اصول اور تفرقہ پردازی نے ہزاروں جماعتیں پیدا کر دی ہیں۔ انسان انسان کے خلاف۔ ملت، ملت سے نبرد آزما ـــــ ملک ملک سے ستیزہ کار ـــــ یہ ہے انیسویں صدی کی داستان۔"

یہ خیالات برٹرینڈ رسل کے ہیں جو میں نے باری صاحب کے مخصوص خطیبانہ انداز میں مکالمے کی شکل میں تبدیل کر دیئے تھے۔ باری صاحب کا دماغ برٹرینڈ رسل کے دماغ سے کم نہیں تھا۔ لیکن وہ ایک ایسے ملک میں پیدا ہوئے تھے۔ جس کے اخباروں کے مالکوں سے تنگ آ کر انھیں کئی بار یہ کہنا پڑا تھا۔

باری: آپ قوم کی خدمت کرتے ہیں۔ میں قوم کی اور اخبار کی خدمت کرتا ہوں لیکن اس خدمت کا معاوضہ مجھے وقت پر کبھی نہیں ملتا۔ بلکہ یوں کہیئے کہ ملتا ہی نہیں۔ چار مہینے میں آپ نے مجھے صرف سولہ روپے دیئے ہیں۔ خدا کا خوف کیجئے۔ میں انسان ہوں پتھر نہیں ہوں۔ مجھے بھوک بھی لگتی ہے کبھی کبھی مٹھائی کھانے کو بھی جی چاہتا ہے۔ مجھے آپ نے اس اخبار کا اڈیٹر بنایا تھا۔ سنیاسی یا سادھو نہیں بنایا تھا۔ جو میں نے دنیا تیاگ دی ہو۔"

چار ماہ کے عرصے میں صرف سولہ روپے! ممکن ہے یہ مبالغہ آرائی ہو۔ مگر یہ واقعہ ہے۔ کہ جب وہ روزنامہ "احسان" میں کام کرتے تھے تو انھیں دفتر سے ردی چرا کر اپنے اخراجات پورے کرنے پڑے تھے۔ ان دنوں راجہ مہدی علی خاں بھی وہیں ملازم تھے۔ باری صاحب آدمی بڑے مخلص تھے۔ جب انھوں نے دیکھا کہ ردی بیچ کر کچھ نہ کچھ وصول ہو جاتا ہے۔ تو انھوں نے راجہ کو بھی اس وسیلے سے آگاہ کر دیا باری صاحب طبعاً اعتدال پسند اور محتاط تھے، لیکن راجہ دھڑلّے کا آدمی تھا۔ اس نے ایک دو بار تو صرف چند بنڈل چرائے۔ اس کے بعد اس نے باری صاحب سے

کہا۔ "یہ خوردہ فروشی غلط ہے مولانا ——— میں کل دو بوریاں لاؤں گا۔ انھیں بھر کر لے جائیں گے !"

باری صاحب ڈر گئے، لیکن راجہ صاحب نے ان کو اس بڑی ڈکیتی پر آمادہ کر لیا۔ باری صاحب پہرہ دیتے رہے۔ اور راجہ بوریوں میں ردّی بھرتا رہا۔ مزدور بلوائے گئے اور انھیں اٹھوا کر اپنے ساتھ لے گئے۔ راجہ کا بیان ہے کہ اس دن دونوں نے سنیما دیکھا تھا۔

راجہ مہدی علی خاں سے روایت ہے کہ ان دونوں کو ایک دفعہ بازاروں میں بھیک مانگنی بھی پڑی تھی۔ اسکیم باری صاحب نے بنائی تھی۔ لوگوں کے آگے دستِ سوال کیوں کر دراز کیا جائے گا، مسکین اور قابلِ رحم شکل و صورت کیسے بنائی جائے گی۔ اپنا دکھڑا کس انداز سے اور کن الفاظ میں سنایا جائے گا۔ یہ سب باری صاحب نے خود سوچا اور مرتب کیا تھا۔ لیکن جب جھولی پھیلانے کا موقعہ آیا تو باری صاحب جھینپ گئے۔ اور بمشکل دو ڈھائی آنے جمع کر سکے۔ اس کے برعکس راجہ نے پونے تین روپے اکٹھے کیے۔

یہاں راجہ کے بیان کیے ہوئے ایک لطیفے کا ذکر خالی از دلچسپی نہ ہو گا۔ غالباً انارکلی میں راجہ بھیک مانگ رہا تھا۔ سامنے سے ایک گوجر سر پہ دودھ کا بہت بڑا دلٹوہا اٹھائے چلا آ رہا تھا۔ راجہ نے جو باری صاحب سے انسانی نفسیات پر کچھ لیکچر سن چکا تھا، اندازہ لگایا کہ اسامی مالدار ہے۔ اگر میں اُس سے اپنی حالتِ زار

بیان کروں گا تو اس کا دل ضرور پسیج جائے گا۔ راجہ کا خیال تھا کہ اس سے کم از کم ایک روپیہ تو ضرور مل جائے گا۔ چنانچہ وہ آگے بڑھا۔ باری صاحب نے جو کچھ بتایا تھا بڑے خلوص کے ساتھ گوجر کو سنایا۔ اس نے راجہ سے کہا۔ "ذرا ہاتھ دینا میرے ولٹوہے کو" راجہ نے کافی زور صرف کرکے اس کے سر کا بوجھ اتارنے میں مدد دی۔ جب ولٹوہا اُتر گیا تو گوجر نے اپنے تہمد کا ڈب کھولا۔ اس میں کئی نوٹ اور بہت سا کریانہ تھا۔ لیکن اُس نے ان میں سے صرف ایک پیسہ نکالا اور راجہ کی ہتھیلی پہ رکھ دیا۔ اور ستم بالائے ستم اس سے یہ کہا۔ "لو، جوان اب ولٹوہا رکھوا دو میرے سر پہ"

اور یہ تو میں بھی جانتا ہوں کہ باری صاحب اور حسن عباس مفلسی کے زمانے میں پیٹ میں کچھ ڈالنے کے لئے اُس پھلوں کی دکان سے رات کے وقت اکثر کیلے اور سیب چرایا کرتے تھے۔ جس کے اُوپر انھوں نے ایک کمرہ کرائے پہ لے رکھا تھا۔ اس میں بجلی کا کنکشن نہیں تھا۔ مگر باری صاحب نے حسن عباس کو اپنا "بجلی گھر" بنانے کی ترکیب سمجھا دی تھی۔ چنانچہ وہ ایک زمانے تک میونسپلٹی کے تار سے اپنا تار جوڑ کر یہ کمرہ روشن کرتے رہے۔

مجھے ایک اور لطیفہ یاد آگیا۔ جو پرانی انارکلی کے اسی کمرے سے متعلق ہے جہاں باری صاحب اور حسن عباس اکٹھے رہتے تھے۔ یہ اُس زمانے کی بات ہے۔ جب میں غالباً سات برس کے بعد بمبئی سے آیا تھا۔ اس دوران میں معمولی خط و کتابت رہی تھی۔ حسن عباس مجھے امرتسر کے اسٹیشن ہی پر مل گیا تھا۔ ان دنوں شراب پر کوئی پابندی

نہیں تھی۔ اسپنسر والے ربڑ تاڑ گاڑیوں پر اسے عام بیچتے پھرتے تھے۔ عبّاس سے بڑی دیر کے بعد ملاقات ہوئی تھی، چنانچہ اس خوشی میں ہم دونوں نے فیصلہ کیا۔ کہ صبح ہی سے شروع کر دینی چاہیئے تاکہ جذبات گھٹے گھٹے نہ رہیں۔ جو بات کی جائے کھل کے کی جائے۔ یہ فیصلہ ہوتے ہی ہم نے اپنے دل کی چابیاں 'جونی واکر' کے حوالے کر دیں۔

خیال تھا کہ باری صاحب اسٹیشن پر موجود ہوں گے، مگر بقول حسن عباس، وہ حسبِ معمول "ذلیل الدّہر" نکلے۔ تانگہ لے کر ہم نے انہیں اِدھر اُدھر تلاش کیا اور آخر ڈھونڈ نکالا۔ وہ اس لئے چھپ گئے تھے کہ انہوں نے میری آمد کے ساتھ ہی شراب کا سیلاب دیکھ لیا تھا اور بند باندھنے میں مصروف تھے۔ میں نے اور عبّاس نے انھیں بہت لعن طعن کی اور پرانی صحبتوں کا حوالہ دے کر ان کے عارضی زہد کی خوب مٹی پلید کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ایک دم خُم کے خُم انڈھیلنے پر آمادہ ہو گئے۔

معلوم نہیں ان دنوں ابوسعید قریشی بی۔اے کا قلعہ سر کرنے کے لئے اپنے آخری حملے کی تیاری کر رہا تھا یا اس قلعے کو فتح کرنے کے بعد ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا تھا۔ بہر حال وہ ہمیں کسی نہ کسی طرح مل گیا ـــــ اس میں اور پرانے سعید قریشی کے باپ میں کوئی فرق نہیں تھا۔ اسی طرح وہ اب بھی عمرِ خیام کی رباعیاں خریدتا تھا اور نہر کے کنارے، چاندنی رات اور گل عذار معشوق کے خواب دیکھتا تھا۔ باری صاحب نے تجویز پیش کی کہ اس جرم کی سزا اس کو یہ دی جائے کہ وہ ایک عدد جونی واکر خریدے۔ مجرم نے یہ سزا قبول کی اور فوراً بھگت لی۔

پرانی انارکلی کے اس تاریخی کمرے میں ہم سب جمع تھے۔ میں، باری صاحب، ابوسعید قریشی، حسن عباس اور عبداللہ ملک (جو آجکل زیادہ خوب صورت ہے) تھوڑے عرصے کے لئے راجندر سنگھ بیدی بھی آیا۔

باری صاحب حسب توفیق صفائی پسند تھے۔ اپنے میز کی جھاڑ پونچھ اور اس کے بناؤ سنگھار میں کافی وقت صرف کرتے تھے لیکن اس معاملے میں وہ بالکل بچوں کے مانند تھے۔ ناخن کاٹنے کی چھوٹی سی قینچی ہے، وہ بھی اپنے قلمدان کے ساتھ سجاوٹ کے طور پہ وہاں رکھ دی ہے، ساتھ ہی شیو کرنے کا استرا پڑا ہے۔ کہیں سے گول بٹہ مل گیا ہے تو اسے آپ نے پیپر ویٹ بنا لیا ہے۔ کتابوں کے اوپر کاغذ کے گرد پوش چڑھے ہوئے ہیں۔ ان کے اوپر سوئی دھاگا رکھا ہے۔ ایک فائل ہے اس میں مختلف رسالوں سے کاٹی ہوئی تصویریں جمع ہیں ——— باری صاحب کو قینچی استعمال کرنے کا بہت شوق تھا، معلوم نہیں کیوں۔ ہو سکتا ہے اس لئے کہ وہ اخبار کی کاپی خود ہی جوڑا کرتے تھے۔ یہ کام نیوز ایڈیٹروں کے فرائض میں اب بھی داخل ہے لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ اخبار کی کاپی جوڑنے سے پہلے ان کو اس اوزار سے کیوں اتنی رغبت تھی مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ امرتسر میں روزنامہ "مساوات" کے دفتر میں وہ انگلیوں میں قینچی پھنسا کر جب کاپی جوڑنے بیٹھتے تھے تو ایسا لگتا تھا کہ وہ کوئی بہت دل پسند کام شروع کرنے والے ہیں۔

ان کا میز عام طور پہ دیوار کے ساتھ لگا ہوتا تھا۔ اس طرح کہ جب باری صاحب

لکھنے بیٹھیں تو دیوار ان کے سامنے ہو۔ لکھتے وقت کوئی روک ان کی آنکھوں کے سامنے ہونی ضروری تھی۔ مجھے یاد ہے، ایک بار میں نے گھر میں اپنے میز کا رُخ بدل دیا۔ باری صاحب کو کچھ لکھنا تھا۔ کرسی پر بیٹھے تو بے چینی محسوس کرنے لگے میں نے وجہ دریافت کی تو کہا، "جب تک میری آنکھوں کے سامنے کوئی روک نہ ہو، میں نہیں لکھ سکتا۔ اور یہ کہہ کر ورلڈ اٹلس اٹھائی اور اپنے سامنے رکھ لی۔

بات کہاں سے کہاں پہنچ رہی ہے، لیکن میں مجبور ہوں، پرانی انارکلی کے کمرے سے نکل کر خدا معلوم کہاں جا رہا ہوں۔ لیکن آپ مجھے معاف کر دیجئے۔ جو بات ذہن میں ابھرتی ہے، میں اُسی وقت قلم بند کر دیتا ہوں کہ بھول نہ جاؤں ــــ ابھی ابھی جب میں نے تصوّر میں انھیں لکھتے دیکھا تو وہ اپنے دانت رگڑ رہے تھے۔ یہ باری صاحب کی عادت تھی۔ لکھنے کے دوران میں وہ اپنے دانت ضرور کٹکٹاتے تھے۔ جیسے غصّے میں ہیں۔ چھوٹے چھوٹے گول گول حروف لکھتے تھے ــــ اتنے گول کہ بعض اوقات میرے لئے ان کی عبارت کے اکثر لفظ ایک دوسرے کے توام ہوتے تھے۔

پرانی انارکلی کے اس تاریخی کمرے میں ان کے میز کے ساتھ والی دیوار پر وہ تاریخی گروپ بھی آویزاں تھا۔ جو ہم نے امرتسر میں اتروایا تھا۔ اس میں عبّاس ہے، میں ہوں، باری صاحب ہیں اور ابوسعید قریشی بھی موجود ہے۔ باری صاحب

نے اس فوٹو کے نیچے شاید "امرت سر اسکول آف تھاٹ" لکھا ہوا تھا۔ یہ باری مرحوم کو بہت عزیز تھا۔ "ملاپ" یا "پرتاپ" کے دفتر میں کام کرتے ہوئے، اپنا کوٹ کھونٹی سے لٹکا کر جب آپ سگرٹ لینے کے لئے باہر نکلے تھے اور سیدھے برما جا پہنچے تھے تو اپنے ساتھ یہ گروپ لیتے گئے تھے۔

میں جب اس کمرے میں جو عباس اور باری صاحب کا گھر تھا، داخل ہوا تو سب سے پہلے باری صاحب نے مجھے یہ گروپ دکھایا اور اپنے مخصوص انداز میں جس میں بچوں کی تالیاں پیٹنے والی خوشی گھلی ہوتی تھی، کہا۔ "خواجہ صاحب۔ یہ دیکھئے ــــ" اس سے آگے وہ اور کچھ نہ کہہ سکے۔ لیکن اُن کے چہرے کے تمام خدوخال اپنی سیاہ قبا اتار چکے تھے۔ اور مسکرا رہے تھے۔

مرحوم کو مجھ سے بہت محبت تھی۔ ان کو مجھ پہ ناز بھی تھا۔ مگر اس کا اظہار انہوں نے میرے سامنے کبھی نہیں کیا۔ اور مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ انھوں نے کبھی کسی سے اس انداز سے کہا ہو "منٹو میرا بنایا ہوا ہے۔ حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ مجھے تحریر و تصنیف کے راستے پر ڈالنے والے وہی تھے۔ اگر امرتسر میں ان سے میری ملاقات نہ ہوتی تو ہو سکتا ہے کہ میں ایک غیر معروف آدمی کی حیثیت میں مر کھپ گیا ہوتا۔ یا چوری ڈکیتی کے جرم میں لمبی قید کاٹ رہا ہوتا۔

میں اور عباس بقول باری صاحب کافی "گُٹ" تھے۔ ایک شراب کا دوسرا اتنی طویل مدت کے بعد ملنے کا نشہ۔ ہم سب جھوم رہے تھے ــــ

ابوسعید قریشی کی بوتل کھولی گئی۔ اور دور شروع ہو گئے۔ باری صاحب پی کر بہت دلچسپ ہو جاتے تھے۔ وہ جو کپڑوں کے بجائے جزدان میں لپٹے اور کرسی کے بجائے رحل پر بیٹھے ہونے کی تصویر پیش کیا کرتے تھے۔ شراب کے چند گھونٹوں کے بعد ایک مختلف شکل اختیار کر لیا کرتے تھے۔ ان کی طبیعت میں وہ مزاحیہ اور فرحیہ عنصر جو اکثر شرعی پیجامہ پہنے رہتا تھا، بے ریش و بروت ہو کر سامنے آجاتا تھا۔ اس وقت جی چاہتا تھا کہ وہ بولتے رہیں اور ہم سنتے رہیں۔ اور یہ واقعہ ہے۔ کہ ایسے وقتوں میں کسی اور کو بولنے کا موقع بھی وہ شاذ و نادر ہی دیتے تھے۔

راجندر سنگھ بیدی، روسی ناول نویس شولوخوف کے " اینڈ کوییٹ فلوز دی ڈون " کے متعلق بات چیت کر رہا تھا۔ یہ ناول ہم میں سے کسی نے بھی نہیں پڑھا تھا لیکن بیدی کچھ اس انداز سے گفتگو کر رہا تھا کہ مجھے خواہ مخواہ اس میں شریک ہونا اور یہ ظاہر کرنا پڑا کہ ناول میرا پڑھا ہوا ہے۔ جب میں نے اس کا اظہار کیا تو بیدی بوکھلا سا گیا۔ باری صاحب تاڑ گئے کہ معاملہ کیا ہے اور شولوخوف کی ناول نویسی پر ایک لیکچر شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بیدی کو تھوڑی دیر کے بعد بڑے بلنڈے پن سے اس بات کا اقرار کرنا پڑا کہ اس نے شولوخوف کا زیر تبصرہ ناول نہیں پڑھا میں نے بھی حقیقت کا اظہار کر دیا۔ باری صاحب خوب ہنسے اور آخر میں انھوں نے اپنے مخصوص انداز میں حاضرین کو بتایا کہ شولوخوف کا نام انھوں نے پہلی مرتبہ بیدی صاحب کے منہ سے سنا ہے اور اس کی ناول نویسی پر جو لیکچر انھوں نے

پلایا ہے، ان کی دماغی اختراع ہے —— راجندر سنگھ بیدی کو بہت دور جانا تھا اس لئے وہ اجازت لے کر چلا گیا۔

غالباً دسمبر کے دن تھے۔ سخت سردی تھی۔ میں چونکہ ایک مدت تک باہر رہا تھا، اس لئے یہ سردی خاص طور پر مجھے بہت زیادہ محسوس ہو رہی تھی۔ لوہے کی انگیٹھی موجود تھی۔ باری صاحب نے فوراً آگ کا انتظام کر دیا۔ دروازہ کھول کر باہر گئے اور تھوڑی سی لکڑیاں لے آئے۔ ان کو انگیٹھی میں قرینے سے رکھ کر انھوں نے جونی واکر کی بوتل کھولی اور کچھ چھینٹے لکڑیوں پر مارے پھر "زرتشت، زرتشت" کہتے ہوئے ان کو ماچس دکھائی۔ جب آگ سلگ اٹھی تو سجدے میں چلے گئے۔

سجدے کا ذکر آیا تو مجھے یاد آگیا کہ وہ بڑے سجدہ گذار تھے۔ ایک زمانہ تھا کہ وہ امرتسر میں پانچ کے بجائے کبھی آٹھ، کبھی دس وقت نماز پڑھا کرتے تھے۔ وہ بیٹھک جہاں ہم بیٹھا کرتے تھے، اس کا نام انھوں نے "دارالاحمر" رکھا ہوا تھا۔ یہاں جب بھی ان کو نماز ادا کرنے کی حاجت محسوس ہوتی، بی بی جان (میری والدہ مرحومہ) کو آواز دیتے اور پانی کا لوٹا اور جا نماز منگوا لیتے۔ یہ تو ان کے من کی موج کا قصّہ ہے۔ لیکن جب کبھی ان سے کوئی غلطی سرزد ہو جاتی اور میں یا عبّاس اس کو پکڑ لیتے تو وہ فوراً اپنے کان اینٹھنا شروع کر دیتے تھے اور سہو کے لئے ایک دو سجدے بڑے خلوص کے ساتھ ادا کرتے تھے۔

مجھے ایک اپنا سجدہ یاد آگیا۔ جو ابھی تک میرے ماتھے میں رڑک رہا ہے۔

یہ بھی امرتسر ہی کی بات ہے۔ باری صاحب کو میری شراب نوشی پسند نہیں تھی۔ میں سمجھتا تھا کہ وہ بنتے ہیں۔ ایک شام کو وہ میرے ساتھ تھے۔ سیر کرتے کرتے ریلوے اسٹیشن کے ریفریشمنٹ روم میں پہنچ گئے۔ میں نے بیرے کو سمجھا دیا کہ وہ میرے لئے وسکی لائے اور باری صاحب کے لئے جنجر، جس میں ایک پیگ "جن" کا شامل ہو۔

باری صاحب کو کوئی نہ کوئی اور خاص طور پر پیٹ کا عارضہ ضرور لاحق رہتا تھا۔ میں نے ان سے کچھ پینے کے لئے پوچھا تو کہنے لگے۔ "نہیں میں کچھ نہیں پیوں گا۔ میرا معدہ خراب ہے۔"

باری صاحب ضدی نہیں تھے۔ تھوڑی سی لیکچر بازی کے بعد انہیں کسی بات پر بھی آمادہ کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے ادرک کے فائدے بتائے اور کہا کہ جنجر کا پانی ان کے معدے کی تمام خرابیاں دور کر دے گا۔ آپ راضی ہو گئے۔ بیرے نے ان کے سامنے بوتل گلاس میں انڈیلی۔ میں نے وسکی پینا شروع کر دی۔ اور باری صاحب نے جنجر، جس میں "جن" شامل تھی۔ یہ محلول جب اُن کے حلق سے اُترا تو ان کو فرحت حاصل ہوئی، میں نے اپنی وسکی ختم کر کے جب دوسرا پیگ طلب کیا تو انھوں نے بھی خواہش ظاہر کی کہ وہ ایک جنجر اور پئیں گے۔ بیرا اُسی قسم کا ایک اور مشروب تیار کر کے لے آیا۔

باری صاحب کو بہت لطف آیا۔ مجھ سے کہا۔ "ادرک کے فائدے میں نے

طب کی کسی کتاب میں پڑھے تھے۔ واقعی بڑے معرکے کی چیز ہے۔ وہ بوجھ سا وہ اینٹھن سی جو میں صبح سے محسوس کر رہا تھا، بالکل غائب ہے ۔۔۔"
میں ہنس پڑا۔ اس کے بعد مجھے ان کو بتانا پڑا کہ معرکے کی چیز کون سی تھی۔ وہ بہت خفا ہوئے۔ بلکہ یوں کہیئے کہ ان کو بہت دُکھ ہُوا۔ میری طفلانہ حرکت انھوں نے معاف تو کر دی مگر میں محسوس کر رہا تھا کہ انھیں سخت روحانی کوفت ہوئی ہے۔ چنانچہ میں نے اُن سے صدق دل سے وعدہ کیا کہ میں آئندہ کبھی شراب نہیں پیُوں گا۔ بیر ایل لایا تو باری صاحب نے پنسل سے اس پہ اقبال کا یہ مصرعہ لکھ دیا۔ ع

یارب درونِ سینہ دل باخبر بدہ

مجھ پر اس واقعے کا بہت اثر ہُوا۔ اتنا اثر کہ جب میں رات کو گھر لوٹا تو گلی کے فرش پر میں نے سجدہ کیا اور خدا سے دعا مانگی کہ وہ مجھے اپنے ارادے میں ثابت قدم رہنے کی توفیق عطا فرمائے اور اس گناہ کو جو مجھ سے سرزد ہُوا معاف کر دے۔ اس سجدے سے طبیعت کا بوجھ تو ہلکا ہو گیا۔ مگر ایک اور بوجھ اس پر لد گیا کہ اب میں پی نہیں سکتا تھا۔ کئی دن گذر گئے۔ ہر وقت اداسی چھائی رہتی تھی۔ لیکن دل کو پرچانے کے لیئے یہ بات موجود تھی کہ میں اپنے وعدے پہ قائم ہوں اور ایک لعنت سے بچنے کی کامیاب کوشش کر رہا ہوں۔
ایک دن شام کو باری صاحب آئے۔ میں کھڑکی میں بیٹھا تھا۔ انھوں نے باہر گلی میں کھڑے کھڑے میرا مزاج پوچھا۔ میں نے مسکرا کر کہا۔" کیا پوچھتے ہیں ۔۔۔

بس ٹھیک ہے!"

باری صاحب نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور کہا۔"میں ابھی آتا ہوں۔"

جب وہ آئے تو ان کے پجامے میں شراب کا ادھا اڑسا ہوا تھا۔ مجھے سخت حیرت ہوئی۔ میں نے ان سے کچھ کہنا چاہا مگر انھوں نے سننے سے انکار کر دیا۔ اور بوتل کھولنا شروع کر دی۔ اتنے میں عباس آ گیا۔ باری صاحب کے کہنے پر سب دروازے بند کر دیئے گئے۔ اندر سے روٹی منگوائی گئی۔ جو کسی نے بھی نہ کھائی۔ سالن وغیرہ الگ رکھ لیے گئے اور گلاس چھوڑ کر باقی برتن واپس بھیج دیئے گئے۔ عباس کنویں سے لوٹے میں پانی لایا اور ہم سب نے پی ——— وہ سجدہ جو میں نے گلی کے ٹھنڈے فرش پر اس رات خدا کے حضور ادا کیا تھا۔ میری پیشانی میں تڑپتا رہا۔

ہم پی رہے تھے تو حسن عباس نے چھیڑنے کی خاطر باری صاحب سے کہا۔ "آپ کی یہاں سب عزّت کرتے ہیں۔ بی بی جان آپ کو نمازی اور پرہیزگار کی حیثیت سے جانتی ہیں۔ ان کے دل میں آپ کا اتنا احترام ہے ——— اگر وہ یہاں آ جائیں تو کیا ہو؟"

باری صاحب نے کہا۔"میں کھڑکی کھول کر باہر کود جاؤں گا۔ اور پھر کبھی اُن کو اپنی شکل نہیں دکھاؤں گا۔"

باری صاحب ہمیشہ اپنی زندگی کی کوئی نہ کوئی کھڑکی کھول کر باہر کود جاتے رہے

یہ کھڑکی کھلی رہتی۔ مگر وہ پھر کبھی اس کو اپنی شکل نہ دکھاتے۔

کھڑکی کھول کر باہر کود جانے سے میں کسی تضحیک کا ناتا نہیں جوڑ رہا۔ اصل میں وہ نظام جو انگریزوں سے متعلق تھا، اور جس میں باری مرحوم نے انگوٹھا چوسنے سے لے کر قلم چوسنے تک، اور قلم چوسنے سے لے کر اپنا خون چُسانے تک کے تمام مراحل افتاں وخیزاں طے کئے اور اس کے بعد وہ نظام جس میں انہوں نے اقبال مرحوم کی ان تبغوں کے سائے میں جو ریڈیو پاکستان نے اپنے پروگراموں میں بے نیام کی تھیں، اپنی زندگی کی شام کے آخری دھندلکوں کو سنوارنے کی کوشش کی، ایسی بے شمار کھڑکیوں سے پُر تھا۔ جن کے کھٹکے باہر کود جانے کی ہلکی سی خواہش پر بھی خود بخود کھل جاتے تھے۔

پھر دیکھئے، میں کہاں کا کہاں پہنچ گیا۔ بات پرانی انارکلی کے اُس کمرے کی ہو رہی تھی جہاں دسمبر کی خون منجمد کر دینے والی سردی میں ہم پی رہے تھے۔ اور باری صاحب تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد باہر جاتے اور انگیٹھی کی آگ برقرار رکھنے کے لئے کہیں سے ایندھن لے آتے تھے۔ بہت دیر کے بعد ملنا ہوا تھا۔ اس لئے وقت گذرنے کا قطعاً احساس نہیں تھا۔ باری صاحب زرتشت کی "آگیاری" کے لئے کتنی مرتبہ ایندھن لائے، یہ بھی یاد نہیں، لیکن ابھی تک یہ ضرور یاد ہے کہ جب میں صبح کمرے سے باہر نکلا تو بازار کی طرف لکڑی کا جو شکستہ سا جنگلہ تھا، بالکل غائب تھا۔ اس کی راکھ البتہ کمرے میں انگیٹھی کے اندر موجود تھی۔

عباس نے باری صاحب کو دھڑکایا، کہ اگر مالک مکان کو علم ہوگیا کہ وہ جنگلہ جلا جلا کر آگ تاپتے رہے ہیں تو وہ "کباب" ہو جائے گا اور بیک بینی و دو گوش اُن کو نکال باہر کرے گا۔ باری صاحب جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں، بہت ڈرپوک تھے۔ عباس نے جب ان کو اس غیر واجب حرکت سے آگاہ کیا تو وہ کھسیانے سے ہو گئے۔ بات کو ہنسی میں اُڑانے کی بھونڈی سی کوشش کی۔ مگر ناکام رہے آخر میں عباس سے کہا۔ "ہم اُس کو خبر ہونے سے پہلے ہی نکل جائیں گے۔"

لیکن مصیبت یہ ہے کہ نکل جانے سے پہلے اُن کے علاوہ ہر ایک کو خبر ہو جاتی تھی۔ وہ جب ملاپ یا پرتاپ کے دفتر سے کھونٹی سے اپنا کوٹ لٹکا کر سگرٹ لینے کے لئے باہر نکلے اور برما پہنچ گئے۔ تو اُن کا یہی خیال تھا کہ کسی کو خبر تک نہ ہوگی، مگر جاننے والے جانتے تھے۔ کہ وہ کدھر کا رُخ کئے ہیں۔

باری صاحب نے مختلف چھوٹے بڑے شہروں کی رسد گاہوں میں اپنی قسمت کے ستاروں کا مطالعہ کیا، لیکن گھوم پھر کر آخر انھیں لاہور ہی کی رسدگاہ میں آنا پڑا جو کسی زمانے میں عرب ہوٹل میں تھی اور بعد میں نگینہ بیکری میں اپنے جملہ ساز و سامان کے ساتھ اُٹھ آئی تھی۔ یہاں اور وہاں بڑے بڑے مہندس اور ستارہ شناس جمع ہوتے تھے۔ ان میں سے کچھ ان کی زندگی میں اپنے ستاروں سے آگے دوسرے جہانوں میں چلے گئے اور کچھ اپنے بے نور ستاروں کے لئے بلند نشینوں کی چمک دمک بھیک کے طور پہ مانگتے رہے۔

باری صاحب کو جب کبھی میں نے ان محفلوں میں دیکھا، مجھے یوں محسوس ہُوا کہ وہ گرم گرم کالی کوفی کا پیالہ ہیں جس میں سے بھاپ کا دھواں اُٹھ رہا ہے جو صرف چند لمحوں کے لئے فضا میں لہراتا، بل کھاتا ہے اور پھر اُس کی نمی کی آغوش میں سو جاتا ہے —— ان محفلوں میں، ان گنگنی، گرم و سرد صحبتوں میں اُن کے ذہنی سر کی ہنڈیا سے طرح طرح کے ذہنی ماکولات کی خوشبودار بھاپ اُٹھتی مگر ان ہوٹلوں اور بیکریوں کی کثیف فضا میں تھوڑی دیر اپنی نزاکت اور ندرت پہ اترا اترا کر وہیں سو جاتی۔

باری صاحب "باتوں کے بادشاہ" تھے۔ کوچہ وکیلاں کے "دارالاحمر" میں جب وہ ولی اللہ (گاؤ تکیے کو وہ ولی اللہ کہا کرتے تھے) کا سہارا لے کر بیٹھتے تو دلچسپ باتوں کے دریا بہنے شروع ہو جاتے تھے۔ اُن دنوں سرور صاحب (آفاق کے مُدیر) بھی کبھی کبھی تشریف لاتے تھے۔ آپ میری حرکات و سکنات میں گہری دلچسپی کا اظہار فرمایا کرتے تھے۔ باری صاحب کی طرح وہ بھی میری حوصلہ افزائی کیا کرتے اور باتوں باتوں میں مجھے یقین دلاتے تھے کہ میں بہت جلد تحریر و تصنیف کے قابل ہو جاؤں گا۔

امرتسر کا ذکر آیا تو مجھے ایک دلچسپ لطیفہ یاد آ گیا۔ میں، باری صاحب، حسن عباس اور ابوسعید قریشی اپنی محفل میں کسی اور کی شمولیت پسند نہیں کرتے تھے۔ کامریڈ فیروزالدین منصور سے ہم سب کی صاحب سلامت تھی۔ کبھی کبھی وہ

بھی دارالاحمر تشریف لے آتے تھے، مگر ان کی تشریف آوری ہم سب کو ناگوار معلوم ہوتی تھی۔ باری صاحب ازراہ مذاق کہا کرتے تھے کہ کامریڈ صاحب پوٹاشیم پرمگنیٹ سے بم بناتے ہیں۔ عباس ان کو فرائڈ الدین منصور کہتے تھے۔ کچھ دیر ہم اُن کا آنا جانا برداشت کرتے رہے، آخر باری صاحب کو ایک ترکیب سوجھی۔ کامریڈ ایف ڈی منصور کمرے میں داخل ہوئے تو باری صاحب نے بڑے بھونڈے طریقے سے آنکھ مار کر عباس سے کہا۔ "خواجہ صاحب — چلیے، پھر کہیں دیر نہ ہو جائے" اور اُٹھ کر کھڑکیاں بند کرنا شروع کر دیں — منصور صاحب جو بیٹھنے کا ارادہ ہی کر رہے تھے، ہمارے ساتھ چل پڑے۔ بازار میں نکل کر باری صاحب نے اُن سے معذرت طلب کی اور ہم ایک چکر کاٹ کر پھر دارالاحمر واپس آ گئے — باری صاحب بہت خوش تھے۔ اتنے خوش کہ وہ دیر تک ہنس ہنس کر دوہرے ہوتے رہے۔

باری صاحب بہت معمولی معمولی باتوں پر خوش ہو جایا کرتے تھے۔ اُن کی خوشی جیسا کہ میں اس سے پہلے کہہ چکا ہوں، بالکل بچوں کی سی خوشی ہوتی تھی، اُس میں تالیاں پیٹنے کا شور ہوتا تھا۔ اُن کی توند بڑھی ہوئی تھی (جس کے متعلق وہ ہمیشہ فکر مند رہتے تھے) جب وہ ہنستے تھے تو یہ بھی ہنسا کرتی تھی۔

بہت مخلص آدمی تھے، اتنے مخلص کہ انھوں نے اپنی آنے والی موت سے بھی کوئی لڑائی جھگڑا نہ کیا۔ اصل میں وہ لڑائی بھڑائی سے ہمیشہ گھبراتے تھے۔

اُن کی طبیعت صلح کل تھی۔ دل کا عارضہ اُن کو بہت دیر سے تھا، مگر اس کا علاج انھوں نے جب بھی کیا، مصالحت آمیز طریقے سے کیا۔ اس کی مدافعت میں اُن سے کبھی جارحانہ قدم نہ اُٹھا۔

مجھے یاد ہے۔ مرنے سے دو روز پہلے میری ان کی مڈبھیڑ میو روڈ پر ہوئی۔ بوہڑ والے چوک سے دائیں ہاتھ کو اُن کا تانگہ جا رہا تھا۔ مجھے دیکھا تو اسے رکوا لیا۔ میں اُن سے ناراض تھا۔ سخت ناراض۔ اس لئے کہ وہ دور دور رہتے تھے۔ انگریزوں کے ہائی کمشنر کے دفتر میں ملازمت اختیار کرنے کے بعد وہ کچھ ایسے بجھ گئے کہ اپنے بے تکلف دوستوں سے اگر ان کی ملاقات محض اتفاقیہ طور پر ہو جاتی، تو عجیب و غریب سا حجاب محسوس کرتے۔

میں اُن کے پاس پہنچا تو وہ تانگے سے اُترے۔ مجھ سے مصافحہ کیا۔ اور میری خیریت دریافت کی۔ یہ رسوم مجھے بہت بُری معلوم ہوئیں۔ میں نے اُن سے کہا — "باری صاحب۔ آپ بہت ذلیل ہو گئے ہیں۔ اتنے ذلیل کہ آپ نے مجھ سے ملنا جلنا ہی چھوڑ دیا ہے — آپ نے انگریز کی نوکری کیا کی ہے، اپنا سارا کیریکٹر تباہ کر لیا ہے"

میری لعن طعن کے جواب میں گھٹی گھٹی، بیمار بیمار سی مسکراہٹیں اُن کے اُودے ہونٹوں پر بکھرتی رہیں۔ اُن کے چہرے کا رنگ کسی قدر زرد تھا اور آواز نحیف تھی۔ میں نے اُن سے پوچھا۔ "خیر چھوڑیئے اس قصّے کو۔ یہ بتائیے آپ کا مزاج کیسا ہے؟"

میرے اس سوال کے جواب میں انھوں نے بڑی سنجیدگی سے یہ بتانے کی کوشش کی کہ وہ ایک عرصے سے دل کے عارضے میں مبتلا ہیں، سیکڑوں علاج کر چکے ہیں، مگر کوئی افاقہ نہیں ہؤا۔ اس کے بعد انھوں نے مجھے بتایا کہ میو روڈ پہ کوئی ہومیو پیتھ ہے، اب وہ اُس سے رجوع کر رہے ہیں۔ میں نے اُن سے ازراہِ مذاق کہا۔ "یہ رسدگاہ باقی رہ گئی تھی جہاں آپ اپنے ستاروں کا مطالعہ فرمانے جا رہے ہیں —— چھوڑیئے باری صاحب، آپ کو کوئی عارضہ وارضہ نہیں۔ آپ کو صرف وہم کی بیماری ہے۔ جس کا علاج، سنا ہے لقمان حکیم کے پاس بھی نہیں تھا —— آپ زیادہ کھاتے ہیں، اس لئے آپ کا معدہ خراب رہتا ہے۔ تبخیر کے باعث جو بخارات اُٹھتے ہیں، آپ کے دل پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔ بس اتنی سی بات ہے جسے آپ نے تبنگڑ بنا رکھا ہے!"

میری بات اُن کے دل کو لگی (اُن کے دل کو ہر بات لگ جاتی تھی) کہنے لگے "میرا خیال ہے، آپ ٹھیک کہتے ہیں، تبخیر کی شکایت تو مجھے ہے...... اور بعض ڈاکٹروں کی تشخیص بھی یہی کہتی ہے۔"

بہت دیر تک میری اُن کی باتیں ہوئیں۔ مجھے انھوں نے بتایا کہ وہ تاریخِ عالم (کئی جلدوں میں ایک بسوط کتاب جو مرحوم مکمل نہ کر سکے) دوبارہ پھیلا کر لکھ رہے ہیں اور ترجمہ کی زبان میں پنجابی الفاظ تلاش کر رہے ہیں۔

مرحوم کو پنجابی زبان سے بہت محبت تھی۔ ایک زمانہ تھا کہ وہ پنجابی کو پنجاب

کی قومی زبان بنانے پر تلے ہوئے تھے۔ اُن دنوں وہ غالباً سکھوں کے اخبار "اجیت" کے اڈیٹر تھے۔ جہاں بیٹھتے تھے اپنی نت نئی اسکیموں کا ذکر چھیڑ دیتے تھے۔ جن کے ذریعے سے وہ اُردو کے بجائے پنجابی رائج کرنا چاہتے تھے۔ ہر ملنے والے کو تلقین کرتے تھے کہ وہ اُردو کے بجائے اپنی مادری زبان پنجابی میں لکھا کرے۔ اُن کا کہنا تھا کہ صرف وہی زبان جاندار ہوتی ہے جس میں دی ہوئی گالی وزندار ہو اور انفرادیت و ندرت رکھتی ہو۔ اُن کا ایمان تھا کہ دنیا کی کوئی زبان گالیوں کے معاملے میں پنجابی کا مقابلہ نہیں کر سکتی ——— اور پُر لطف بات یہ ہے کہ خود باری صاحب نے اپنی زندگی میں ایک سطر بھی پنجابی زبان میں نہ لکھی۔

تقسیم سے پہلے انارکلی میں ایک کیلاش ہوٹل ہوا کرتا تھا۔ اس میں دبار بھی تھی مقدمات کے سلسلے میں جب لاہور آتا تو چوہدری نذیر کے ساتھ اس ہوٹل میں دو تین محفلیں ضرور جمتی تھیں جن میں باری صاحب کو شریک ہونے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ ہم بالائی منزل پر چلے جاتے اور وسکی کے دور شروع ہو جاتے تھے۔ ایک سکھ بیرا تھا۔ باری صاحب جب دو پیگ پی لیتے تو اُس سے ٹھیٹ پنجابی میں گفتگو شروع کر دیتے۔ اُس وقت ان کے دل و دماغ میں صرف پنجابی زبان کی ترویج کا خیال ہوتا۔ لیکن چار پیگ کے بعد وہ کانٹا بدل کر اُردو کی طرف آ جاتے اور اسکی عالمگیری کے متعلق تقریر شروع کر دیتے اور کہتے کہ پنجابی گنڈوں اور لفنگوں کی زبان ہے، بہت غیر مہذب ہے جو سماعت پر گراں گذرتی ہے۔ پانچویں اور چھٹے

پیگ کے دوران میں اُردو سے ان کی والہانہ محبت سکڑتی رہتی۔ جب پانچواں پیگ اپنا کام کر جاتا تو وہ فارسی کی مٹھاس کے گرویدہ نظر آتے۔ ٹھیٹ ایرانی لہجے میں فارسی بولنے کی کوشش کرتے، مگر چھٹا اور ساتواں پیگ انھیں پشتو کے پتھروں میں لڑھکانا شروع کر دیتا۔ آٹھویں اور نویں پیگ میں پنجابی، اردو، فارسی، پشتو اور عربی ان کے دماغ میں "کاک ٹیل" بن کر چھلکنے لگتی۔

مرحوم بولنے اور اپنی آواز آپ سننے کے بہت شائق تھے۔ اتنی ہمت نہیں تھی کہ کسی جلسے میں تقریر کرتے، لیکن یار دوستوں کی محفل میں اپنا شوق پورا کر لیا کرتے تھے۔ دہلی مسلم ہوٹل میں سے ایک دفعہ آپ ایک چمچہ اُڑا لائے۔ آدھی رات کا وقت تھا۔ جب ہم انار کلی کے وسط میں پہنچے تو آپ نے یہ چمچہ نکال کر بیلچے کے مانند اپنے کاندھے پر رکھ لیا اور "چپ راست، چپ راست" کرتے ایک دکان کے تھڑے پر چڑھ گئے اور خاکساروں کی تحریک پر ایک عمدہ تقریر اُگل کے رکھ دی۔ بے شمار آدمی جمع ہو گئے۔ لیکن باری صاحب جوش و خروش کے ساتھ بولتے رہے۔ اس کے بعد ہم سب نے چوک میں کھڑے ہو کر علّامہ مشرقی زندہ باد کے نعرے لگائے۔ پھر موتیے کے ہار خریدے اور اپنے اپنے گلے میں ڈال لئے۔ باری صاحب نے ایک ہار اپنی کلائی کے گرد لپیٹ لیا اور مجھ سے کہا۔ "خواجہ صاحب، چلو ہیرا منڈی چلیں —— موتیے کے ان پھولوں کی خوشبو کا رُخ اسی طرف ہے۔"

ہم سب ہیرا منڈی پہنچے۔ باری صاحب کے سرور خوب گھٹے ہوئے تھے۔ بہت

دیر تک ہم اُس منڈی کی تنگ و تارہ گلیوں میں گھومتے رہے۔ اس دوران میں باری صاحب نے کئی پٹھان ٹکھیائیوں سے پشتو میں بات چیت کی۔ ایک ایسی ہی ٹکھیائی سے مصروفِ گفتگو تھے کہ اُن کی جان پہچان کا ایک آدمی اُدھر سے گذرا۔ باری صاحب نے آگے بڑھ کر اُس سے مصافحہ کیا۔ اُس آدمی نے پوچھا۔ "مولانا یہاں کیا ہو رہا ہے؟"

باری صاحب نے پٹھان کسبی کی طرف دیکھا اور جواب دیا۔ "اس لڑکی سے سیاسیاتِ حاضرہ پر تبادلۂ خیالات کر رہا تھا۔"

صبح عباس نے باری صاحب کو رات کے تمام واقعات سنائے۔ خوب نمک مرچ لگا کر۔ اس انداز میں کہ وہ ندامت محسوس کریں۔ باری صاحب نے مجھ سے تصدیق چاہی تو میں نے مصنوعی سنجیدگی سے کہا۔ "باری صاحب، یہ واقع ہے کہ آپ نے کل رات بڑی ذلیل حرکتیں کیں۔ یہ آپ کی شایانِ شان نہیں تھیں۔"

باری صاحب بہت نادم ہوئے۔ اس قدر نادم کہ آپ نے فوراً وضو کر کے نماز پڑھنا شروع کر دی۔

باری صاحب کو مصلح بننے کا شوق تھا، اُن کی دلی آرزو تھی کہ وہ ایک بہت بڑے رہنما بن جائیں۔ ہر چوک میں اُن کا بُت نصب ہو۔ وہ کوئی ایسا کارنامہ سر انجام دیں کہ آنے والی تمام نسلیں اُنھیں یاد رکھیں، مگر اس کے لئے جرأت اور بے باکی کی ضرورت تھی۔ اُسی قسم کی جرأت اور بے باکی کی جس کا مظاہرہ وہ کبھی کبھی پی کر ہیرا منڈی کی گلیوں میں پٹھان ٹکھیائیوں سے سیاستِ حاضرہ پر تبادلۂ خیالات

کے دوران میں کیا کرتے تھے۔ لیکن جب کبھی اُن سے ایسی جرأت اور بے باکی سرزد ہو جاتی تو وہ وضو کر کے نماز پڑھنا شروع کر دیتے اور اس کی آلائشوں سے خود کو پاک صاف کر لیتے۔

وہ قینچی کو انگلیوں میں پھنسا کر اپنے خیالات و افکار کے زرد زرد کتابت شدہ کاغذوں کو کاٹ کاٹ کر ساری عمر اپنی زندگی کی کاپی جوڑتے رہے۔ مگر اسے پتھروں پر کبھی منتقل نہ کر سکے۔ شاید اس خیال سے کہ وہ ان کے بوجھ تلے پس جائیں گے —— اُن کو ہمیشہ کسی نہ کسی چیز کے پس جانے کا خدشہ لاحق رہتا تھا۔ حالانکہ وہ تمام کو پیس کر سفوف بنا دینا چاہتے تھے اور اس سفوف کو نسوار کے طور پر استعمال کرنے کے خواہش مند تھے۔

وہ انگریزوں کے سخت دشمن تھے، لیکن یہ طرفہ تماشا ہے کہ جب انگریز چلا گیا تو وہ اُسی کے نوکر ہو گئے۔ انھوں نے "کمپنی کی حکومت" جیسی باغیانہ کتاب لکھی، لیکن اس کمپنی کے سابق ٹھیکہ داروں کی ملازمت میں انھوں نے اپنی زندگی کے چند آخری اور بڑے قیمتی برس گذارے۔

باری مرحوم سے میں اپنی آخری ملاقات کا ذکر کر رہا تھا۔ جب وہ کسی ہومیو پیتھ سے اپنے دل کے عارضے کا علاج پوچھنے جا رہے تھے۔ اُس دل کا جو خلوص سے معمور تھا —— جو اس قدر شریف تھا کہ اُس نے باری صاحب کی بزدلی کا ساتھ دیا اور دھڑکنا بند کر دیا۔

میں نے انہی دنوں میں آغا حشر کے متعلق ایک مضمون لکھا تھا (جو اس کتاب میں شامل ہے) اس میں جیجے کے ہوٹل میں باری صاحب سے پہلی بار ملاقات کرنے کا ذکر بھی تھا۔ باری صاحب نے یہ مضمون پڑھ کر مجھے ایک خط لکھا تھا جس میں امرتسر کے اُن ایام کی یاد تازہ کی تھی جب میں، ابوسعید، عباس، عاشق فوٹوگرافر اور باری صاحب مل کر بالکل خبطیوں کی طرح بازاروں میں گھوما کرتے تھے ـــــ بے مطلب، بے مقصد ـــــ جب ہم نے "فری تھنکرز" جیسی اوٹ پٹانگ جماعت کی بنا ڈالی تھی۔ اس کے قواعد وضوابط میں نمبر ایک پہ یہ چیز تھی کہ فری تھنکر جو بھی چاہے کرے۔ کسی کو اس کا استحقاق حاصل نہیں ہوگا کہ وہ اس سے اُس کے کسی فعل کے متعلق استفسار کرے ـــــ چنانچہ اکثر ایسا ہوا کہ ہم چاروں جارہے ہیں کہ اچانک باری صاحب موڑ مڑے اور ہم سے جُدا ہو گئے۔ بڑی گرما گرم باتیں ہورہی ہیں کہ اچانک عبّاس خاموش ہوگیا اور واپس چلا گیا۔

اِس خط کے بارے میں باری صاحب سے مختصر سی گفتگو ہوئی۔ میں نے باری صاحب سے کہا کہ یوں تو انہوں نے دعویٰ کیا ہے کہ اُن کا حافظہ بہت تیز ہے، لیکن وہ اُن ایّام کی بہت سی باتوں کا تذکرہ بھول گئے ہیں۔ باری صاحب نے نحیف آواز میں معذرت چاہی اور کہا کہ انھوں نے یہ خط بڑی روا روی میں لکھا ہے، حکایت بہت دراز تھی، لیکن انھیں سکونِ قلب میسّر نہیں تھا۔

انھوں نے سکونِ قلب کا ذکر کیا تو میں پھر اُن کے پیچھے پڑ گیا کہ وہ کیوں اپنے

قلب کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں جو اچھا بھلا ہے ـــــ لیکن تیسرے روز صبح چھ بجے چار کی پہلی پیالی پی کر میں نے سگرٹ سلگایا اور "تازہ امروز" کھولا تو پہلے صفحے پر یہ سُرخی نظر آئی کہ اشتراکی ادیب باری کا انتقال ہو گیا ہے ـــــ کچھ عرصے کے لئے میں بالکل گُم سُم ہو گیا۔ میں نے پھر خبر کی طرف دیکھا۔ تین کالمی سرخی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کاپی جوڑتے وقت یہ سرخی باری صاحب نے قینچی سے کاٹ کر خود اپنے ہاتھوں سے بڑے قرینے کے ساتھ جمائی ہے۔

اشتراکی ادیب باری، میرا دوست، میرا رہنما، تمام عمر اپنی زندگی کی جلی اور خفی سرخیاں جماتا رہا، لیکن افسوس کہ وہ اُن کے نیچے وہ مضمون نہ لکھ سکا جو اُس کے وزنی سر میں پرورش پاتے تھے اور بھاپ بن کر لاہور کی بیکریوں اور ہوٹلوں کی کثیف فضا میں جذب ہو جاتے تھے۔

باری صاحب قبر میں ہیں۔ معلوم نہیں اُس میں بھی کوئی ایسی کھڑکی ہے جس سے وہ کود کر باہر نکل سکیں۔

عصمت چغتائی

آج سے تقریباً ڈیڑھ برس پہلے جب بیں بمبئی میں تھا۔ حیدر آباد سے ایک صاحب کا پوسٹ کارڈ موصول ہوا۔ مضمون کچھ اس قسم کا تھا۔

"یہ کیا بات ہے کہ عصمت چغتائی نے آپ سے شادی نہ کی؟ منٹو اور عصمت، اگر یہ دو ہستیاں مل جاتیں تو کتنا اچھا ہوتا مگر افسوس کہ عصمت نے شاہد سے شادی کر لی اور منٹو......

انہی دنوں حیدر آباد میں ترقی پسند مصنفوں کی ایک کانفرنس ہوئی۔ میں اس میں شریک نہیں تھا۔ لیکن حیدر آباد کے ایک پرچے میں اس کی روداد دیکھی، جس میں یہ لکھا تھا کہ وہاں بہت سی لڑکیوں نے عصمت کو گھیر کر یہ سوال کیا۔ "آپ نے منٹو سے شادی کیوں نہ کی؟"

مجھے معلوم نہیں کہ یہ بات درست ہے یا غلط۔ لیکن جب عصمت بمبئی واپس آئی تو اس نے میری بیوی سے کہا کہ حیدرآباد میں جب ایک لڑکی نے اس سے سوال کیا۔ "کیا منٹو کنوارا ہے؟" تو اس نے ذرا طنز کے ساتھ جواب دیا۔ "جی نہیں" اس پر وہ محترمہ عصمت کے بیان کے مطابق کچھ کھسیانی سی ہو کر خاموش ہو گئیں۔

واقعات کچھ بھی ہوں۔ لیکن یہ بات غیر معمولی طور پر دلچسپ ہے کہ سارے ہندوستان میں ایک صرف حیدرآباد ہی ایسی جگہ ہے۔ جہاں مرد اور عورتیں میری اور عصمت کی شادی کے متعلق فکرمند رہے ہیں۔

اس وقت تو میں نے غور نہیں کیا تھا لیکن اب سوچتا ہوں۔ اگر میں اور عصمت واقعی میاں بیوی بن جاتے تو کیا ہوتا؟ یہ "اگر" بھی کچھ اسی قسم کی اگر ہے۔ اگر کہا جائے کہ اگر قلوپطرہ کی ناک ایک انچ کا اٹھارھواں حصّہ بڑی ہوتی تو اس کا اثر وادیٔ نیل کی تاریخ پر کیا پڑتا ــــ لیکن یہاں عصمت قلوپطرہ ہے اور نہ منٹو انطنی، لیکن اتنا ضرور ہے کہ اگر منٹو اور عصمت کی شادی ہو جاتی تو اس حادثے کا اثر عہدِ حاضر کے افسانوی ادب کی تاریخ پر ایٹمی حیثیت رکھتا۔ افسانے افسانے بن جاتے۔ کہانیاں مڑتڑ کر پہیلیاں ہو جاتیں۔ انشاء کی چھاتیوں میں سارا دودھ خشک ہو کر یا تو ایک نادر سفوف کی شکل اختیار کر لیتا یا بھسم ہو کر راکھ بن جاتا اور یہ بھی ممکن ہے کہ نکاح نامے پر ان کے دستخط ان کے قلم کی آخری تحریر ہوتے۔ لیکن سینے پر ہاتھ رکھ کر یہ بھی کون کہہ سکتا ہے کہ نکاح نامہ ہوتا۔ زیادہ قرینِ قیاس تو یہی معلوم ہوتا ہے

کہ نکاح نامے پر دونوں افسانے لکھتے اور قاضی صاحب کی پیشانی پر دستخط کر دیتے تاکہ سند رہے۔ نکاح کے دوران میں کچھ ایسی باتیں بھی ہو سکتی تھیں۔

"عصمت، قاضی صاحب کی پیشانی ایسا لگتا ہے تختی ہے۔"

"کیا کہا؟"

"تمہارے کانوں کو کیا ہو گیا ہے؟"

"میرے کانوں کو تو کچھ نہیں ہوا ـــــ تمہاری اپنی آواز حلق سے باہر نہیں نکلتی۔"

"حد ہو گئی ہے ـــــ لو اب سنو۔ میں یہ کہہ رہا تھا قاضی صاحب کی پیشانی بالکل تختی سے ملتی جلتی ہے۔"

"تختی تو بالکل سپاٹ ہوتی ہے۔"

"یہ پیشانی سپاٹ نہیں؟"

"تم سپاٹ کا مطلب بھی سمجھتے ہو؟"

"جی نہیں۔"

"سپاٹ ماتھا تمہارا ہے ـــــ قاضی جی کا ماتھا تو ......"

"بڑا خوبصورت ہے۔"

"خوبصورت تو ہے۔"

"تم محض چڑا رہی ہو مجھے۔"

"چڑا تم رہے ہو مجھے۔"

"میں کہتا ہوں تم چڑا رہی ہو مجھے۔"

"میں کہتی ہوں تم چڑا رہے ہو مجھے۔"

"تمھیں ماننا پڑے گا کہ تم چڑا رہی مجھے۔"

"اجی واہ —— تم تو ابھی سے شوہر بن بیٹھے۔"

"قاضی صاحب، میں اس عورت سے شادی نہیں کروں گا —— اگر آپ کی بیٹی کا ماتھا بھی آپ ہی کے ماتھے کی طرح ہے تو میرا نکاح اس سے پڑھوا دیجیے۔"

"قاضی صاحب، میں اس مردوے سے شادی نہیں کروں گی —— اگر آپ کی چار بیویاں نہیں ہیں تو مجھ سے شادی کر لیجیے۔ مجھے آپ کا ماتھا بہت پسند ہے۔"

کرشن چندر "چوٹیں" کے دیباچے میں لکھتا ہے:

"عصمت کو چھپاتے ہیں، پڑھنے والے کو حیرت و اضطراب میں گم کر دیتے ہیں اور پھر یکایک آخر میں اس اضطراب و حیرت کو مسرت میں مبدّل کر دینے کی صفت میں عصمت اور منٹو ایک دوسرے کے بہت قریب ہیں اور اس فن میں اردو کے بہت کم افسانہ نگار ان کے حریف ہیں۔"

اگر ہم دونوں کو شادی کا خیال آتا تو دوسروں کو حیرت و اضطراب میں گم

کرنے کے بجائے ہم خود اس میں غرق ہو جاتے۔ اور جب ایک دم چونکتے تو یہ حیرت اور اضطراب جہاں تک میں سمجھتا ہوں۔ مسرت کے بجائے ایک بہت بڑے فکاہیہ میں تبدیل ہو جاتا ــــ عصمت اور منٹو، نکاح اور شادی کیتنی مضحکہ خیز چیز ہے۔

عصمت لکھتی ہے۔

ایک ذرا سی محبت کی دنیا میں کتنے شوکت، کتنے محمود، عباس عسکری، یونس اور نہ جانے کون کون تاش کی گڈی کی طرح پھینٹ کر بکھیر دئے گئے ہیں۔ کوئی بتاؤ، ان میں سے چور پتّا کون سا ہے؟ ــــ شوکت کی بھوکی بھوکی کہانیوں سے لبریز آنکھیں، محمود کے سانپوں کی طرح رینگتے ہوئے اعضا، عسکری کے بے رحم ہاتھ، یونس کے نچلے ہونٹ کا سیاہ تل، عبّاس کی کھوئی ہوئی مسکراہٹیں اور ہزاروں چوڑے چکلے سینے۔ کشادہ پیشانیاں، گھنے گھنے بال، سڈول پنڈلیاں۔ مضبوط بازو سب ایک ساتھ مل کر پکے سوت کے ڈوروں کی طرح الجھ کر رہ گئے ہیں۔ پریشان ہو ہو کر اس ڈھیر کو دیکھتی ہوں۔ مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ کون سا سرا پکڑ کر کھینچوں کہ کھنچتا ہی چلا آئے اور میں اس کے سہارے دُور اُفق

سے بھی اوپر ایک پتنگ کی طرح تن جاؤں۔

(چھوٹی آپا)

منٹو لکھتا ہے:

میں صرف اتنا سمجھا ہوں کہ عورت سے عشق کرنا اور زمینیں خریدنا تمھارے لئے ایک ہی بات ہے۔ سو تم محبت کرنے کے بجائے ایک دو بیگھے زمین خرید لو اور اس پر ساری عمر قابض رہو ——— زندگی میں صرف ایک عورت ——— اور یہ دنیا اس قدر بھری ہوئی کیوں ہے؟ ——— کیوں اس میں اتنے تماشے جمع ہیں؟ ——— صرف گندم پیدا کر کے ہی اللہ میاں نے اپنا ہاتھ کیوں نہ روک لیا ——— میری سنو اور اس زندگی کو جو کہ تمھیں دی گئی ہے اچھی طرح استعمال کرو ——— تم ایسے گاہک ہو جو عورت حاصل کرنے کے لئے ساری عمر سرمایہ جمع کرتے رہو گے مگر اسے ناکافی سمجھو گے۔ میں ایسا خریدار ہوں۔ جو زندگی میں کئی عورتوں سے سودے کرے گا ——— تم ایسا عشق کرنا چاہتے ہو کہ اس کی ناکامی پر کوئی ادنیٰ درجے کا مصنف ایک کتاب لکھے جسے نرائن دت سہگل پیلے کاغذوں پر چھاپے اور دِلّی بازار میں اسے ردّی کے بھاؤ بیچے ——— میں اپنی

کتابِ حیات کے تمام اوراق دیمک بن کر چاٹ جانا چاہتا ہوں

تاکہ اس کا کوئی نشان باقی نہ رہے۔ تم محبت میں زندگی چاہتے ہو

میں زندگی میں محبت چاہتا ہوں۔" (تکلیف)

عصمت کو اگر الجھے ہوئے سوت کے ڈھیر میں سے ایسا سرا مل جاتا۔ کھینچنے پر جو کھنچتا ہی چلا آتا اور وہ اس کے سہارے دور افق سے اوپر ایک پتنگ کی طرح تن جاتی اور منٹو اگر اپنی کتابِ حیات کے آدھے اوراق بھی دیمک بن کر چاٹنے میں کامیاب ہو جاتا تو آج ادب کی لوح پر ان کے فن کے نقوش اتنے گہرے کبھی نہ ہوتے۔ وہ دور افق سے بھی اوپر ہوا میں تنی رہتی اور منٹو کے پیٹ میں اس کی کتابِ حیات کے باقی اوراق بھس بھر کے اس کے ہمدرد اسے شیشے کی الماری میں بند کر دیتے۔

"چوٹیں" کے دیباچے میں کرشن چندر لکھتا ہے:

عصمت کا نام آتے ہی مرد افسانہ نگاروں کو دورے پڑنے لگتے ہیں۔ شرمندہ ہو رہے ہیں۔ آپ ہی آپ خفیف ہوئے جا رہے ہیں۔ یہ دیباچہ بھی اسی خفت کو مٹانے کا ایک نتیجہ ہے۔"

عصمت کے متعلق جو کچھ میں لکھ رہا ہوں۔ کسی بھی قسم کی خفت مٹانے کا نتیجہ نہیں۔ ایک قرض تھا۔ جو سود کی بہت ہی ہلکی شرح کے ساتھ ادا کر رہا ہوں۔

سب سے پہلے میں نے عصمت کا کون سا افسانہ پڑھا تھا، مجھے بالکل یاد نہیں۔

یہ سطور لکھنے سے پہلے میں نے حافظے کو بہت کھرچا۔ لیکن اس نے میری رہبری نہیں کی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں عصمت کے افسانے کاغذ پر منتقل ہونے سے پہلے ہی پڑھ چکا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مجھ پر کوئی دورہ نہیں پڑا۔ لیکن جب میں نے اس کو پہلی بار دیکھا تو مجھے سخت ناامیدی ہوئی۔

اڈلفی چیمبرز کلیر روڈ بمبئی کے ۱۷ نمبر فلیٹ میں جہاں "مصوّر" ہفتہ وار کا دفتر تھا۔ شاہد لطیف اپنی بیوی کے ساتھ داخل ہوا۔ یہ اگست ۱۹۴۲ء کی بات ہے۔ تمام کانگرسی لیڈر مہاتما گاندھی سمیت گرفتار ہو چکے تھے اور شہر میں کافی گڑبڑ تھی فضا سیاسیات میں لبسی ہوئی تھی اس لئے کچھ دیر گفتگو کا موضوع تحریکِ آزادی رہا۔ اس کے بعد رخ بدلا اور افسانوں کی باتیں شروع ہوئیں۔

ایک مہینہ پہلے جب کہ میں آل انڈیا ریڈیو دہلی میں ملازم تھا۔ ادبِ لطیف میں عصمت کا "لحاف" شائع ہوا تھا۔ اسے پڑھ کر مجھے یاد ہے۔ میں نے کرشن چندر سے کہا تھا۔ "افسانہ بہت اچھا ہے۔ لیکن آخری جملہ بہت غیر صنّاعانہ ہے۔ احمد ندیم کی جگہ اگر میں ایڈیٹر ہوتا تو اسے یقیناً حذف کر دیتا۔" چنانچہ جب افسانوں پر باتیں شروع ہوئیں تو میں نے عصمت سے کہا۔ "آپ کا افسانہ لحاف مجھے بہت پسند آیا۔ بیان میں الفاظ کو بقدرِ کفایت استعمال کرنا آپ کی نمایاں خصوصیّت رہی ہے۔ لیکن مجھے تعجب ہے کہ اس افسانے کے آخر میں آپ نے بیکار سا جملہ لکھ دیا کہ ایک انچ اٹھے ہوئے لحاف میں میں نے کیا دیکھا۔ کوئی مجھے لاکھ روپیہ بھی دے تو میں کبھی

نہیں بتاؤں گی۔"

عصمت نے کہا۔ "کیا عیب ہے اس جملے میں؟"

میں جواب میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ مجھے عصمت کے چہرے پر وہی سمٹا ہوا حجاب نظر آیا جو عام گھریلو لڑکیوں کے چہرے پر ناگفتنی شئے کا نام سن کر نمودار ہوا کرتا ہے۔ مجھے سخت ناامیدی ہوئی اس لئے کہ میں "لحاف" کے تمام جزئیات کے متعلق اس سے باتیں کرنا چاہتا تھا۔ جب عصمت چلی گئی تو میں نے دل میں کہا "یہ تو کم بخت بالکل عورت نکلی۔"

مجھے یاد ہے اس ملاقات کے دوسرے ہی روز میں نے اپنی بیوی کو دہلی خط لکھا "عصمت سے ملا۔ تمھیں یہ سن کر حیرت ہوگی کہ وہ بالکل ایسی ہی عورت ہے جیسی تم ہو۔ میرا مزا تو بالکل کرکرا ہو گیا۔ لیکن تم اسے یقیناً پسند کرو گی۔ میں نے جب اس سے ایک انچ اٹھے ہوئے لحاف کا ذکر کیا تو نالائق اس کا تصوّر کرتے ہی جھینپ گئی۔"

ایک عرصے کے بعد میں نے اپنے اس پہلے ردِّ عمل پر سنجیدگی سے غور کیا اور مجھے اس امر کا شدید احساس ہوا کہ اپنے فن کی بقا کے لئے انسان کو اپنی فطرت کی حدود میں رہنا از بس لازم ہے۔ ڈاکٹر رشید جہاں کا فن آج کہاں ہے؟ کچھ تو گیسوؤں کے ساتھ کٹ کر علٰحدہ ہو گیا اور کچھ پتلون کی جیبوں میں ٹھُس ہو کر رہ گیا۔ فرانس میں جارج سان نے نسوانیت کا حسین ملبوس اتار کر تصنع کی زندگی اختیار کی۔ پولستانی

موسیقار شوپیں سے لہو تھکوا تھکوا کر اس نے لعل و گہر ضرور پیدا کرائے۔ لیکن اس کا اپنا جوہر اس کے بطن میں دم گھٹ کے مر گیا۔

میں نے سوچا عورت جنگ کے میدانوں میں مردوں کے دوش بدوش لڑے، پہاڑ کاٹے۔ افسانہ نگاری کرتے کرتے عصمت چغتائی بن جائے۔ لیکن اس کے ہاتھوں میں کبھی کبھی مہندی رچنی ہی چاہیے۔ اس کی باہنوں سے چوڑی کی کھنک آنی ہی چاہیئے مجھے افسوس ہے جو میں نے اس وقت اپنے دل میں کہا "یہ تو کم بخت بالکل عورت نکلی!"

عصمت اگر بالکل عورت نہ ہوتی تو اس کے مجموعوں میں بھول بھلیاں، تل، لحاف اور گیندا جیسے نازک اور ملائم افسانے کبھی نظر نہ آتے۔ یہ افسانے عورت کی مختلف ادائیں ہیں۔ صاف، شفاف، ہر قسم کے تصنع سے پاک۔ یہ ادائیں، وہ عشوے، وہ غمزے نہیں جن کو تیر بنا کر مردوں کے دل اور کلیجے چھلنی کیے جاتے ہیں۔ جسم کی بھونڈی حرکتوں سے ان اداؤں کا کوئی تعلق نہیں۔ ان روحانی اشاروں کی منزلِ مقصود انسان کا ضمیر ہے۔ جس کے ساتھ وہ عورت ہی کی ان جانی — ان بوجھی مگر مخملیں فطرت لیے بغل گیر ہو جاتے ہیں۔

ان کی رنگت بدلی "بیچارا بچہ — مر گیا اس کا باپ شاید"۔

"خاک تمہارے منہ میں، خدا نہ کرے"۔ میں نے ننھے کو کلیجے سے لگا لیا

"ٹھائیں" ننھےّ نے موقعہ پا کر بندوق چلائی۔

"ہائیں پاجی — ابّا کو مارتا ہے"۔ میں نے بندوق چھین لی۔

(بھول بھلیاں)

اور لوگ کہتے ہیں عصمت ناشدنی ہے، چڑیل ہے ــــ گدھے کہیں کے۔ ان چار سطروں میں عصمت نے عورت کی روح نچوڑ کر رکھ دی ہے اور یہ لوگ اسے اخلاق کی امتحانی نلکیوں میں بیٹھے ہلا ہلا کر دیکھ رہے ہیں۔ توپ دم کر دینا چاہیے ایسی اوندھی کھوپڑیوں کو۔

"ساقی" میں "دوزخی" چھپا۔ میری بہن نے پڑھا اور مجھ سے کہا "سعادت! یہ عصمت کتنی بے ہودہ ہے۔ اپنے موئے بھائی کو بھی نہیں چھوڑا کم بخت نے۔ کیسی کیسی فضول باتیں لکھی ہیں۔"

میں نے کہا "اقبال اگر میری موت پر تم ایسا ہی مضمون لکھنے کا وعدہ کرو۔ تو خدا کی قسم میں آج مرنے کے لئے تیار ہوں۔"

شاہجہان نے اپنی محبوبہ کی یاد قائم رکھنے کے لئے تاج محل بنوایا۔ عصمت نے اپنے محبوب بھائی کی یاد میں "دوزخی" لکھا۔ شاہجہان نے دوسروں سے پتھر اٹھوائے۔ انھیں ترشوایا اور اپنی محبوبہ کی لاش پہ عظیم الشان عمارت تعمیر کرائی۔ عصمت نے خود اپنے ہاتھوں سے اپنے خواہرانہ جذبات چن چن کر ایک اونچا مچان تیار کیا اور اس پر نرم نرم ہاتھوں سے اپنے بھائی کی نعش رکھدی۔ تاج شاہ جہان کی محبّت کا برہنہ مرمریں اشتہار معلوم ہوتا ہے۔ لیکن "دوزخی" عصمت کی محبت کا نہایت ہی لطیف اور حسین اشارہ ہے۔ وہ جنّت جو اس مضمون میں آباد ہے، عنوان اس کا اشتہار نہیں دیتا۔

میری بیوی نے یہ مضمون پڑھا تو عصمت سے کہا "یہ تم نے کیا خرافات لکھی ہے"

"بکو نہیں ــــــ لاؤ وہ برف کہاں ہے؟"

عصمت کو برف کھانے کا بہت شوق ہے، بالکل بچوں کی طرح ڈلی ہاتھ میں لیئے دانتوں سے کٹا کٹ کاٹتی رہتی ہے۔ اس نے اپنے بعض افسانے بھی برف کھا کھا کر لکھے ہیں۔ چارپائی پر کہنیوں کے بل اوندھی لیٹی ہے۔ سامنے تکیے پر کاپی کھلی ہے ایک ہاتھ میں فاؤنٹن پن ہے اور دوسرے ہاتھ میں برف کی ڈلی۔ ریڈیو اونچے سروں میں چلاّ رہا ہے۔ مگر اس کا قلم اور منہ دونوں کھٹا کھٹ چل رہے ہیں۔

عصمت پر لکھنے کے دورے پڑتے ہیں۔ نہ لکھے تو مہینوں گذر جاتے ہیں۔ پر جب دورہ پڑے تو سیکڑوں صفحے اس کے قلم کے نیچے سے نکل جاتے ہیں۔ کھانے پینے، نہانے دھونے کا کوئی ہوش نہیں رہتا۔ بس ہر وقت چارپائی پر کہنیوں کے بل اوندھی لیٹی اپنے ٹیڑھے میڑھے اعراب اور املا سے بے نیاز خط میں کاغذوں پر اپنے خیالات منتقل کرتی رہتی ہے۔

"ٹیڑھی لکیر جیسا طول طویل ناول میرا خیال ہے عصمت نے سات آٹھ نشستوں میں ختم کیا تھا۔

کرشن چندر عصمت کے بیان کی رفتار کے متعلق لکھتا ہے:

افسانوں کے مطالعہ سے ایک اور بات جو ذہن میں آتی ہے وہ ہے گھوڑ دوڑ۔ یعنی رفتار، حرکت، سبک خرامی (میرا خیال ہے اس سے کرشن چندر کی مراد برق رفتاری تھی) اور

تیز گامی۔ نہ صرف افسانہ دوڑتا ہوا معلوم ہوتا ہے بلکہ فقرے
کنائے اور اشارے اور آوازیں اور رکھ رکھاؤ اور جذبات
اور احساسات ایک طوفان کی سی بلاخیزی کے ساتھ
چلتے اور آگے بڑھتے نظر آتے ہیں۔

عصمت کا قلم اور اس کی زبان دونوں بہت تیز ہیں۔ لکھنا شروع کرے گی تو کئی مرتبہ اس کا دماغ آگے نکل جائے گا اور الفاظ بہت پیچھے ہانپتے رہ جائیں گے۔ باتیں کرے گی تو لفظ ایک دوسرے پر چڑھتے جائیں گے۔ یخنی بگھارنے کی خاطر اگر کبھی باورچی خانے میں چلی جائے گی تو معاملہ بالکل چوپٹ ہو جائے گا۔ طبیعت میں چونکہ بہت ہی عجلت ہے اس لئے آٹے کا پیڑا بناتے ہی سنکی سنگاڑی روٹی کی شکل دیکھنا شروع کر دیتی ہے۔ آلو ابھی چھیلے نہیں گئے لیکن ان کا سالن اس کے دماغ میں پہلے ہی تیار ہو جاتا ہے اور میرا خیال ہے بعض اوقات وہ باورچی خانے میں قدم رکھ کر خیال ہی خیال میں شکم سیر ہو کر لوٹ آتی ہو گی ــــ لیکن اس حد سے بڑھی ہوئی عجلت کے مقابلے میں اس کو میں نے بڑے ٹھنڈے اطمینان اور سکون کے ساتھ اپنی بچی کے فراک سیتے دیکھا ہے۔ اس کا قلم لکھتے وقت اِملا کی غلطیاں کر جاتا ہے لیکن ننھی کے فراک سیتے وقت اس کی سوئی سے ہلکی سی لغزش بھی نہیں ہوتی۔ نپے تلے ٹانکے ہوتے ہیں اور مجال ہے جو کہیں جھول ہو۔

"اُف رے بچے" میں عصمت لکھتی ہے:

"گھر کیا ہے محلّے کا محلّہ ہے۔ مرض پھیلے وبا آئے۔ دنیا کے بچے پٹاپٹ مریں مگر کیا مجال جو یہاں ایک بھی ٹس سے مس ہو جائے۔ ہر سال ماشاء اللہ گھر ہسپتال بن جاتا ہے ——— سنتے ہیں دنیا میں بچے بھی مرا کرتے ہیں۔ مرتے ہوں گے۔ کیا خبر؟"

اور پچھلے دنوں بمبئی میں۔ جب اس کی بچی سیما کو کالی کھانسی ہوئی تو وہ راتیں جاگتی تھی، ہر وقت کھوئی کھوئی رہتی تھی۔ ممتا ماں بننے کے ساتھ ہی کوکھ سے باہر نکلتی ہے۔

عصمت پرلے درجے کی ہٹ دھرم ہے۔ طبیعت میں ضد ہے بالکل بچوں کی سی، زندگی کے کسی نظریے کو، فطرت کے کسی قانون کو پہلے ہی سابقہ میں کبھی قبول نہیں کرے گی۔ پہلے شادی سے انکار کرتی رہی۔ جب آمادہ ہوئی تو بیوی بننے سے انکار کر دیا۔ بیوی بننے پر جوں توں رضامند ہوئی تو ماں بننے سے منکر ہو گئی۔ تکلیفیں اٹھائے گی۔ صعوبتیں برداشت کرے گی مگر ضد سے کبھی باز نہیں آئے گی۔ میں سمجھتا ہوں یہ بھی اُس کا ایک طریقہ ہے جس کے ذریعے سے وہ زندگی کے حقائق سے دوچار ہو کر بلکہ ٹکرا کر اُن کو سمجھنے کی کوشش کرتی ہے ——— اُس کی ہر بات نرالی ہے۔

عصمت کے زنانہ اور مردانہ کرداروں میں بھی یہ عجیب و غریب ضد یا انکار عام پایا جاتا ہے۔ محبت میں بری طرح مبتلا ہیں۔ لیکن نفرت کا اظہار کئے چلے جا رہے ہیں۔ جی گال چومنے کو چاہتا ہے۔ لیکن اس میں سوئی کھبو دیں گے۔ ہولے سے تھپکانا ہوگا تو ایسی دھول جمائیں گے کہ دوسرا بلبلا اٹھے۔ یہ جارحانہ قسم کی منفی محبت جو محض ایک کھیل کی صورت میں شروع ہوتی ہے، عام طور پر عصمت کے افسانوں میں ایک نہایت رحم انگیز صورت میں انجام پذیر ہوتی ہے۔

عصمت کا اپنا انجام بھی اگر کچھ اسی طور پر ہوا اور میں اسے دیکھنے کے لئے زندہ رہا تو مجھے کوئی تعجب نہ ہوگا۔

عصمت سے ملتے جلتے مجھے پانچ چھ برس ہو گئے ہیں۔ دونوں کی آتش گیر اور بھک سے اڑ جانے والی طبیعت کے پیشِ نظر احتمال تو اسی بات کا تھا کہ سیکڑوں لڑائیاں ہوتیں مگر تعجب ہے کہ اس دوران میں صرف ایک بار چخ ہوئی اور وہ بھی ہلکی سی۔

شاہد اور عصمت کے مدعو کرنے پر میں اور میری بیوی صفیہ دونوں ملاڈ (بمبئی کے مضافات میں ایک جگہ جہاں شاہد بمبئی ٹاکیز کی ملازمت کے دوران میں مقیم تھا) گئے ہوئے تھے۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد باتوں باتوں میں شاہد نے کہا۔

"منٹو تم سے اب بھی زبان کی غلطیاں ہو جاتی ہیں۔"

ڈیڑھ بجے تک میں نے تسلیم نہ کیا کہ میری تحریر میں زبان کی غلطیاں ہوتی ہیں۔

شاہد تھک گیا۔ دو بجے تک عصمت نے اپنے شوہر کی پیروی کی۔ میں پھر بھی نہ مانا۔ دفعتاً کوئی بات کہتے ہوئے عصمت نے لفظ "دست درازی" استعمال کیا میں نے جھٹ سے کہا۔ "صحیح لفظ دراز دستی ہے"۔ تین بج گئے، عصمت نے اپنی غلطی تسلیم نہ کی۔ میری بیوی سو گئی۔ شاہد قصّہ ختم کرنے کے لئے دوسرے کمرے سے لغت اٹھا لایا۔ "د" کی تختی میں لفظ دست درازی موجود ہی نہیں تھا۔ البتہ دراز دستی اور اس کے معنی درج تھے۔ شاہد نے کہا۔ "عصمت اب تمھیں ماننا پڑے گا"۔ اب میاں بیوی میں چخ شروع ہو گئی۔ مرغ اذانیں دینے لگا۔ عصمت نے لغت اٹھا کر ایک طرف پھینکی اور کہا۔ "جب میں لغت بناؤں گی تو اُس میں صحیح لفظ دست درازی ہو گا۔ یہ کیا ہُوا دراز دستی —— دراز دستی"۔

کج بحثی کا یہ سلسلۂ دراز بہر حال ختم ہُوا۔ اس کے بعد ہم ایک دوسرے سے کبھی نہیں لڑے بلکہ یوں کہیے کہ ہم نے اس کا کبھی موقعہ ہی نہیں آنے دیا۔ گفتگو کرتے کرتے جب بھی کوئی خطرناک موڑ آیا یا تو عصمت نے رخ بدل لیا یا میں راستہ کاٹ کے ایک طرف ہو گیا۔

عصمت کو میں پسند کرتا ہوں، وہ مجھے پسند کرتی ہے۔ لیکن اگر کوئی دفعتہً پوچھ بیٹھے۔ "تم دونوں ایک دوسرے کی کیا چیز پسند کرتے ہو"۔ تو میرا خیال ہے کہ میں اور عصمت دونو کچھ عرصے کے لئے بالکل خالی الذہن ہو جائیں۔

عصمت کی شکل و صورت دلفریب نہیں لیکن دل نشین ضرور ہے۔ اس سے پہلی ملاقات کے نقش ابھی تک مرے دل و دماغ میں محفوظ ہیں۔ بہت ہی سادہ لباس میں تھی۔ چھوٹی کنّی کی سفید دھوتی۔ سفید زمین کا کالی کھڑی لکیروں والا، چست بلاؤز۔ ہاتھ میں چھوٹا پرس۔ پاؤں میں بغیر ایڑھی کا براؤن چپل۔ چھوٹی چھوٹی مگر تیز اور متجسس آنکھوں پر موٹے موٹے شیشوں والی عینک۔ چھوٹے مگر گھنگھریالے بال ــــ ٹیڑھی مانگ۔ ذرا سا مسکرانے پر بھی گالوں میں گڑھے پڑ پڑ جاتے تھے۔

میں عصمت پر عاشق نہ ہوا لیکن میری بیوی اس کی محبت میں گرفتار ہو گئی۔ عصمت سے اگر صفیہ اس کا ذکر کرے تو وہ ضرور کچھ یوں کہے گی۔ "بڑی آئی ہو میری محبت میں گرفتار ہونے والی ــــ تمہاری عمر کی لڑکیوں کے باپ تک قید ہوتے رہے ہیں میری محبت میں۔"

ایک بزرگوار اہلِ قلم کو تو میں بھی جانتا ہوں۔ جو بہت دیر تک عصمت کے پریم پجاری رہے۔ خط و کتابت کے ذریعے سے آپ نے عشق فرمانا شروع کیا۔ عصمت شروع میں دلچسپی لیتی رہی۔ لیکن آخر میں ایسا اڑنگا دیا کہ ثریّا ہی دکھا دی غریب کو۔ یہ سچی کہانی میرا خیال ہے وہ کبھی قلم بند نہیں کریں گے۔

باہم متصادم ہو جانے کے خوف سے میرے اور عصمت کے درمیان بہت ہی کم باتیں ہوتی تھیں۔ میرا افسانہ کبھی شائع ہو تو پڑھ کر داد دے دیا کرتی تھی۔ "نیلم" کی اشاعت پر اس نے غیر معمولی جوش و خروش سے اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا۔ "واقعی یہ بہن بنانا کیا ہے ــــ آپ نے بالکل ٹھیک کہا ہے کسی عورت کو بہن کہنا۔ اس کی توہین ہے۔"

اور میں سوچتا رہ گیا ـــــ وہ مجھے منٹو بھائی کہتی ہے اور میں اسے عصمت بہن کہتا ہوں ـــــ دونوں کو خدا سمجھے!

ہماری پانچ چھ برس کی دوستی کے زمانے کا ایسا کوئی واقعہ نہیں جو قابلِ ذکر ہو۔ فحاشی کے الزام میں ایک بار ہم دونو گرفتار ہوئے۔ مجھے تو پہلے دو دفعہ تجربہ ہو چکا تھا لیکن عصمت کا پہلا موقعہ تھا۔ اس لیے بہت بھنّائی۔ اتفاق سے گرفتاری غیر قانونی نکلی۔ کیونکہ پنجاب پولس نے ہمیں بغیر وارنٹ پکڑ لیا تھا۔ عصمت بہت خوش ہوئی۔ لیکن بکرے کی ماں کب تک خیر مناتی۔ آخر اسے لاہور کی عدالت میں حاضر ہونا ہی پڑا۔

بمبئی سے لاہور تک کافی لمبا سفر ہے لیکن شاہد اور میری بیوی ساتھ تھے۔ سارا وقت خوب ہنگامہ رہا۔ صفیہ اور شاہد ایک طرف ہو گئے اور چڑانے کی خاطر ہم دونو کی فحش نگاری پر حملے کرتے رہے۔ قید کی صعوبتوں کا نقشہ کھینچا جیل کی زندگی کی جھلکیاں دکھائیں۔ عصمت نے آخر میں جھلا کر کہا۔ "سولی پر بھی چڑھا دیں لیکن یہاں حلق سے انا الحق ہی نکلے گا۔"

اس مقدمے کے سلسلے میں ہم دو دفعہ لاہور گئے۔ دونوں مرتبہ کالجوں کے تماشائی طالب علم مجھے اور عصمت کو دیکھنے کے لئے ٹولیاں باندھ باندھ کر عدالت میں آتے رہے۔ عصمت نے مجھ سے کہا۔ "منٹو بھائی، چودھری نذیر سے کہئے کہ ٹکٹ لگا دے کہ یہاں آنے جانے کا کرایہ ہی نکل آئے گا۔"

ہم دو دفعہ لاہور گئے اور دو ہی دفعہ ہم دونوں نے کرنال شاپ سے مختلف ڈیزائنوں کے دس دس بارہ بارہ جوڑے سینڈلوں اور جوتیوں کے خریدے۔ بمبئی میں کسی نے عصمت سے پوچھا۔ "لاہور آپ کیا مقدمے کے سلسلے میں گئے تھے؟"
عصمت نے جواب دیا۔ "جی نہیں، جوتے خریدنے گئے تھے۔"

غالباً ساڑھے تین برس پہلے کی بات ہے۔ ہولی کا تہوار تھا۔ ملاڈ میں شاہد اور میں بالکنی میں بیٹھے پی رہے تھے۔ عصمت میری بیوی کو اکسا رہی تھی۔ "صفیہ یہ لوگ اتنا روپیہ اڑائیں، ہم کیوں نہ اس عیش میں شریک ہوں" —— دونوں ایک گھنٹے تک دل کڑا کرتی رہیں۔ اتنے میں ایک دم ہلڑ سا مچا اور فلمستان سے پروڈیوسر مکرجی، ان کی بھاری بھرکم بیوی اور دوسرے لوگ ہم پر حملہ آور ہو گئے۔ چند منٹوں ہی میں ہم کا حلیہ ناقابلِ شناخت تھا۔ عصمت کی توجہ وسکی سے ہٹی اور رنگ پر مرکوز ہو گئی۔ "آؤ صفیہ ہم بھی ان کے رنگ لگائیں۔"

ہم سب بازار میں نکل آئے۔ چنانچہ گھوڑ بندر روڈ پر باقاعدہ ہولی شروع ہو گئی۔ نیلے پیلے سبز اور کالے رنگوں کا چھڑکاؤ سا شروع ہو گیا۔ عصمت پیش پیش تھی۔ ایک موٹی بنگالن کے چہرے پر تو اس نے تار کول کا لیپ کر دیا۔ اس وقت مجھے اس کے بھائی عظیم بیگ چغتائی کا خیال آیا۔ ایک دم عصمت نے جرنیلوں کے سے انداز میں کہا۔ "آؤ، پری چہرہ کے گھر پہ دھاوا بولیں۔"

اُن دنوں نسیم بانو ہمارے فلم "چل چل رے نوجوان" میں کام کر رہی تھی۔

اس کا بنگلہ پاس ہی گھوڑ بندر روڈ پر تھا۔ عصمت کی تجویز سب کو پسند آئی چنانچہ چند منٹوں میں ہم سب بنگلے کے اندر تھے۔ نسیم حسبِ عادت پورے میک اپ میں تھی اور نہایت نفیس ریشمی جارجٹ کی ساڑھی میں ملبوس تھی۔ وہ اور اس کا خاوند احسان ہمارا شور سن کر باہر نکلے۔ عصمت نے جو رنگوں میں لتھڑی ہوئی بھتنی سی لگتی تھی۔ میری بیوی سے جس پر مزید رنگ لگانے سے میرا خیال ہے کوئی فرق نہ پڑتا، نسیم کی تعریف کرتے ہوئے کہا "صفیہ، نسیم واقعی حسین عورت ہے۔"

میں نے نسیم کی طرف دیکھا اور کہا "حسن ہے لیکن بہت ٹھنڈا۔"

عینک کے رنگ آلود شیشوں کے پیچھے عصمت کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں گھومیں اور اُس نے آہستہ سے کہا۔ "صفراوی طبیعتوں کے لئے ٹھنڈی چیزیں مفید ہوتی ہیں۔"

یہ کہہ کر وہ آگے بڑھی اور ایک سکنڈ کے بعد پری چہرہ نسیم سرکس کا مسخرہ بنی تھی۔

عصمت اور میں بعض اوقات عجیب عجیب باتیں سوچا کرتے ہیں "منٹو بھائی جی چاہتا ہے، اب مرغ اور مرغیوں کے رومانس کے متعلق کچھ لکھوں" یا "میں تو فوج میں بھرتی ہو جاؤں گی اور ہوائی جہاز اڑانا سیکھوں گی۔"

چند مہینوں کی بات ہے۔ میں اور عصمت بمبئی ٹاکیز سے واپس الیکٹرک ٹرین میں گھر جا رہے تھے۔ میں نے باتوں باتوں میں اس سے کہا "کرشن چندر

کے افسانوں میں دو چیزیں میں نے عام دیکھی ہیں — زنا بالجبر اور قوسِ قزح جسے وہ قوس و قزح لکھتا ہے۔" عصمت نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا "یہ تو ہے"

"سوچتا ہوں ایک مضمون لکھوں۔ جس کا عنوان "کرشن چندر، قوسِ قزح اور زنا بالجبر" ہو"۔ میں ساتھ ہی ساتھ سوچ رہا تھا۔ "لیکن زنا بالجبر سے قوسِ قزح کا نفسیاتی رشتہ کیا ہو سکتا ہے؟"

عصمت نے کچھ دیر غور کرنے کے بعد کہا۔ "جمالیاتی نقطۂ نظر سے قوسِ قزح کے رنگوں میں انتہائی جاذبیت اور کشش — لیکن آپ تو کسی اور زاویے سے سوچ رہے تھے"۔

"جی ہاں — سُرخ رنگ آگ اور خون کا رنگ ہے۔ صنمیات میں اس رنگ کو مریخ یعنی جلّادِ فلک سے منسوب کیا جاتا ہے — ہو سکتا ہے کہ زنا بالجبر سے قوسِ قزح کے صرف اسی رنگ کا دامن بندھا ہو"

"ہو سکتا ہے — آپ یہ مضمون ضرور لکھئے۔"

"لیکن عیسائیوں کے فنِ مصوری میں سرخ رنگ عشقِ الٰہی کا مظہر ہے۔ ...... نہیں نہیں"۔ میرے دماغ میں دفعتاً ایک خلیہ پھوٹا۔ "صلیب پر چڑھنے کے شدید جذبے کو بھی اسی رنگ سے معنون کیا گیا ہے۔ اور کنواری مریم کا لباس سرخ ہوتا ہے — یہ عصمت کی نشانی ہے ......"

یہ کہتے کہتے میں نے اچانک عصمت کے سفید لباس کی طرف دیکھا وہ مسکرا دی

"منٹو بھائی آپ یہ مضمون ضرور لکھیے، مزا آجائے گا ـــــ لیکن عنوان میں سے بالجبر اڑا دیجیے۔"

"کرشن کو اعتراض ہوگا۔ کیونکہ وہ جبریہ فعل سمجھ کر ہی تو روتا ہے۔"

"بیکار روتا ہے۔ کیا معلوم کہ یہ ظلم ہی اس کی مظلوم ہیروئنوں کی اچھا لگا ہو۔"

اللہ بہتر جانتا ہے!

عصمت کی افسانہ نگاری پر کافی مضمون لکھے گئے ہیں۔ حق میں کم، خلاف کچھ تو بالکل مجذوب کی بڑ ہیں۔ چند ایسے ہیں جن میں زمین آسمان کے قلابے ملائے گئے ہیں۔

پطرس صاحب نے بھی جن کو لاہور کے ادبی ٹھیکہ داروں نے ڈبیا میں بند کر رکھا تھا اپنا ہاتھ باہر نکالا اور قلم پکڑ کر عصمت پر ایک مضمون لکھ دیا۔ آدمی ذہین ہیں، طبیعت میں شوخی اور مزاح ہے اس لیے مضمون کافی دلچسپ اور سلجھا ہوا ہے۔ آپ عورت کے لیبل کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

ایک مقتدر ریختہ کار دیباچہ نویس (آپ کی مراد صلاح الدین صاحب سے ہے) نے بھی معلوم ہوتا ہے انشا پردازوں کے ریوڑ میں نر اور مادہ الگ الگ کر رکھے ہیں عصمت کے متعلق فرماتے ہیں کہ جنس کے اعتبار سے اردو میں کم و بیش

انھیں بھی وہی رتبہ حاصل ہے جو ایک زمانے میں انگریزی ادب میں جارج ایلیٹ کو نصیب ہوا، گویا ادب کوئی ٹینس ٹورنامنٹ ہے جس میں عورتوں اور مردوں کے میچ علٰحدہ ہوتے ہیں۔

"جارج ایلیٹ کا رتبہ مسلّم۔ لیکن یوں اس کا نام لے دینے سے تُنک ہی ملا اور بوجھوں تو کوئی کیا مرے گا۔ اب یہ امر ایک علٰحدہ بحث کا محتاج ہے کہ کیا کوئی مابہ الامتیاز ایسا ہے۔ جو خارجی اور ہنگامی اور اتفاقی نہیں بلکہ داخلی اور جبلّی اور بنیادی، جو انشاپرداز عورتوں کے ادب کو انشاپرداز مردوں کے ادب سے ممیز کرتا ہے اور اگر ہے تو وہ کیا ہے؟ ان سوالوں کا جواب کچھ ہو بہر حال اس نوع کا ہرگز نہیں کہ اس کی بنیاد پر مصنفین کو "جنس کے اعتبار سے" الگ الگ دو قطاروں میں کھڑا کر دیا جائے۔"

ان سوالوں کا جواب بہت ممکن ہے ایسا نہ ہو جس کی بنیاد پر مصنفین کو جنس کے اعتبار سے دو قطاروں میں کھڑا کر دیا جائے۔ لیکن جواب دیتے وقت لوگ یہ ضرور سوچیں گے کہ سوال کرنے والا کون ہے ـــــ مرد یا عورت؟ ـــــ کیونکہ صنف معلوم ہونے پر سوال کرنے والے کا جبلّی اور بنیادی زاویۂ نگاہ

بہت حد تک واضح ہو جائے گا۔

پطرس صاحب کا یہ کہنا کہ "گویا ادب بھی کوئی ٹینس ٹورنامنٹ ہے جس میں عورتوں اور مردوں کے میچ علٰحدہ ہوتے ہیں" ٹھیٹ پطرسی فقرے بازی ہے۔ ٹینس ٹورنامنٹ ادب نہیں۔ لیکن عورتوں اور مردوں کے میچ علٰحدہ ہونا بے ادبی بھی نہیں۔

پطرس صاحب کلاس میں لکچر دیتے ہیں تو طلبہ اور طالبات سے ان کا خطاب جداگانہ نہیں ہوتا۔ لیکن جب انھیں کسی شاگرد لڑکے یا شاگرد لڑکی کے دماغی نشو و نما پر غور کرنا پڑے گا تو ماہرِ تعلیم ہونے کی حیثیت میں وہ انکی جنس سے غافل نہیں ہو جائیں گے۔

عورت اگر جارج ایلیٹ یا عصمت چغتائی بن جائے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کے ادب پر اس کے عورت ہونے کے اثر کی طرف غور نہ کیا جائے ہیجڑے کے ادب کے متعلّق بھی کیا پطرس صاحب یہی استفسار فرمائیں گے۔ کہ کیا کوئی مابہ الامتیاز ایسا ہے۔ داخلی اور جبلّی اور بنیادی جو انشا پرداز ہیجڑوں کے ادب کو انشا پرداز مردوں اور عورتوں کے ادب سے ممیز کرتا ہے۔

میں عورت پر عورت اور مرد پر مرد کے نام کا لیبل لگانا بھونڈے پن کی دلیل سمجھتا ہوں۔ مسجدوں اور مندروں پہ یہ بورڈ لگانا کہ یہ عبادت اور بندگی کی جگہیں ہیں بہت ہی مضحکہ خیز ہے۔ لیکن جب کسی مسجد اور مندر کے مقابلے میں

کسی عام رہائش گاہ کو رکھ کر ہم فنِ تعمیر کا جائزہ لیں گے۔ تو اس پر مندر اور مسجد کی تقدیس کا اثر اپنے ذہن سے محو نہیں کر دیں گے۔

عصمت کے عورت ہونے کا اثر اس کے ادب کے ہر ہر نقطے میں موجود ہے۔ جو اس کو سمجھنے میں ہر ہر قدم پر ہماری رہبری کرتا ہے۔ اس کے ادب کی خوبیوں اور کمیوں سے جن کو پطرس صاحب نے اپنے مضمون میں غیر جانبداری سے بیان کیا ہے، ہم مصنّف کی جنس سے علٰحدہ نہیں کر سکتے اور نہ ایسا کرنے کے لئے کوئی تنقیدی، ادبی یا کیمیائی طریقہ ہی موجود ہے۔

عزیز احمد صاحب "نیا دور" میں عصمت کی "ٹیڑھی لکیر" پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"جسم کے احتساب کا عصمت کے پاس ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ ہے مساس۔ چنانچہ رشید سے لیکر ٹیلر تک بیسیوں مرد جو اس ناول میں آتے ہیں سب کا اندازہ جسمی یا ذہنی مساس سے کیا گیا ہے۔ زیادہ تر مساس کی کیفیت انفعالی ہی ہوتی ہے مساس ہی عصمت کے یہاں احتساب مرد، احتسابِ انسان احتسابِ زندگی، احتسابِ کائنات کا واحد ذریعہ ہے — رضائیوں کے بادلوں میں عبّاس کے ہاتھ بجلیوں کی طرح کوندتے ہیں اور لڑکیوں کے گروہ میں ننھی ننھی لرزشیں مچل مچل

کہ بکھر جاتی ہیں۔ رسول فاطمہ کے چوہے جیسے ہاتھ مساس کا تاریک رخ ہیں۔ نیم تاریک رخ میٹرن کا وہ منافرہ یا معاشقہ ہے۔ جس میں میٹرن کو تعجب تھا کہ ذہن میں لڑکیاں ان غنڈوں کی آنکھیں اپنی رانوں پر رینگتی ہوئی محسوس نہیں کرتیں۔ مساس کے سلسلے میں شمّن کا نسوانی احساس، (پطرس صاحب متوجہ ہوں) ران کی انگلیوں کی سرسراہٹ محسوس کرتا ہے۔ الخ"

عزیز احمد صاحب کا یہ نظریہ غلط ہے کہ عصمت کے یہاں احتساب کا ذریعہ ایک فقط مساس ہی ہے۔ اوّل تو مساس کہنا ہی غلط ہے۔ اس لئے کہ یہ ایک ایسا عمل یا فعل ہے جو کچھ دیر جاری رہتا ہے۔ عصمت تو غایت درجہ ذکی الحس ہے۔ ہلکا سا لمس ہی اس کے لئے کافی ہے۔ عصمت کے یہاں آپ کو دوسری جسمانی حسیں بھی محوِ عمل نظر آتی ہیں۔ مثال کے طور پر سونگھنے اور سننے کی حس۔ صوت کا تو جہاں تک میں سمجھتا ہوں عصمت کے ادب سے بہت ہی گہرا تعلق ہے۔

"گھر گھر۔ پھٹ شوں۔ فش"۔ باہر برآمدے میں موٹر بھنا رہی تھی"۔

"ریڈیو کو مروڑتے رہے۔ گھڑگھڑ، شڑ شڑ، گھر گھر"۔ میرے آنسو نکل آئے"۔

"ٹنن ٹنن۔ سائیکل کی گھنٹی بجی، میں سمجھ گئی، ایڈنا آ گئی، (پکچر)

"اور جو ذرا اونگھنے کی کوشش کی تو دھما دھم مکوں کی آواز چھت پر آئی"۔

"اور دھم دھم۔ چھن چھن کرتی بھو سیڑھیوں پر سے اتری"۔

"غُن غُن، غُن غُن۔ بھو منمنائی۔"

"مکھّی۔ تنن تنن کرکے وہ گئی۔" (ساس)

"بچّہ کوں کوں کرکے چپڑ چپڑ منہ مارنے لگتا۔" (سفر میں)

"بلّی کی طرح سپڑ سپڑ رکابی چاٹنے جیسی آوازیں آنے لگیں۔" (لحاف)

"ٹک ٹاک ٹک ٹک۔ گھڑی کی طرح اس کا دل ہلنے لگا۔"

"موٹے موٹے قہقہے لگاتے ہوئے مچھر۔" (تل)

"ایک پراسرار قبرستانی سسکی ہواہیں لرزتی ہے۔" (جھری میں سے)

"گھنگھروؤں کی جھنکار اور تالیوں کی آوازیں ایک بارگی میرے جسم میں رینگ کر ہزاروں نبضوں کی طرح پھڑپھڑانے لگیں۔" (پیشہ)

اسی طرح سونگھنے کی حِس بھی جگہ جگہ مصروفِ عمل ہے۔

"اور بُو تو دیکھو، حقّے کی سڑاند ہے۔ توبہ، بھُو۔"

"قوام کی بُو ایسی بس گئی تھی کہ اسے نیند نہ آئی۔" (ڈائن)

"سرسوں کا تیل آٹھویں دن ہی کھٹّی کھٹّی بُو دینے لگتا۔" (نیرا)

"اور جسم سے عجیب گھبرانے والی بُو کے شرارے نکلتے تھے۔"

"گرم گرم خوشبوؤں کے عطر نے اور بھی انھیں انگارہ بنا دیا۔"

"میں نے نتھنے پھلا کر "سوں سوں" ہوا کو سونگھا۔ سوائے عطر صندل اور حنا کی گرم گرم خوشبو کے اور کچھ محسوس نہ ہوا۔" (لحاف)

"سرد آہوں اور بھینی خوشبو تک کو رنگ میں سمو کر دکھا دیا تھا۔" (تل)

"پسینے سے گل چکے تھے اور ان میں مرگھٹ جیسی چرائند آنے لگی تھی۔" (جال)

"مردانہ قمیص۔ سگرٹ کی بو میں غرق ملگجی سی۔" (ہیرو)

"نیچے کیاریوں میں سے دھنیے کی ننھی ننھی پتیاں توڑ کر سونگھنے لگی۔" (میرا بچہ)

عصمت کی سب حسین وقت پڑنے پڑنے پر اپنی اپنی جگہ کام کرتی ہیں اور ٹھیک طور سے کرتی ہیں۔ عزیز احمد صاحب کا یہ کہنا کہ جنس ایک مرض کی طرح عصمت کے اعصاب پر چھائی ہوئی ہے۔ ممکن ہے ان کی تشخیص کے مطابق درست ہو۔ مگر وہ اس مرض کے لئے نسخے تجویز نہ فرمایا یوں تو لکھنا بھی ایک مرض ہے۔ کامل طور پر صحت مند آدمی جس کا درجۂ حرارت ہمیشہ ساڑھے اٹھانوے ہی رہے۔ ساری عمر اپنی زندگی کی ٹھنڈی سلیٹ ہاتھ میں لئے بیٹھا رہے گا۔

عزیز احمد صاحب لکھتے ہیں :-

عصمت کی ہیروئن کی سب سے بڑی ٹریجڈی یہ ہے کہ دل سے نہ اسے کسی مرد نے چاہا اور نہ اُس نے کسی مرد کو۔ عشق ایک ایسی چیز ہے جس کا جسم سے

وہی تعلق ہے جو بجلی کا تار سے ہے۔ لیکن کھٹکا دبا دو تو یہی
عشق ہزاروں قندیلوں کے برابر روشنی کرتا ہے۔ دوپہر کی
جھلسنی لو میں پنکھا جھلتا ہے۔ ہزاروں دیووں کی طاقت
سے زندگی کی عظیم الشان مشینوں کے پہیے گھماتا ہے اور
کبھی کبھی زلفوں کو سنوارتا اور کپڑوں پر استری کرتا ہے۔
ایسے عشق سے عصمت چغتائی بحیثیتِ مصنّفہ واقف نہیں۔

ظاہر ہے کہ عزیز احمد صاحب کو اس کا افسوس ہے —— مگر یہ عشق جس سے عزیز احمد صاحب واقف معلوم ہوتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ انھوں نے پنج سالہ اسکیموں کے ماتحت تیار کیا ہے اور اب وہ اسے ہر انسان پر عائد کر دینا چاہتے ہیں —— عزیز احمد صاحب کو خوش کرنے کے لیے میں فرض کر لیتا ہوں کہ عصمت کی ہیروئن اس عشق کے اے سی اور ڈی سی دونوں کرنٹوں سے واقف تھی۔ لیکن پھر یہ ٹریجڈی کیسے وقوع پذیر ہوتی کہ دل سے نہ اسے کسی مرد نے چاہا اور نہ اس نے کسی مرد کو۔

عصمت واقعی عزیز احمد صاحب کے تصنیف کردہ عشق سے ناآشنا ہے اور اس کی یہ ناآشنائی ہی اس کے ادب کا باعث ہے۔ اگر آج اس کی زندگی کے تاروں کے ساتھ اس عشق کی بجلی جوڑ دی جائے اور کھٹکا دبا دیا جائے۔ تو بہت ممکن ہے ایک اور عزیز احمد پیدا ہو جائے۔ لیکن "تل"، "گیندا"، "بھول بھلیاں"

اور جال تصنیف کرنے والی عصمت یقیناً مر جائے گی۔

عصمت کے ڈرامے کمزور ہیں۔ جگہ جگہ ان میں جھول ہے۔ عصمت پلاٹ کو مناظر میں تقسیم کرتی ہے تو ناپ کر قینچی سے نہیں کترتی۔ یوں ہی دانتوں سے چیر پھاڑ کر چیتھڑے بنا ڈالتی ہے۔ پارٹیوں کی دنیا عصمت کی دنیا نہیں۔ اس میں وہ بالکل اجنبی رہتی ہے۔ جنس عصمت کے اعصاب پر ایک مرض کی طرح سوار ہے۔ عصمت کا بچپن بڑا غیر صحت بخش رہا ہے۔ پردے کے اس پار کی تفصیلات بیان کرنے میں عصمت کو یدِ طولیٰ حاصل ہے۔ عصمت کو سماج سے نہیں شخصیتوں سے شغف ہے۔ شخصیتوں سے نہیں اشخاص سے ہے۔ عصمت کے پاس جسم کے احتساب کا ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ ہے مساس — عصمت کے افسانوں کی کوئی سمت ہی نہیں — عصمت کی غیر معمولی قوتِ مشاہدہ حیرت میں غرق کر دیتی ہے — عصمت فحش نگار ہے..... ہلکا ہلکا طنز اور مزاح عصمت کے اسٹائل کی ممتاز خوبیاں ہیں — عصمت تلوار کی دھار پر چلتی ہے۔

عصمت پر بہت کچھ کہا گیا ہے اور کہا جاتا رہے گا۔ کوئی اسے پسند کریگا۔ کوئی ناپسند۔ لیکن لوگوں کی پسندیدگی اور ناپسندیدگی سے زیادہ اہم چیز عصمت کی تخلیقی قوت ہے۔ بری، بھلی، عریاں، مستور جیسی بھی ہے قائم رہنی چاہیئے۔ ادب کا کوئی جغرافیہ نہیں۔ اسے نقشوں اور خاکوں کی قید سے جہاں تک ممکن ہو بچانا چاہیئے۔

عرصہ ہوا دہلی کے ایک ذاتِ شریف دیش نے عجیب و غریب حرکت کی۔ آپ نے "اوروں کی کہانی سن میری زبانی" اُس کے پڑھنے سے بہتوں کا بھلا ہوگا" جیسے عنوان سے شائع کی۔ اس میں میرا، عصمت، مفتی، پریم چند، خواجہ محمد شفیع اور عظیم بیگ چغتائی کا ایک ایک افسانہ شامل تھا۔ دیباچے میں ترقی پسند ادب پر ایک تنقیدی چوٹ مارو گھٹنا پھوٹے آنکھ کے بمصداق فرمائی گئی تھی۔ اور اس کارنامے کو اپنے دو ننھے ننھے بچّوں کے نام سے معنون کیا گیا تھا۔ اس کی ایک کاپی آپ نے عصمت کو اور مجھے روانہ کی۔ عصمت کو دیش کی یہ ناشائستہ اور بھونڈی حرکت سخت ناپسند آئی۔ چنانچہ بہت بھنّا کر مجھے ایک خط لکھا:

منٹو بھائی آپ نے وہ کتاب جو دیش نے چھاپی ہے دیکھی؟ ذرا اسے پھٹکاریے اور ایک نوٹس دیجیے۔ نجی طور پر کہ ہر مضمون کا جرمانہ دو سو روپے دو ورنہ دعویٰ ٹھونک دیں گے۔ کچھ ہونا چاہیے۔ آپ بتائیے کیا کیا جائے۔ یہ خوب ہے کہ جس کا دل چاہتا ہے اٹھا کر ہمیں کیچڑ میں لتھیڑ دیتا ہے اور ہم کچھ نہیں کہتے۔ ذرا مزہ رہے گا۔ اس شخص کو خوب رگڑیے۔ ڈانٹیے کہ اُلٹا علمبردار کیوں بن رہا ہے عریاں ادب کا۔ اس نے ہمارے

افسانے صرف کتاب فروخت کرنے کے لئے چھاپے ہیں۔
ہماری ہتک ہے کہ ہرایرے غیرے نتھو خیرے کم عقلوں
کی ڈانٹیں سننا پڑیں۔ جو کچھ میں نے لکھا ہے۔ اُس کو
سامنے رکھ کر ایک مضمون لکھیے۔ آپ کہیں گے میں کیوں
نہیں لکھتی تو جواب ہے کہ آپ پہلے ہیں۔

جب عصمت سے ملاقات ہوئی تو اس خط کا جواب دیتے ہوئے میں نے کہا۔ "سب سے پہلے لاہور کے چودھری محمد حسین صاحب ہیں۔ اُن سے ہم درخواست کریں تو وہ ضرور مسٹر ویش پر مقدمہ چلوا دیں گے۔"

عصمت مسکرائی۔ "تجویز تو ٹھیک ہے لیکن مصیبت یہ ہے کہ ہم بھی ساتھ دھر لئے جائیں گے۔"

میں نے کہا۔ "کیا ہوا ۔۔۔ عدالت خشک جگہ سہی لیکن کرنال شاپ تو کافی دلچسپ جگہ ہے ۔۔۔ مسٹر ویش کو وہاں لے جائیں گے۔" اور ......
عصمت کے گالوں کے گڑھے گہرے ہو گئے۔

مُرلی کی دُھن

اپریل کی تئیس یا چوبیس تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد نہیں رہا۔ پاگل خانے میں شراب چھوڑنے کے سلسلے میں زیرِ علاج تھا۔ کہ شیام کی موت کی خبر ایک اخبار میں پڑھی۔ ان دنوں ایک عجیب و غریب کیفیت مجھ پہ طاری تھی۔۔ بے ہوشی اور نیم بے ہوشی کے ایک چکّر میں پھنسا ہوا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ہوش مندی کا علاقہ کب شروع ہوتا ہے۔ اور میں بے ہوشی کے عالم میں کب پہنچتا ہوں۔ دونوں کی سرحدیں کچھ اس طرح آپس میں گڈمڈ ہو گئی تھیں کہ میں خود کو "نو مینز لینڈ" میں بھٹکتا محسوس کرتا تھا۔

شیام کی موت کی خبر چنانچہ جب میری نظروں سے گذری۔ تو میں نے سمجھا یہ سب ترکِ شراب کی کارستانی ہے۔ جس نے میرے ذہن میں ہلچل پیدا

کر رکھی ہے۔ اس سے قبل نیم خوابی کے عالم میں کئی عزیزوں کی موتیں میرے لئے واقع ہو چکی تھیں اور نیم ہوشمندی کے وقت مجھے یہ بھی معلوم ہو چکا تھا۔ کہ وہ سب کے سب زندہ ہیں۔ اور میری صحت کے لئے دعائیں مانگ رہے ہیں۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ جب میں نے یہ خبر پڑھی۔ تو ساتھ والے کمرے کے پاگل سے کہا۔ "جانتے ہو۔ میرا ایک نہایت ہی عزیز دوست مر گیا ہے۔"

اُس نے پوچھا۔ "کون؟"

میں نے گلوگیر آواز میں جواب دیا۔ "شیام"

"کہاں؟ یہاں پاگل خانے میں؟"

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ اُوپر تلے کئی تصویریں میرے مضطرب دماغ میں اُبھریں۔ جن میں شیام تھا۔ مسکراتا شیام، ہنستا شیام، شور مچاتا شیام، زندگی سے بھرپور شیام، موت اور اُس کی ہولناکیوں سے قطعاً ناآشنا شیام ——— میں نے سوچا جو کچھ میں نے پڑھا ہے بالکل غلط ہے ——— اخبار کا وجود میرے دماغ کی اختراع ہے۔

آہستہ آہستہ الکحل کی دھند دماغ سے ہٹنے لگی۔ اور میں تمام واقعات کو اُن کے صحیح خدوخال میں دیکھنے لگا۔ مگر یہ عمل کچھ اس قدر سست رفتار تھا۔ کہ جب میں شیام کی موت کے حادثے سے دوچار ہوا تو مجھے زبردست دھکا نہ لگا۔ مجھے یوں محسوس ہوا۔ جیسے وہ عرصہ ہوا مر چکا تھا۔ اور اس کی موت کا صدمہ بھی عرصہ ہوا مجھے پہنچ چکا تھا۔ اب صرف اس کے

آثار باقی تھے۔ صرف ملبہ رہ گیا تھا۔ آہستہ آہستہ جس کی میں کھدائی کر رہا تھا۔ شکستہ اینٹوں کے ڈھیر میں کہیں شیام کی مسکراہٹ دبی ہوئی مل جاتی تھی۔ کہیں اس کا بانکا قہقہہ۔

پاگل خانے سے باہر فرزانوں کی دنیا میں یہ مشہور تھا کہ سعادت حسن منٹو، شیام کی موت کی خبر سُن کر پاگل ہو گیا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو مجھے بہت افسوس ہوتا شیام کی موت کی خبر سُن کر مجھے زیادہ ہوش مند ہو جانا چاہیئے تھا۔ دنیا کی بے ثباتی کا احساس میرے دل و دماغ میں زیادہ شدید ہو جانا چاہیئے تھا۔ اور انتقامی جذبے کے تحت اپنی زندگی کو پوری طرح استعمال کرنے کا عزم میرے اندر پیدا ہو جانا چاہیئے تھا۔ ..... شیام کی موت کی خبر سن کر پاگل ہو جانا محض پاگل پن تھا۔

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسدؔ
سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

رسوم و قیود کے بتوں کو توڑنے والے شیام کی موت پہ پاگل ہو جانا اس کی اس کی بہت بڑی توہین تھی۔

شیام زندہ ہے اپنے دو بچوں میں جو اس کی بے لوث محبت کا نتیجہ ہیں۔ تاجی (ممتاز) میں جو بقول اُس کے اس کی کمزوری تھی۔ اور اُن تمام عورتوں میں جن کی اوڑھنیوں کے آنچل اُس کے محبت بھرے دل پر گاہے گاہے سایہ کرتے رہے اور میرے دل میں جو صرف اس لئے سوگوار ہے۔ کہ وہ اس کی موت کے سرہانے

یہ نعرہ بلند نہ کر سکا۔ "شیام زندہ باد!"

مجھے یقین ہے۔ موت کے ہونٹوں کو بڑے خلوص سے چومتے ہوئے اس نے اپنے مخصوص انداز میں کہا ہوتا۔ "منٹو ـــــ خدا کی قسم ان ہونٹوں کا مزا کچھ اور ہی ہے"

میں جب بھی شیام کے متعلق سوچتا ہوں۔ تو مجھے مشہور روسی ناولنسوں آرتزبی شیف کا ہیرو سبنائن یاد آجاتا ہے۔ شیام عاشق تھا، عشق پیشہ نہیں تھا۔ وہ ہر خوبصورت چیز پر مرتا تھا ـــــ میرا خیال ہے کہ موت ضرور خوبصورت ہو گی، ورنہ وہ کبھی نہ مرتا۔

اُس کو تپش اور حدّت سے پیار تھا۔ لوگ کہتے ہیں کہ موت کے ہاتھ ٹھنڈے ہوتے ہیں۔ میں نہیں مانتا۔ شیام ٹھنڈے ہاتھوں کا بالکل قائل نہیں تھا۔ اگر واقعی موت کے ہاتھ ٹھنڈے ہوتے تو اس نے یہ کہہ کر ایک طرف جھٹک دیئے ہوتے۔

"ہٹو بڑی بی ـــــ تم میں خلوص نہیں ہے؟"

مجھے ایک خط میں لکھتا ہے:

قصّہ یہ ہے جانِ من! کہ یہاں ہر ایک "ہپ ٹلا" ہے۔ لیکن اصلی "ہپ ٹلا" یہاں سے بہت دُور لیکن میری پوچھتے ہو تو بھئی کوئی ایسی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔ کہ حرفِ شکایت لب پر لاؤں..... زندگی خوب گذر رہی ہے ـــــ رندی و مے نوشی! مے نوشی و رندی! ساتھ ساتھ چل رہی ہے۔

تاجی (ممتاز) چھ مہینے کے عرصے کے بعد واپس آگئی ہے
وہ ابھی تک میری ایک بڑی زبردست کمزوری ہے۔ اور
تم جانتے ہو عورت کی محبّت کی گرمی کی راحت محسوس کرنا
کتنی فرحت انگیز چیز ہے! .... آخر میں انسان ہوں
ایک نورمل انسان۔
نگار (نگار سلطانہ) کبھی کبھی ملتی ہے۔ لیکن اوّلین حق
"ت" کا ہے۔
شاموں کو تمہاری "دانشمندانہ بکواس" اکثر یاد آتی ہے۔

شیام نے اس خط میں ایک لفظ "ہپ ٹلا" استعمال کیا ہے۔ اسکی تشریح چونکہ خالی از دلچسپی نہیں۔ اس لئے آپ بھی سن لیجیئے۔

میں بمبئی ٹاکیز میں ملازم تھا۔ ان دنوں کمال امروہی کی فلمی کہانی "حویلی" (جو "محل" کے نام سے فلمائی گئی) کی تشکیل و تکمیل ہو رہی تھی۔ اشوک، واچا، حسرت (لکھنوی) اور میں سب ہر روز بحث و تمحیص میں شامل ہوتے تھے۔ ان نشستوں میں کام کے علاوہ کبھی کبھی خوب زوروں پر گپ بھی چلتی تھی۔ ایک دوسرے سے مذاق ہوتے۔ شیام کو جب فلم "مجبور" کی شوٹنگ سے فراغت ہوتی۔ تو وہ بھی ہماری محفل میں شریک ہو جاتا۔

کمال امروہوی کو عام گفتگو میں بھی ٹھیٹ قسم کے ادبی الفاظ استعمال کرنے

کی عادت ہے۔ میرے لیئے یہ ایک مصیبت ہو گئی تھی۔ اس لیئے کہ اگر میں عام فہم انداز میں کہانی کے متعلق اپنا کوئی نیا خیال پیش کرتا تو اُس کا اثر کمال پر پوری طرح نہیں ہوتا تھا۔ اس کے برعکس اگر میں زوردار الفاظ میں اپنا عندیہ بیان کرتا تو اشوک اور واچا کی سمجھ میں کچھ نہ آتا۔ چنانچہ میں ایک عجیب قسم کی ملی جلی زبان استعمال کرنے لگا۔

ایک روز صبح گھر سے بمبئی ٹاکیز آتے ہوئے میں نے ٹرین میں اخبار کا اسپورٹس کالم کھولا۔ برے برن اسٹیڈیم میں کرکٹ میچ ہو رہے تھے۔ ایک کھلاڑی کا نام کچھ عجیب و غریب تھا۔ "ہپ ٹلّا" — ایچ، ای، پی، ٹی، یو، ایل، ایل، ایچ اے — ہپ ٹلّا ...... میں نے بہت سوچا۔ کہ آخر یہ کیا ہو سکتا ہے۔ مگر کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ شاید ہیبت اللہ کی بگڑی ہوئی شکل تھی۔

اسٹڈیو پہنچا تو کمال کی کہانی کی فلمی تشکیل کا کام شروع ہوا۔ کمال نے اپنے مخصوص ادیبانہ اور اثر پیدا کرنے والے انداز میں کہانی کا ایک باب سنایا۔ مجھ سے اشوک نے رائے طلب کی۔ "کیوں منٹو؟"

معلوم نہیں کیوں، میرے منہ سے نکلا "ٹھیک ہے — مگر ہپ ٹلّا نہیں!"

بات کچھ بن ہی گئی۔ "ہپ ٹلّا" میرا مطلب بیان کر گیا۔ میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ سیکوئنس زوردار نہیں ہے۔

کچھ عرصے کے بعد حسرت نے اُسی باب کو ایک نئے طریقے سے پیش کیا۔ میری رائے پوچھی گئی۔ تو میں نے اب کی دفعہ ارادی طور پر کہا۔ "بھئی حسرت بات

نہیں بنی ـــــ کوئی ہپ ٹلّا چیز پیش کرو۔ ہپ ٹلّا۔"

دوسری مرتبہ ہپ ٹلا کہہ کر میں نے سب کی طرف ردِّ عمل معلوم کرنے کے لئے دیکھا۔ یہ لفظ اب معنی اختیار کرچکا تھا۔ چنانچہ اس نشست میں بلا تکلف میں نے اسے استعمال کیا۔ ہپ ٹلیٹی نہیں۔ ہپ ٹولائز کرنا چاہیئے وغیرہ وغیرہ، لیکن اچانک ایک بار اشوک مجھ سے مخاطب ہوا۔ "ہپ ٹلّا کا اصل مطلب کیا ہے؟ کس زبان کا لفظ ہے؟"

شیام اُس وقت موجود تھا۔ جب اشوک نے مجھ سے یہ سوال کیا۔ اُس نے زور کا قہقہہ لگایا۔ اُس کی آنکھیں سکڑ گئیں۔ ٹرین میں وہ میرے ساتھ تھا جب میں نے کرکٹ کے کھلاڑی کے اس عجیب وغریب نام کی طرف اس کو متوجہ کیا تھا۔ ہنس ہنس کے دوہرا ہوتے ہوئے اُس نے سب کو بتایا۔ کہ یہ منٹو کی نئی منٹوئیت ہے۔ جب کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ تو ہپ ٹلّا کو کھینچ کر فلمی دنیا میں لے آیا۔ مگر کھینچا تانی کے بغیر یہ لفظ بمبے کے فلمی حلقوں میں رائج ہوگیا۔

۲۹ ۷/۸ کے خط میں شیام مجھے لکھتا ہے:

پیارے منٹو! اب کی دفعہ تم پھر خاموش ہو۔ تمھاری یہ خاموشی مجھے بہت دق کرتی ہے۔ اس کے باوجود کہ میں تمھارے دماغی تساہل سے بخوبی واقف ہوں۔ میں غصّے سے دیوانہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ جبکہ تم ایک لحنت چپ سادھ

لیتے ہو۔ اس میں شک نہیں کہ میں بھی کوئی بہت بڑا خط باز نہیں ہوں۔ لیکن مجھے ایسے خط لکھنے اور وصول کرنے میں لطف حاصل ہوتا ہے جو ذرا "الگ قسم" کے ہوں ...... یعنی ہپ ٹلّا!

لیکن ہپ ٹلّا یہاں بہت ہی نایاب چیز ہو گئی ہے ..... اسے کاغذ پر لکھو تو کم بخت "ہپ ٹلی" بن جاتی ہے۔ اور اگر یہ ہپ ٹلی بھی دستیاب نہ ہو تو بتاؤ کتنی کوفت ہوتی ہے۔ معاف کرنا۔ اگر میں نے ہپٹو لائز کرنا شروع کر دیا ہو ... لیکن کیا کروں۔ جب حقیقتیں گم ہو جائیں۔ تو انسان ہپٹو لیٹ ہی کرتا ہے۔ مگر مجھے کچھ پروا نہیں کہ تم کیا کہو گے کیا نہیں کہو گے میں اتنا جانتا ہوں۔ اور تمہیں اس کا علم ہو گا۔ کہ تم ایسے بڑے ہپ ٹلا کو اس میدان میں شکست دینے کا سہرا صرف میرے ہی سر ہے۔

منٹو! کسی نے کہا ہے جب عاشق کے پاس لفظ ختم ہو جاتے ہیں تو وہ چومنا شروع کر دیتا ہے۔ اور جب کسی مقرر کے پاس الفاظ کا ذخیرہ ختم ہو جاتا ہے تو وہ کھانسنے لگتا ہے۔ میں اس کہاوت میں ایک اور چیز شامل کرتا ہوں۔ جب مرد کی مردانگی

ختم ہو جاتی ہے تو وہ اپنے ماضی کو پلٹ پلٹ کر دیکھنے لگتا ہے۔ لیکن تم فکر مند نہ ہونا میں اس آخری منزل سے کچھ دُور ہوں۔ زندگی بہت مصروف اور بھرپور ہے۔ اور بھرپور زندگی میں تم جانتے ہو دیوانگی کے لئے بہت کم فرصت ملتی ہے حالانکہ مجھے اس کی اشد ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

نسیم والا فلم (چاندنی رات) قریب قریب نصف مکمّل ہو چکا ہے۔ امرناتھ سے ایک فلم کا کنٹریکٹ کر چکا ہوں۔ ذرا سوچو تو میری ہیروئن کون ہے؟ —— نگار (نگار سلطانہ) میں نے خود اس کا نام تجویز کیا تھا۔ محض یہ معلوم کرنے کے لئے کہ پردے پر اُن پرانے جذبات کا اعادہ کیسے لگتا ہے جو کبھی کسی سے حقیقت کی دنیا میں متعلق رہے ہیں —— پہلے مسرّت تھی، اب محض کاروبار لیکن کیا خیال ہے تمھارا۔ یہ سلسلہ جوش آفریں نہیں رہے گا۔

تاجی، ابھی تک میری زندگی میں ہے۔ نگار بہت ہی اچھی ہے اور اس کا سلوک بے حد نرم و نازک۔ پچھلے دنوں سے رمولا بھی یہاں بمبے میں ہے۔ اس سے ملاقات کرنے پر مجھے معلوم ہوا۔ کہ وہ ابھی تک اس کمزوری کو جو اُس کے

دل و دماغ میں میری طرف سے موجود ہے مغلوب نہیں کر سکی۔ چنانچہ اس کے ساتھ بھی سیرو تفریح رہی۔

اولڈ بوائے میں ان دنوں "فلرٹیشن" کے فن میں اڈوانس ٹریننگ لے رہا ہوں۔ مگر دوست یہ سارا سلسلہ بہت ہی پیچیدہ ہو گیا ہے۔ بہرحال میں پیچیدگیاں پسند کرتا ہوں۔

وہ میرے اندر جو قسمت آزما مہم جُو اور آوارہ گرد ہے ابھی تک کافی طاقت ور ہے۔ میں کسی مخصوص جگہ کا نہیں اور نہ کسی مخصوص جگہ کا ہونا چاہتا ہوں۔ میں لوگوں سے محبت کرتا ہوں۔ اور اُن سے نفرت کرتا ہوں۔ زندگی یوں ہی گذر رہی ہے۔ دراصل زندگی ہی ایک ایسی معشوقہ ہے۔ جس سے مجھے محبت ہے لوگ جائیں جہنم میں!

مجھے مصنّف کا نام بھول گیا ہے۔ مگر اُس کا ایک جملہ یاد رہ گیا ہے۔ شاید وہ بھی درست نہ ہو۔ مگر مفہوم کچھ اسی قسم کا تھا...... وہ لوگوں سے اس قدر محبّت کرتا تھا۔ کہ (خود کو محبّت کرنے میں) کبھی تنہا محسوس نہیں کرتا تھا۔ لیکن وہ اس طور پر اُن سے نفرت کرتا تھا۔ کہ (نفرت کرنے میں خود کو) یکہ و تنہا محسوس کرتا تھا"

میں اس میں اور کوئی فقرہ شامل نہیں کر سکتا۔

ان دو خطوں میں تاجی کا ذکر آیا ہے۔ خطوط وحدانی میں اتنا تو میں بتا چکا ہوں کہ یہ ممتاز کی تصغیر ہے۔ ممتاز کون ہے یہ خود شیام بتا چکا ہے کہ وہ اسکی کمزوری ہے۔ سچ پوچھئے تو نگار، رمولا سب اس کی کمزوریاں تھیں۔ عورت دراصل اس کی سب سے بڑی کمزوری تھی۔ اور یہی اُس کے کردار کا مضبوط ترین پہلو تھا۔

ممتاز، زیب قریشی ایم۔ اے کی چھوٹی بہن ہے۔ زیب کے ساتھ بمبئے گئی تو وہاں ظہور راجہ کے بھاری بھر کم عشق میں پھنس گئی۔ کچھ عرصے کے بعد اس سے اپنا دامن چھڑا کر لاہور آئی۔ تو شیام کے ساتھ رومانس شروع ہو گیا۔ بمبئے میں جب شیام کی مالی حالت درست ہوئی۔ تو اس نے اپنے ہونے والے بچّوں کی خاطر اس سے شادی کر لی۔

شیام کو بچّوں سے بہت پیار تھا۔ خاص طور پر خوبصورت بچّوں سے خواہ وہ حد درجہ بدتمیز ہی کیوں نہ ہوں۔ طہارت و نفاست پسند طبقوں کی نظر میں وہ خود بہت بڑا بدتمیز تھا۔ بعض عورتیں تو اس سے اس کی بدتمیزیوں کی وجہ سے سخت نفرت کرتی تھیں۔ مگر وہ بالکل بے پروا تھا۔ اس نے کبھی ان عورتوں کی خوشنودی کے لیئے اپنی عادات سنوارنے کی کوشش نہ کی۔ اس کا ظاہر و باطن ایک تھا۔ "منٹو ۔۔۔ میری باتیں سن کر یہ ناک بھوں چڑھانے والی سالیاں سب بنتی ہیں ۔۔۔ میک اپ کی دنیا میں رہتی ہیں۔"

لیکن بعض عورتیں اس کی بدتمیزیوں سے محبت بھی کرتی تھیں۔ کیونکہ ان میں بستر کی بُو نہیں ہوتی تھی۔ شیام اُن سے کھلے مذاق کرتا۔ وہ بھی اُس سے ایسی باتیں کرتیں۔ جو مہذّب سوسائٹی میں قابلِ ستر پوش سمجھی جاتی تھیں .... ہونٹوں پر مسکراہٹیں ناچتیں۔ حلق سے قہقہے اچھلتے۔ ہنستے ہنستے شیام کی آنکھوں میں آنسو آجاتے۔ اور مجھے ایسا محسوس ہوتا کہ دور کونے میں طہارت پسندی نوکیلے کیلوں پر آسن جمائے اپنے گناہ بخشوانے کی رائیگاں کوشش کر رہی ہے۔

شیام سے میری پہلی ملاقات کب اور کہاں ہوئی۔ یہ مجھے بالکل یاد نہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں اُس سے ملنے سے پہلے ہی مل چکا تھا۔ ویسے اب سوچتا ہوں تو اتنا یاد آتا ہے۔ کہ بمبئی میں اس سے شروع کی ملاقاتیں شاید لیڈی جمشید جی روڈ پر ہوئی تھیں۔ جہاں میری بہن رہتی تھی۔ "ہائی فسٹ" میں بالائی منزل کے ایک فلیٹ میں ڈائمنڈ رہتی تھی۔ اس کے ہاں شیام کا آنا جانا تھا۔ دو تین مرتبہ غالباً سیڑھیوں میں اس سے ملنا ہوا۔ یہ ملاقاتیں گو رسمی تھیں۔ لیکن پھر بھی غایت درجہ بے تکلف تھیں۔ کیونکہ شیام نے مجھے خود ہی بتادیا تھا کہ ڈائمنڈ نام کی عورت جو مسز شیام کہلاتی ہے۔ درحقیقت اسکی بیوی نہیں لیکن تعلقات کی بنا پر وہ بیوی سے کچھ زیادہ ہی ہے۔ وہ ازدواجی رشتے اور اس کے اشتہار کا بالکل قائل نہیں تھا۔ لیکن جب ایک تکلیف کے سلسلے میں اُسے ڈائمنڈ کو ہسپتال داخل کرانا پڑا۔ تو اُس نے رجسٹر میں اس کا نام مسز شیام

ہی لکھوایا۔

بہت دیر بعد ڈائمنڈ کے شوہر نے مقدمے بازی کی۔ شیام کو بھی اِس میں پھنسایا گیا۔ لیکن معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ اور ڈائمنڈ جو کہ اب فلمی دنیا میں قدم رکھ چکی تھی۔ اور وزنی جیبیں دیکھ چکی تھی۔ شیام کی زندگی سے نکل گئی۔ مگر شیام اُس کو اکثر یاد کرتا تھا۔ مجھے یاد ہے۔ پُونے کے ایک باغ میں اس نے مجھے سیر کراتے ہوئے کہا۔

"منٹو۔۔۔ ڈائمنڈ گریٹ عورت تھی ۔۔۔۔ خدا کی قسم جو عورت اسقاط برداشت کر سکتی ہے۔ وہ دنیا کی بڑی سے بڑی صعوبت کا مقابلہ کر سکتی ہے۔" لیکن فوراً ہی اُس نے کچھ سوچ کر کہا۔ "یہ کیا بات ہے منٹو۔۔۔ عورت پھل پھول سے کیوں ڈرتی ہے ۔۔۔ کیا اس لئے کہ یہ گناہ کا ہوتا ہے؟ مگر یہ گناہ اور ثواب کی بکواس کیا ہے۔ ایک نوٹ اصلی یا جعلی ہو سکتا ہے۔ ایک بچہ حلال کا یا حرام کا نہیں ہو سکتا۔ وہ جھٹکہ یا کلمہ پڑھ کے چھری پھیرنے سے پیدا نہیں ہوتا۔ اس کی پیدائش کا موجب تو وہ عظیم الشان دیوانگی ہے جس کے مرتکب سب سے پہلے باوا آدم اور امّاں حوا ہوئے تھے ۔۔۔۔ آہ، یہ دیوانگی!"

اور وہ دیر تک اپنی مختلف دیوانگیوں کی باتیں کرتا رہا۔

شیام بہت بلند بانگ تھا۔ اُس کی ہر بات، اس کی ہر حرکت، اس کی ہر ادا اُونچے سروں میں ہوتی تھی۔ اعتدال کا وہ بالکل قائل نہیں تھا۔ محفل میں سنجیدگی و متانت کی ٹوپی پہن کر بیٹھنا اس کے نزدیک مسخرہ پن تھا۔ شغلِ مےنوشی کے دوران

ہیں خاص طور پر اگر کوئی خاموش ہو جاتا یا فلسفی بن جاتا۔ تو اُسے ناقابلِ بیان کوفت ہوتی۔ اس قدر جھنجھلا جاتا کہ بعض اوقات بوتل اور گلاس توڑپھوڑ کر گالیاں دیتا محفل سے باہر چلا جاتا۔

پُونے کا ایک واقعہ ہے۔ شیام اور مسعود پرویز دونو "زبیدہ کاٹیج" میں رہتے تھے۔ ایک کہانی فروخت کرنے کے سلسلے میں مجھے وہاں ٹھیرنا پڑا۔ مسعود طبعاً خاموشی پسند ہے۔ شراب پی کر وہ اور بھی زیادہ منجمد ہو جاتا۔ ایک دن صبح سے رم کا دَور شروع ہوُا۔ اِس دوران میں کئی آئے اور بہک کر چلے گئے۔ میں مسعود اور شیام ڈٹے ہوئے تھے۔ شیام بہت خوش تھا۔ اس لئے کہ وہ بہکنے والوں سے مل کر جی بھر کے شور مچا تا رہا تھا۔ مگر شام کے قریب اُس کو دفعتہً محسوس ہوُا کہ مسعود دن کی تمام ہاؤ ہُو سے الگ تھلگ رہا ہے۔ نشے سے چُور آنکھوں کو سکیڑ کر اُس نے مسعود کی طرف دیکھا۔ اور طنزیہ لہجے میں کہا۔ "کیوں حضرتِ پرویز—— کیا آپ نے اپنا مرثیہ مکمل فرما لیا ہے۔"

مسعود حسبِ عادت مسکرا دیا۔ اتنے میں کرشن چندر آ گیا۔ اور شیام مسعود کی منجمد مسکراہٹ کے پیدا کردہ اثر کو بھول گیا۔ دو ایک دَور چلے۔ تو شیام نے کرشن سے مسعود کے "ناقابلِ برداشت انجماد" کا ذکر کیا۔ کرشن کی زبان کا تالا کھولنے کے لئے دو پیگ کافی تھے۔ چنانچہ مسعود سے مخاطب ہو کر اس نے لعن طعن شروع کر دی۔ "تم کیسے شاعر ہو پرویز—— صبح سے پی رہے ہو۔ اور تم نے ابھی تک

کوئی واہیات بات نہیں کی۔ خدا کی قسم جو شاعر واہیات بکواس کرنا نہیں جانتا۔ وہ شاعری بھی نہیں کر سکتا۔ مجھے حیرت ہے کہ تم شاعری کیسے کر لیتے ہو۔ میرا خیال ہے تمھاری یہ شاعری یقیناً بکواس ہو گی۔ اور تمھارا پی کر یوں کیسٹر آئل کی بوتل بن جانا تمھاری اصل شاعری ہے۔"

یہ سن کر شیام اس قدر ہنسا کہ اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ جب کچھ دیر تک مسعود سے چھیڑ جاری رہی تو وہ اُکتا۔ اُٹھ کر اُس نے ہم سب کے گلاس خالی کر دیے۔ اور کہا۔ "چلو باہر چلیں۔"

ہم باہر نکلے۔ مسعود کے کہنے پر سب نے اپنے جوُتے اتار کر جیبوں میں رکھ لیے اور دوڑنے لگے۔ اس وقت رات کے بارہ بجے ہوں گے۔ پُونہ کی سڑکیں سب سنسان تھیں۔ میں، مسعود، شیام اور ایک اور جس کا نام مجھے یاد نہیں رہا۔ دیوانہ وار شور مچاتے دوڑ رہے تھے۔ بالکل بے مطلب! اپنی منزل سے ناآشنا۔

راستے میں کرشن چندر کا مکان پڑتا تھا۔ وہ دوڑ سے پہلے ہم سے الگ ہو کر چلا گیا تھا۔ دروازہ کھلوا کر ہم نے اُسے بہت پریشان کیا۔ اُس کی شمیمہ خاتون ہمارا شور سن کر دوسرے کمرے سے باہر نکل آئی۔ اس سے کرشن اور بھی زیادہ پریشان ہوا جس کے پیشِ نظر ہم وہاں سے رخصت ہوئے اور پھر سڑک پیمائی شروع کر دی۔

پُونہ مندروں کا شہر ہے۔ ہر فرلانگ پر ایک نہ ایک مندر ضرور ہوتا ہے۔ مسعود نے ایک کا گھنٹہ بجایا۔ میں اور شیام سجدے میں چلے گئے اور شو شمبھو شو شمبھو

کہنے لگے۔ اس کے بعد جو بھی مندر آتا۔ ہم چاروں یہی عمل دہراتے اور خوب قہقہے لگاتے۔ جب کوئی پجاری آنکھیں ملتا باہر نکلتا۔ تو ہم خاموش ہو جاتے اور چپ چاپ چل پڑتے۔

اسی طرح تین بج گئے ـــــ ایک سڑک میں کھڑے ہو کہ مسعود نے وہ مغلظات بکیں کہ میں دنگ رہ گیا۔ کیونکہ اس کی زبان سے میں نے کبھی ناشائستہ کلمہ نہیں سنا تھا۔ مگر جب وہ موٹی موٹی گالیاں اُگل رہا تھا۔ تو میں نے محسوس کیا کہ وہ اس کی زبان پر ٹھیک طور پہ بیٹھتی نہیں تھیں۔

چار بجے ہم زبیدہ کاٹیج پہنچے اور سو گئے۔ لیکن مسعود شاید جاگتا اور شعر کہتا رہا تھا۔

مے نوشی کے معاملے میں بھی شیام اعتدال پسند نہیں تھا۔ وہ کھل کھیلنے کا قائل تھا۔ مگر اپنے سامنے میدان کی وسعت دیکھ لیتا تھا۔ اُس کی لمبائی چوڑائی کو اچھی طرح جانچ لیتا تھا۔ تاکہ حدود سے آگے نکل نہ جائے۔ وہ مجھ سے کہا کرتا تھا۔ "میں چوکے پسند کرتا ہوں ـــــ چھکے محض اتفاق سے لگ جاتے ہیں"

ایک چھکا ملاحظہ ہو:

تقسیم ہونے سے چند ماہ پیشتر کا ذکر ہے ـــــ شیام، شاہد لطیف کے گھر سے میرے یہاں چلا آیا تھا۔ بمبئی کی زبان میں کڑکی یعنی مفلسی کے دن تھے۔ مگر مے نوشی بڑی باقاعدگی سے جاری تھی۔ ایک شام باتوں باتوں میں زیادہ پی گئے

راجہ مہدی علی خاں بھی اتفاق سے موجود تھا۔ کرفیو کا وقت ہوا۔ تو اُس نے جانے کی اجازت چاہی۔ میں نے اُس سے کہا۔ "پاگل ہوئے ہو پکڑے جاؤ گے۔"

شیام نے اُس سے ازراہِ مذاق کہا۔ "یہیں سو جاؤ۔ آج کل تاجی یہاں نہیں ہے"

راجہ نے مسکرا کر جواب دیا۔ "مجھے نیند نہیں آئے گی۔ سپرنگ والے پلنگوں پر میں قطعاً سو نہیں سکتا۔"

شیام نے ایک گلاس میں راجہ کے ڈیل ڈول کے مطابق برانڈی کا پگ ڈالا۔ اور اس کو دے دیا۔ "یہ لو۔ اس سے نیند آجائے گی۔"

راجہ ایک جرعے میں سارا گلاس چڑھا گیا۔ بہت دیر تک تاجی کی باتیں ہوتی رہیں۔ جو شیام سے ناراض ہو کر اپنی بہن کے پاس چلی گئی تھی ـــــ ہر آٹھویں دسویں روز "نکمی نکمی" باتوں پر دونوں میں تخ ہو جاتی تھی۔ میں بالکل دخل نہیں دیتا تھا۔ اس لئے کہ شیام کو یہ بالکل پسند نہیں تھا۔ ہم دونوں میں گویا دل ہی دل میں یہ معاہدہ ہو چکا تھا۔ کہ ایک دوسرے کے کاموں میں دخل اندازی نہیں کریں گے۔

تاجی یوں گئی تھی جیسے کبھی واپس نہیں آئے گی۔ اور شیام نے بھی اُسے یوں وداع کیا تھا جیسے وہ پھر کبھی اس کی شکل تک دیکھنے کا روادار نہیں ہو گا۔ مگر دونو ایک دوسرے سے دُور بیٹھے تڑپتے رہتے تھے۔ شاموں کو تو شیام اکثر تاجی کے معاملے میں بہت جذباتی ہو جاتا تھا۔ میں سوچتا کہ وہ ضرور رات بھر اُس کی یاد میں جاگتا رہے گا۔ مگر کم بخت نیند کا کچھ ایسا ماتا تھا کہ پلنگ پر لیٹتے ہی سو جاتا۔

میرے فلیٹ میں صرف دو کمرے تھے۔ ایک سونے کا دوسرا بیٹھنے کا۔ سونے والا کمرہ میں نے شیام اور تاجی کو دے دیا تھا۔ اور بیٹھنے والے کمرے میں گدا بچھا کر میں سوتا تھا۔ تاجی چونکہ موجود نہیں تھی۔ اس لئے اس کا پلنگ راجہ مہدی علی خاں کو مل گیا۔ رات بہت گذر گئی تھی۔ اس لئے ہم سب اپنی اپنی جگہ پر سو گئے۔

حسبِ معمول پونے چھ کے قریب میری جاگ کھلی۔ نیم خوابی کے عالم میں یوں محسوس ہوا۔ کہ میرے ساتھ کوئی لیٹا ہے۔ پہلے میں نے خیال کیا۔ کہ بیوی ہے۔ مگر وہ تو لاہور بیٹھی تھی۔ آنکھیں کھول کر دیکھا۔ تو معلوم ہوا کہ شیام ہے۔ اب میں نے سوچنا شروع کیا۔ کہ یہ کیسے میرے پاس پہنچ گیا۔ ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ جلے ہوئے کپڑے کی بُو ناک میں گھسی۔ پاس ہی صوفہ پڑا تھا۔ عرصہ ہوا سگرٹ گرنے سے اس کا ایک حصّہ جل گیا تھا۔ مگر اتنی دیر کے بعد اب بُو آنے کا کیا مطلب ہے۔ آنکھیں زیادہ کھلیں۔ تو میں نے دھوئیں کی کڑواہٹ محسوس کی۔ اور ہلکے ہلکے دودھیا بادل بھی دیکھے ـــــ اُٹھ کر میں دوسرے کمرے میں گیا۔ کیا دیکھتا ہوں۔ کہ وہ پلنگ جس پہ شیام سویا کرتا تھا۔ سُلگ رہا ہے۔ اور پاس ہی دوسرے پلنگ پر راجہ مہدی علی خاں اپنی توند نکالے ٹراخرّاٹے لے رہا ہے۔

میں نے قریب جا کر پلنگ کے جلے ہوئے حصّہ کا معائنہ کیا۔ میٹرس میں بڑی رکابی کے برابر سوراخ تھا۔ جس میں سے دھوآں نکل رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے آگ بجھانے کی کوشش کی ہے۔ کیونکہ پلنگ پانی میں تربتر تھا۔

مگر معاملہ چونکہ روئی اور ناریل کے پھُوس کا تھا۔ اس لئے آگ پوری طرح بجھی نہیں تھی۔ اور برابر سلگ رہی تھی۔ میں نے راجہ کو جگانے کی کوشش کی۔ مگر وہ کروٹ بدل کر اور زور سے خراٹے لینے لگا۔ ایک دم پلنگ کے سیاہ سوراخ سے ایک لال لال شعلہ باہر لپکا۔ میں فوراً غسل خانے کی طرف بھاگا۔ ایک بالٹی پانی کی اس سوراخ میں ڈالی۔ اور جب پوری طرح اطمینان ہو گیا کہ آگ بجھ گئی ہے۔ تو راجہ کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جگایا۔ اس سے جب آتشزدگی کی واردات کے متعلق استفسار کیا۔ تو اُس نے اپنے مخصوص مزاحیہ انداز میں خوب نمک مرچ لگا کر واقعات بیان کئے۔ ”تمہارا یہ شیام ہنومان مہاراج ہے۔ رات برانڈی کے تالاب میں غوطہ لگاتے ہوئے میں سو گیا۔ دو بجے کے قریب جب عجیب عجیب آوازیں آئیں۔ تو میں جاگ پڑا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ شیام ایک بہت بڑا ہنومان ہے۔ اُس کی گپھے دار دُم کے ساتھ مٹی کے تیل میں ڈوبی چندیاں بندھی ہیں۔ اور اُن میں آگ لگی ہے۔ شیام پلنگ پر زور زور سے اُچھل کود رہا ہے۔ اور اپنی دُم سے آگ لگا رہا ہے۔ جب آگ لگ گئی۔ تو میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ اور برانڈی کے تالاب میں غوطہ لگا گیا۔ تہہ کے ساتھ لگ کر سونے ہی والا تھا۔ کہ مجھے تمہارا خیال آیا ہے کہ غریب آدمی کا پلنگ ایسا نہ ہو کہ جل کر راکھ ہو جائے۔ چنانچہ اُٹھا۔ شیام غائب تھا۔ دوسرے کمرے میں تمھیں حالات سے آگاہ کرنے کے لئے گیا۔ تو کیا دیکھتا ہوں۔ کہ شیام اپنے اصلی روپ میں تمھارے ساتھ چمٹ کر لیٹا ہے۔ میں نے

تمھیں جگانے کی کوشش کی۔ اپنے پھیپھڑوں پر زور لگا لگا کر تمھیں پکارا۔ گھنٹے بجائے۔ ایٹم بم چلائے۔ مگر تم نہ اُٹھے۔ آخر میں نے ہولے ہولے تمھارے کان میں کہا۔ خواجہ اُٹھو۔ اسکاچ وسکی کی ایک پوری پیٹی آئی ہے۔ تم نے فوراً آنکھیں کھول دیں۔ اور پوچھا "کہاں" — میں نے کہا۔ "ہوش میں آؤ — سارا مکان جل رہا ہے — آگ لگ گئی ہے آگ! تم نے کہا۔ "بکتے ہو" میں نے کہا۔ "نہیں خواجہ — میں خواجہ خضر کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔ آگ لگی ہے" جب تمھیں میرے بیان پر یقین آگیا۔ تو تم آرام سے یہ کہتے ہوئے سو گئے۔ "فائر بریگیڈ کو اطلاع دے دو" تمھاری طرف سے مایوس ہو کر میں نے شیام کو حالات کی نزاکت سے آگاہ کرنے کی کوشش کی۔ جب وہ اس قابل ہوا کہ میری بات اس کے دماغ تک پہنچ سکے۔ تو اس نے مجھ سے کہا۔ "تم بجھا دو نا یار۔ کیوں تنگ کرتے ہو" — اور سو گیا...... آگ آخر آگ ہے اور اُس کا بجھانا ہر انسان کا فرض ہے۔ اس لئے میں فوراً... اپنی ساری انسانیت مجتمع کر کے فائر بریگیڈ بن گیا اور وہ جگ جو میں نے تمھاری سالگرہ پر تحفے کے طور پر دیا تھا۔ بھر کے آگ پر ڈال دیا — میرا کام چونکہ پورا ہو چکا تھا۔ نتیجہ خدا کے ہاتھ سونپ کر سو گیا۔"

شیام جب پوری نیند سو کر اُٹھا تو میں نے اور راجہ نے اس سے پوچھا کہ آگ کیسے لگی تھی شیام کو یہ قطعاً معلوم نہیں تھا۔ بہت دیر غور و فکر کے بعد اس نے کہا۔

"میں آتشزدگی کی اس واردات پر کوئی روشنی نہیں ڈال سکتا" مگر جب راجہ دوسرے کمرے سے شیام کی جلی ہوئی ریشمی قمیص اٹھا کر لایا۔ تو شیام نے مجھ سے کہا۔ "اب تفتیش کرنی ہی پڑے گی"

سب نے مل کر تفتیش کی تو معلوم ہوا۔ کہ شیام صاحب نے جو بنیان پہنا تھا وہ بھی دو ایک جگہ سے جلا ہوا ہے۔ زیادہ گہرائیوں میں گئے تو دیکھا کہ ان کی چھاتی پر روپے روپے جتنے دو بڑے آبلے ہیں۔ چنانچہ شرلاک ہومز نے اپنے دوست واٹسن سے کہا۔ "یہ بات قطعی طور پر پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ آگ ضرور لگی تھی۔ اور شیام صرف اس غرض سے کہ اس کے ہمسائے راجہ مہدی علی خاں کو تکلیف نہ ہو چپ چاپ اُٹھ کر میرے پاس چلا آیا"

جب شیام نے تہذیب و تمدن کے مروّجہ قوانین کے پیش نظر تاجی سے باقاعدہ شادی کی۔ تو میرا خیال ہے۔ صرف ایک انتقامی جذبے کے تحت اُس نے اتنی شاندار دعوت کی۔ کہ دیر تک فلمی دنیا میں اس کے چرچے رہے۔ اتنی شراب بہائی گئی۔ کہ خم کے خم خالی ہو گئے۔ مگر افسوس کہ تہذیب و تمدن کی ستر پوش چولی کے داغ دھل نہ سکے۔

شیام صرف بوتل اور عورت ہی کا رسیا نہیں تھا۔ زندگی میں جتنی نعمتیں موجود ہیں۔ وہ ان سب کا عاشق تھا۔ اچھی کتاب سے بھی وہ اسی طرح پیار کرتا تھا جس طرح ایک اچھی عورت سے کرتا تھا۔ اس کی ماں اس کے بچپن ہی میں مر گئی تھی۔

مگر اس کو اپنی سوتیلی ماں سے بھی ویسی ہی محبّت تھی۔ جو حقیقی ماں سے ہو سکتی ہے۔ اس کے چھوٹے چھوٹے سوتیلے بہن بھائی تھے۔ ان سب کو وہ اپنی جان سے زیادہ عزیز سمجھتا تھا۔ باپ کی موت کے بعد صرف اس کی اکیلی جان تھی۔ جو اتنے بڑے کنبے کی دیکھ بھال کرتی تھی۔

ایک عرصے تک وہ انتہائی خلوص کے ساتھ دولت، اور شہرت حاصل کرنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارتا رہا۔ اس دوران میں تقدیر نے اُسے کئی غچّے دئے مگر وہ ہنستا رہا۔ "جانِ من ایک دن ایسا بھی آئے گا کہ تو میری بغل میں ہوگی۔" اور وہ کئی برسوں کے بعد آخر آ ہی گیا۔ کہ دولت اور شہرت دونوں اس کی جیب میں تھیں۔

موت سے پہلے اُس کی آمدنی ہزاروں روپے ماہوار تھی۔ بمبے کے مضافات میں ایک خوبصورت بنگلہ اس کی ملکیت تھا اور کبھی وہ دن تھے کہ اس کے پاس سر چھپانے کو جگہ نہیں تھی۔ مگر مفلسی کے ان ایام میں بھی وہی ہنستا ہوا شیام تھا۔ دولت و شہرت آئی تو اس نے ان کا یوں استقبال نہ کیا۔ جس طرح لوگ ڈپٹی کمشنر کا کرتے ہیں۔ یہ دونوں محترمائیں اس کے پاس آئیں۔ تو اس نے ان کو اپنی لوہے کی چارپائی پر بٹھا لیا۔ اور تڑاخ پٹاخ بوسے داغ دئے۔

میں اور وہ جب ایک چھت کے نیچے رہتے تھے تو دونوں کی حالت پتلی تھی۔ فلم انڈسٹری ملک کی سیاسیات کی طرح ایک بڑے ہی نازک دور

سے گذر رہی تھی۔ میں بمبئی ٹاکیز میں ملازم تھا۔ اس کا وہاں ایک پکچر کا کنٹریکٹ تھا دس ہزار روپے میں۔۔ عرصے کی بیکاری کے بعد اس کو یہ کام ملا تھا۔ مگر وقت پر پیسے نہیں ملتے تھے۔ بہرحال ہم دونوں کا گذر کسی نہ کسی طور ہو جاتا تھا۔ میاں بیوی ہوتے تو اُن میں روپے پیسے کے معاملے میں ضرور چخ ہوتی۔ مگر شیام اور مجھے کبھی محسوس تک نہ ہُوا۔ کہ ہم میں سے کون خرچ کر رہا ہے اور کتنا کر رہا ہے۔

ایک دن اُسے بڑی کوششوں کے بعد موٹی سی رقم ملی (غالباً پانچ سو روپے تھے) میری جیب خالی تھی۔ ہم ملاڈ سے گھر آ رہے تھے۔ راستے میں شیام کا یہ پروگرام بن گیا۔ کہ وہ چرچ گیٹ کسی دوست سے ملنے جائے گا۔ میرا اسٹیشن آیا تو اُس نے جیب سے دس دس روپے کے نوٹوں کی گڈّی نکالی۔ آنکھیں بند کر کے اس کے دو حصّے کئے اور مجھ سے کہا۔ "جلدی کرو منٹو ——— ان میں سے ایک لے لو۔"

میں نے گڈّی کا ایک حصّہ پکڑ کر جیب میں ڈال لیا۔ اور پلیٹ فارم پر اُتر گیا شیام نے مجھے "ٹاٹا" کہا۔ اور کچھ نوٹ جیب سے نکال کر لہرائے۔ "تم بھی کیا یاد رکھو گے سیفٹی کی خاطر میں نے یہ نوٹ علٰحدہ رکھ لئے تھے ——— ہپ ٹلّا!"

شام کو جب وہ اپنے دوست سے مل کر آیا۔ تو کباب ہو رہا تھا۔ مشہور فلم اسٹار ''کے'' نے اس کو بلایا تھا۔ کہ وہ اس سے ایک پرائیویٹ بات کرنا چاہتی ہے شیام نے برانڈی کی بوتل بغل میں سے نکال کر اور گلاس میں ایک بڑا پیگ ڈال کر

مجھ سے کہا۔ "پرائیویٹ بات یہ تھی..... میں نے لاہور میں ایک دفعہ کسی سے کہا تھا کہ "کے کے" مجھ پر مرتی ہے۔ خدا کی قسم بہت بُری طرح مرتی تھی۔ لیکن ان دنوں میرے دل میں کوئی گنجائش نہیں تھی۔ آج اس نے مجھے اپنے گھر بلا کر کہا۔ کہ تم نے بکواس کی تھی۔ میں تم پر کبھی نہیں مری۔ میں نے کہا تو آج مر جاؤ۔ مگر اس نے ہٹ دھرمی سے کام لیا۔ اور مجھے غصّے میں آکر اُس کے ایک گھونسہ مارنا پڑا۔"

میں نے اس سے پوچھا۔ "تم نے ایک عورت پہ ہاتھ اُٹھایا"

شیام نے مجھے اپنا ہاتھ دکھایا جو زخمی ہو رہا تھا۔ "کم بخت آگے سے ہٹ گئی۔ نشانہ چوکا اور میرا گھونسہ دیوار کے ساتھ جا ٹکرایا۔"

یہ کہہ کر وہ خوب ہنسا۔ "سالی بدکار تنگ کر رہی ہے۔"

میں نے اوپر روپے پیسے کا ذکر کیا ہے ـــــ غالباً دو برس پیچھے کی بات ہے۔ میں یہاں لاہور میں فلمی صنعت کی زبوں حالی اور اپنے افسانے "ٹھنڈا گوشت" کے مقدمے کی وجہ سے بہت پریشان تھا۔ عدالتِ ماتحت نے مجھے مجرم قرار دے کر تین مہینے قید بامشقّت اور تین سو روپیہ جرمانے کی سزا دی تھی میرا دل اس قدر کھٹا ہو گیا تھا۔ کہ جی چاہتا تھا۔ اپنی تمام تصانیف کو آگ میں جھونک کر کوئی اور کام شروع کر دوں۔ جس کا تخلیق سے کوئی علاقہ ہو ـــــ چنگی کے محکمے میں ملازم ہو جاؤں اور رشوت کھا کر اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ پالا کروں۔ کسی پر نکتہ چینی کروں نہ کسی معاملے میں اپنی رائے دوں۔

ایک عجیب و غریب دَور سے میرا دل و دماغ گذر رہا تھا۔ بعض لوگ سمجھتے تھے کہ افسانے لکھ کر ان پر مقدمے چلوانا میرا پیشہ ہے۔ بعض کہتے تھے کہ میں صرف اس لئے لکھتا ہوں کہ سستی شہرت کا دلدادہ ہوں اور لوگوں کے سفلی جذبات مشتعل کر کے اپنا اتو سیدھا کرتا ہوں۔ مجھ پر چار مقدمے چل چکے ہیں۔ ان چار اُلوؤں کو سیدھا کرنے میں جو خم میری کمر میں پیدا ہوا۔ اس کو کچھ میں ہی جانتا ہوں۔

مالی حالت کچھ پہلے ہی کمزور تھی۔ آس پاس کے ماحول نے جب نکما کر دیا تو آمدنی کے محدود ذرائع اور بھی سکڑ گئے۔ ایک صرف مکتبہ جدید لاہور کے چودھری برادران تھے جو مقدور بھر میری امداد کر رہے تھے۔ غم غلط کرنے کے لئے جب میں نے کثرت سے شراب نوشی شروع کی۔ تو انھوں نے چاہا کہ اپنا ہاتھ روک لیں۔ مگر وہ اتنے مخلص تھے کہ مجھے ناراض کرنا نہیں چاہتے تھے۔

اس زمانے میں میری کسی سے خط و کتابت نہیں تھی۔ دراصل میرا دل بالکل اُچاٹ ہو چکا تھا۔ اکثر گھر سے باہر رہتا۔ اور اپنے شرابی دوستوں کے گھر پڑا رہتا۔ جن کا ادب سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ ان کی صحبت میں رہ کر میں جسمانی و روحانی خودکشی کی کوشش میں مصروف تھا۔

ایک دن مجھے کسی اور کے گھر کے پتے سے ایک خط ملا۔ تحسین پکچرز کے مالک کی طرف سے تھا۔ لکھا تھا کہ میں فوراً ملوں۔ بمبے سے انھیں میرے بارے میں کوئی ہدایت موصول ہوئی ہے۔ صرف یہ معلوم کرنے کے لئے کہ یہ ہدایت بھیجنے والا

کون ہے۔ میں تحسین پکچر زوالوں سے ملا۔ معلوم ہوا کہ بمبئے سے شیام کے پے درپے انھیں کئی تار ملے ہیں کہ مجھے ڈھونڈھ کر ۵۰۰ روپے دے دیئے جائیں۔ میں جب دفتر میں پہنچا۔ تو وہ شیام کے تازہ تاکیدی تار کا جواب لکھ رہے تھے۔ کہ تلاشِ بسیار کے باوجود انھیں منٹو نہیں مل سکا۔

میں نے ۵۰۰ روپے لے لیئے۔ اور میری مخمور آنکھوں میں آنسو آگئے۔

میں نے بہت کوشش کی۔ کہ شیام کو خط لکھ کر اس کا شکریہ ادا کروں اور پوچھوں کہ اس نے مجھے یہ ۵۰۰ روپے کیوں بھیجے تھے۔ کیا اس کو علم تھا۔ کہ میری مالی حالت کمزور ہے۔ اس غرض سے میں نے کئی خط لکھے اور پھاڑ دیئے۔ ایسا محسوس ہوتا کہ میرے لکھے ہوئے الفاظ شیام کے اُس جذبے کا منہ چڑا رہے ہیں جس کے زیر اثر اُس نے مجھے یہ روپے روانہ کئے تھے۔

پچھلے سال جب شیام اپنے ذاتی فلم کی نمائش کے سلسلے میں امرت سر آیا۔ تو تھوڑی دیر کے لیئے لاہور بھی آگیا۔ یہاں اس نے بہت سے لوگوں سے میرا اتا پتا پوچھا۔ مگر اس دوران میں اتفاق سے مجھے ہی معلوم ہوگیا۔ کہ وہ لاہور میں موجود ہے۔ میں اسی وقت دوڑا اس سینما پہنچا۔ جہاں وہ ایک دعوت کھا کے آرہا تھا۔

میرے ساتھ رشید عطرے تھا۔ شیام کا پونے کا پرانا دوست۔ جب موٹر سینما کے صحن میں داخل ہوئی تو شیام نے مجھے اور رشید کو دیکھ لیا۔ ایک زور کا نعرہ

اُس نے بلند کیا۔ اُس نے ڈرائیور سے موٹر روکنے کے لیئے بہت کہا۔ مگر اس کے استقبال کے لیئے اس قدر ہجوم تھا کہ ڈرائیور نہ رُکا۔ موٹر سے نکل کر پولیس کی مدد سے شیام اور اوم ایک ہی قسم کا لباس اور سر پر سفید پانامہ ہیٹ پہنے سینما کے اندر پچھلے دروازے سے داخل ہوئے۔ بڑے دروازے سے ہم اندر پہنچے۔

شیام ـــــ وہی شیام تھا۔ مسکراتا، ہنستا اور قہقہے لگاتا شیام۔

دوڑ کر ہم دونوں سے لپٹ گیا۔ پھر اس قدر شور مچا۔ کہ ہم میں سے کوئی بھی مطلب کی بات نہ کر سکا۔ اُوپر تلے اتنی باتیں ہوئیں کہ انبار لگ گئے اور ہم ان کے نیچے دب کے رہ گئے۔ سینما سے فارغ ہو کر اُسے ایک فلم ڈسٹری بیوٹر کے دفتر میں جانا تھا۔ ہمیں بھی اپنے ساتھ لے گیا۔ یہاں جو بات بھی شروع ہوتی، فوراً کٹ جاتی۔ لوگ دھڑا دھڑ آ رہے تھے۔ نیچے بازار میں ہجوم شور برپا کر رہا تھا۔ کہ شیام درشن دینے کے لیئے باہر بیلکنی میں آئے۔

شیام کی حالت عجیب و غریب تھی۔ اس کو لاہور میں اپنی موجودگی کا شدید احساس تھا۔ اس لاہور میں جس کی متعدد سڑکوں پر اُس کے رومانوں کے چھینٹے بکھرا کرتے تھے۔ اس لاہور میں جس کا فاصلہ اب امرتسر سے ہزار دل میل ہو گیا تھا۔ اور اس کا راولپنڈی کہاں تھا۔ جہاں اُس نے اپنے لڑکپن کے دن گذارے تھے؟ لاہور، امرتسر اور راولپنڈی، سب اپنی اپنی جگہ پر تھے مگر وہ دن نہیں تھے۔ وہ راتیں نہیں تھیں جو شیام یہاں چھوڑ کر گیا تھا۔ سیاست

کے گوپن نے انھیں نہ معلوم کہاں دفن کر دیا تھا۔

شیام نے مجھ سے کہا۔ میرے ساتھ رہو مگر اس کے دل و دماغ کی مضطرب کیفیت کے احساس نے مجھے سخت پراگندہ کر دیا۔ اُس سے یہ وعدہ کر کے کہ رات کو اس سے فلیٹی ہوٹل میں ملوں گا۔ چلا گیا۔

شیام سے اتنی دیر کے بعد ملاقات ہوئی تھی مگر خوشی کے بجائے ایک عجیب قسم کی گھٹی گھٹی کوفت محسوس ہو رہی تھی۔ طبیعت میں اس قدر جھنجھلاہٹ تھی کہ جی چاہتا تھا۔ کسی سے زبردست لڑائی ہو جائے۔ خوب مار کٹائی ہو اور میں تھک کر سو جاؤں۔ گھٹن کا تجزیہ کیا تو کہاں کا کہاں پہنچ گیا۔ ایک ایسی جگہ جہاں خیالات کے سارے دھاگے بُری طرح آپس میں اُلجھ گئے۔ اس سے طبیعت اور بھی جھنجھلا گئی۔ اور فلیٹیز میں جا کر میں نے ایک دوست کے کمرے میں پینا شروع کر دی۔

نو ساڑھے نو کے قریب شور سننے پر معلوم ہوا کہ شیام آ گیا ہے۔ اس کے کمرے میں ملنے والوں کی ویسی ہی بھیڑ تھی۔ تھوڑی دیر وہاں بیٹھا۔ مگر کھل کر کوئی بات نہ ہوئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ ہم دونوں کے جذبات میں تالے لگا کر چابیاں کسی نے ایک بہت بڑے گچھے میں پرو دی تھیں۔ ہم دونوں اس گچھے میں سے ایک ایک چابی نکال کر یہ تالے کھولنے کی کوشش کرتے اور ناکام رہتے تھے۔

میں اُکتا گیا۔ ڈنر کے بعد شیام نے بڑی جذباتی قسم کی تقریر کی۔ مگر میں نے اس کا ایک لفظ تک نہ سنا۔ میرا اپنا دماغ بڑے اُونچے سُروں میں جانے کیا بک رہا تھا۔ شیام نے اپنی بکواس ختم کی۔ تو لوگوں نے بھرے پیٹ کے ساتھ تالیاں پیٹیں۔ میں اُٹھ کر کمرے میں چلا آیا۔ وہاں فضلی بیٹھے تھے۔ ان سے ایک معمولی بات پر جھک ہو گئی۔ شیام آیا تو اُس نے کہا۔ "یہ سب لوگ ہیرا منڈی جا رہے ہیں۔ چلو آؤ تم بھی چلو۔"

میں قریب قریب رو دیا۔ "میں نہیں جاتا۔ تم جاؤ اور تمہارے یہ لوگ جائیں۔"

"تو میرا انتظار کرو — میں ابھی آیا۔"

یہ کہہ کر شیام ہیرا منڈی جانے والی پارٹی کے ساتھ چلا گیا۔ میں نے شیام کو اور فلمی صنعت سے متعلق تمام لوگوں کو موٹی موٹی گالیاں دیں۔ اور فضلی سے کہا۔ "میرا خیال ہے۔ آپ تو یہاں انتظار کریں گے۔ اگر تکلیف نہ ہو۔ تو ازراہِ کرم اپنی موٹر میں مجھے میرے گھر تک چھوڑ آئیے۔"

رات بھر اُوٹ پٹانگ خواب دیکھتا رہا۔ شیام سے کئی مرتبہ لڑائی ہوئی۔ صبح دودھ والا آیا۔ تو میں کھولے غصے میں اُس سے کہہ رہا تھا۔ "تم بالکل بدل گئے ہو...... اُلّو کے پٹھے، کمینے، ذلیل...... تم ہندو ہو۔"

نیند کھلی تو میں نے محسوس کیا۔ کہ میرے منہ سے ایک بہت بڑی گالی نکل گئی ہے۔ لیکن جب میں نے خود کو اچھی طرح ٹٹولا۔ تو یقین ہو گیا۔ کہ وہ میرا منہ

نہیں تھا۔ سیاست کا بھونپو تھا۔ جس سے یہ گالی نکلی تھی۔ اس کے متعلق سوچتے ہوئے میں نے دودھ والے سے دودھ لیا۔ جس میں ایک چوتھائی پانی تھا۔ اس خیال نے مجھے بڑی ڈھارس دی۔ کہ شیام ہندو تھا۔ مگر پانی ملا ہندو نہیں تھا۔

عرصہ ہوا جب تقسیم پر ہندو مسلمانوں میں خونریز جنگ جاری تھی۔ اور طرفین کے ہزاروں آدمی روزانہ مرتے تھے۔ شیام اور میں راولپنڈی سے بھاگے ہوئے ایک سکھ خاندان کے پاس بیٹھے تھے۔ اس کے افراد اپنے تازہ زخموں کی روداد سنا رہے تھے۔ جو بہت ہی دردناک تھی۔ شیام متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ ہلچل جو اُس کے دل و دماغ میں مچ رہی تھی۔ اس کو میں بخوبی سمجھتا تھا جب ہم وہاں سے رخصت ہوئے۔ تو میں نے شیام سے کہا۔ "میں مسلمان ہوں کیا تمہارا جی نہیں چاہتا کہ مجھے قتل کر دو۔"

شیام نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔ "اس وقت نہیں ـــ لیکن اُس وقت جبکہ میں مسلمانوں کے ڈھائے ہوئے مظالم کی داستان سن رہا تھا ـــ میں تمہیں قتل کر سکتا تھا۔"

شیام کے منہ سے یہ سن کر میرے دل کو زبردست دھکا لگا۔ اس وقت شاید میں بھی اُسے قتل کر سکتا۔ مگر بعد میں جب میں نے سوچا اور اُس وقت اور اس وقت میں زمین و آسمان کا فرق محسوس کیا۔ تو ان تمام فسادات کا نفسیاتی پس منظر میری سمجھ میں آ گیا۔ جس میں روزانہ سینکڑوں بے گناہ ہندو اور مسلمان

موت کے گھاٹ اتارے جارہے تھے۔

اِس وقت نہیں —— اُس وقت ہاں ...... کیوں؟ آپ سوچیے تو آپ کو اس کیوں کے پیچھے انسان کی فطرت میں اس سوال کا صحیح جواب مل جائیگا۔

بمبئی میں بھی فرقہ وارانہ کشیدگی دن بدن بڑھتی چلی جارہی تھی۔ بمبے ٹاکیز کی عنانِ حکومت جب اشوک اور واچا نے سنبھالی۔ تو بڑے بڑے عہدے اتفاق سے مسلمانوں کے ہاتھ میں چلے گئے۔ اس سے بمبے ٹاکیز کے ہندو اسٹاف میں نفرت اور غصّے کی لہر دوڑ گئی۔ واچا کو گمنام خط موصول ہونے لگے جن میں اسٹڈیو کو آگ لگانے اور مرنے مارنے کی دھمکیاں ہوتی تھیں۔ اشوک اور واچا دونوں کو ان کی کوئی پروا نہیں تھی۔ لیکن کچھ ذکی الحس ہونے کے باعث اور کچھ مسلمان ہونے کی وجہ سے میں حالات کی نزاکت کو بہت زیادہ اہمیت دے رہا تھا۔ کئی مرتبہ میں نے اشوک اور واچا سے اپنی تشویش کا اظہار کیا۔ اور اُن کو رائے دی کہ وہ مجھے بمبے ٹاکیز سے الگ کر دیں۔ کیونکہ ہندو یہ سمجھتے تھے کہ صرف میری وجہ سے مسلمان وہاں داخل ہو رہے ہیں۔ مگر انھوں نے کہا۔ کہ میرا دماغ خراب ہے۔

دماغ میرا واقعی خراب ہو رہا تھا۔ بیوی بچے پاکستان میں تھے۔ جب وہ ہندوستان کا ایک حصّہ تھا۔ تو میں اُسے جانتا تھا۔ اس میں وقتاً فوقتاً جو ہندو مسلم فسادات ہوتے رہتے تھے۔ میں ان سے بھی واقف تھا۔ مگر اب اس

خطۂ زمین کو نئے نام نے کیا بنا دیا تھا۔ اس کا مجھے علم نہیں تھا۔ اپنی حکومت کیا ہوتی ہے؟ اس کی تصویر بھی کوشش کے باوجود میرے ذہن میں نہیں آتی تھی۔

۱۴ اگست کا دن میرے سامنے بمبئے میں منایا گیا۔ پاکستان اور ہندوستان دونوں آزاد ملک قرار دئیے گئے تھے۔ لوگ بہت مسرور تھے۔ مگر قتل اور آگ کی وارداتیں باقاعدہ جاری تھیں۔ ہندوستان زندہ باد کے ساتھ ساتھ پاکستان زندہ باد کے نعرے بھی لگتے تھے۔ کانگرس کے ترنگے کے ساتھ اسلامی پرچم بھی لہراتا تھا۔ پنڈت جواہر لال نہرو اور قائدِ اعظم محمد علی جناح دونوں کے نعرے بازاروں اور سڑکوں میں گونجتے تھے۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ہندوستان اپنا وطن ہے یا پاکستان۔ اور وہ لہو کس کا ہے۔ جو ہر روز اتنی بیدردی سے بہایا جا رہا ہے۔ وہ ہڈیاں کہاں جلائی یا دفن کی جائیں گی۔ جن پر سے مذہب کا گوشت پوست، چیلیں اور گدھ نوچ نوچ کر کھا گئے تھے۔ اب کہ ہم آزاد ہوئے ہیں، ہمارا غلام کون ہو گا۔ جب غلام تھے تو آزادی کا تصوّر کر سکتے تھے۔ اب آزاد ہوئے ہیں تو غلامی کا تصوّر کیا ہو گا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ہم آزاد بھی ہوئے ہیں یا نہیں۔

ہندو اور مسلمان دھڑا دھڑ مر رہے تھے۔ کیسے مر رہے تھے، کیوں مر رہے تھے ——— ان سوالوں کے مختلف جواب تھے۔ ہندوستانی جواب پاکستانی جواب، انگریزی جواب، ہر سوال کا جواب موجود تھا۔ مگر اس جواب میں حقیقت تلاش کرنے کا سوال پیدا ہوتا۔ تو اس کا کوئی جواب نہ ملتا۔ کوئی

کہتا اسے غدر کے کھنڈرات میں تلاش کرو کوئی کہتا نہیں۔ یہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت میں ملے گا۔ کوئی اور پیچھے ہٹ کر اسے مغلیہ خاندان کی تاریخ میں ٹٹولنے کے لئے کہتا۔ سب پیچھے ہی پیچھے ہٹتے جاتے تھے۔ اور قاتل اور سفاک برابر آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ اور لہو اور لوہے کی ایسی تاریخ لکھ رہے تھے۔ جس کا جواب تاریخ عالم میں کہیں بھی نہیں ملتا۔

ہندوستان آزاد ہو گیا تھا۔ پاکستان عالم وجود میں آتے ہی آزاد ہو گیا تھا۔ لیکن انسان ان دونوں مملکتوں میں غلام تھا۔ تعصب کا غلام ـــــ مذہبی جنون کا غلام۔ حیوانیت و بربریت کا غلام ـــــ

میں نے بمبئے ٹاکیز جانا چھوڑ دیا۔ اشوک اور واچا آتے تو میں خرابیٔ طبیعت کا بہانہ کہہ دیتا۔ اسی طرح کئی دن گذر گئے۔ شیام مجھے دیکھتا اور مسکرا دیتا۔ اس کو میری قلبی کیفیات کا بخوبی علم تھا۔ کچھ دن بہت زیادہ پی کر میں نے یہ شغل بھی چھوڑ دیا تھا۔ سارا دن گم سم سوفے پر لیٹا رہتا۔ ایک دن شیام اسٹڈیو سے آیا۔ تو اس نے مجھے لیٹا دیکھ کر مزاحیہ انداز میں کہا۔ "کیوں خواجہ جگالی کر رہے ہو؟"

مجھے بہت جھنجھلاہٹ ہوتی تھی۔ کہ شیام میری طرح کیوں نہیں سوچتا۔ اس کے دل و دماغ میں وہ طوفان کیوں برپا نہیں ہیں جن کے ساتھ میں دن رات لڑتا رہتا ہوں۔ وہ اسی طرح مسکراتا، ہنستا اور شور مچاتا رہتا۔ مگر

شاید وہ اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا۔ کہ جو فضا اس وقت گردوپیش تھی۔ اس میں سوچنا بالکل بیکار ہے۔

میں نے بہت غور و فکر کیا۔ مگر کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ آخر تنگ آکر میں نے کہا ہٹاؤ چلیں یہاں سے ــــ شیام کی نائٹ شوٹنگ تھی۔ میں نے اپنا اسباب وغیرہ باندھنا شروع کر دیا۔ ساری رات اسی میں گذر گئی صبح ہوئی تو شیام شوٹنگ سے فارغ ہو کر آیا۔ اس نے میرا بندھا ہوا اسباب دیکھا۔ تو مجھ سے صرف اتنا پوچھا۔ "چلے؟"

میں نے بھی صرف اتنا ہی کہا۔ "ہاں!"

اس کے بعد میرے اور اس کے درمیان ہجرت کے متعلق کوئی بات نہ ہوئی۔ بقایا سامان رکھوانے میں اُس نے میرا ہاتھ بٹایا۔ اس دوران میں رات کی شوٹنگ کے لطیفے بیان کرتا رہا۔ اور خوب ہنستا رہا۔ جب میرے رخصت ہونے کا وقت آیا۔ تو اُس نے الماری میں سے برانڈی کی بوتل نکالی۔ دو پیگ بنائے اور ایک مجھے دے کر کہا۔ "ہپ ٹلّا"

میں نے جواب میں ہپ ٹلّا کہا۔ اور اس نے قہقہے لگاتے ہوئے مجھے اپنے چوڑے سینے کے ساتھ بھینچ لیا۔ "سؤر کہیں کے۔"

میں نے اپنے آنسو روکے "پاکستان کے۔"

شیام نے پُرخلوص نعرہ بلند کیا۔ "زندہ باد پاکستان۔"

"زندہ باد ہندوستان۔" اور میں نیچے چلا گیا۔ جہاں ٹرک والا میرا انتظار کر رہا تھا۔

بندرگاہ تک شیام میرے ساتھ گیا۔ جہاز چلنے میں کافی دیر تھی۔ وہ اِدھر اُدھر کے لطیفے سنا کر میرا دل بہلاتا رہا۔ جب وسل ہوا۔ تو اُس نے ہپ ٹلّا کہہ کر میرا ہاتھ دبایا۔ اور "گینگ وے" سے نیچے اُتر گیا — مڑ کر اُس نے میری طرف نہ دیکھا اور مضبوط قدم اُٹھاتا بندرگاہ سے باہر چلا گیا۔

میں نے لاہور پہنچ کر اس کو خط لکھا۔ انیس ایک اڑتالیس کو اس کا جواب آیا:

یہاں تمھیں سب لوگ یاد کرتے ہیں۔ تمھاری اور تمھاری بذلہ سنجی کی غیر موجودگی محسوس کرتے ہیں۔ جو تم بڑی فراخدلی سے اُن پر ضائع کرتے تھے۔ واچا ابھی تک اس بات پر مُصر ہے کہ تم کنّی کترا گئے۔ اب کی دفعہ اس کو اطلاع دیئے بغیر پاکستان بھاگ کر۔ عجیب متناقض بات ہے کہ وہ جو بمبئے ٹاکیز میں مسلمانوں کے داخلے کی مخالفت میں سب سے آگے تھا۔ سب سے پہلا آدمی تھا۔ جو پاکستان بھاگ کر چلا گیا — خود کو اپنے نظریے کا شہید بناتے ہوئے — یہ واچا کا اپنا نظریہ ہے۔ مجھے امید ہے کہ تم نے اُس کو ضرور خط لکھا ہوگا اگر نہیں لکھا۔ تو فوراً لکھو کم از کم شرافت کا یہی تقاضا ہے۔

تمھارا شیام

آج چودہ اگست ہے۔ وہ دن جب پاکستان اور ہندوستان آزاد ہوئے تھے۔ اِدھر اور اُدھر دونوں طرف خوشیاں منائی جا رہی ہیں۔ اور ساتھ ہی ساتھ حملے اور دفاع کی تیاریاں بھی زور شور سے جاری ہیں —— میں شیام کی روح سے مخاطب ہوتا ہوں۔ "پیارے شیام میں بمبئے ٹاکیز چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ کیا پنڈت جواہر لال نہرو کشمیر نہیں چھوڑ سکتے —— ہے نا ہپ ٹلّا بات ؟"

پری چہرہ نسیم بانو

میرا فلم دیکھنے کا شوق امرتسر ہی میں ختم ہو چکا تھا۔ اس قدر فلم دیکھے تھے کہ اب اُن میں میرے لیئے کوئی کشش ہی نہ رہی تھی۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ جب میں ہفتہ وار "مصوّر" کو ایڈٹ کرنے کے سلسلے میں بمبئی پہنچا۔ تو مہینوں کسی سینما کا رُخ نہ کیا۔ پرچہ فلمی تھا۔ ہر فلم کا پاس مل سکتا تھا۔ مگر طبیعت ادھر راغب ہی نہ تھی۔

بمبے ٹاکیز کا ایک فلم "اچھوت کنیا" ان دنوں ایک سینما میں ہفتوں سے چل رہا تھا۔ جب اس کی نمائش کا بائیسواں ہفتہ شروع ہؤا۔ تو میں نے سوچا اس فلم میں کیا ہے جو اتنی دیر سے چل رہا ہے۔ دیکھنا چاہیے۔

بمبئی میں یہ میرا پہلا فلم تھا۔ مَیں نے اِس میں پہلی مرتبہ اشوک کمار اور دیوکارانی کو دیکھا۔ اشوک کمار کا ایکٹنگ خام تھا۔ مگر دیوکارانی کا کام بہت منجھا ہؤا تھا۔ فلم

مجموعی طور پر کامیاب تھا۔ ایک خاص بات جو میں نے نوٹ کی یہ تھی کہ اس میں سوفیانہ پن نہیں تھا۔ ایک سیدھی سادی کہانی تھی جو بڑے صاف ستھرے انداز میں پیش کی گئی تھی۔ میں نے اب گاہے گاہے فلم دیکھنے شروع کر دیے۔

ان دنوں ایکٹرسوں میں ایک ایکٹرس نسیم بانو خاص مشہور تھی۔ اس کی خوبصورتی کا بہت چرچا تھا۔ اشتہاروں میں اسے پری چہرہ نسیم کہا جاتا تھا۔ میں نے اپنے ہی اخبار میں اُس کے کئی فوٹو دیکھے تھے۔ خوش شکل تھی۔ جوان تھی۔ خاص طور پر آنکھیں بڑی پرکشش تھیں اور جب آنکھیں پرکشش ہوں تو سارا چہرہ پرکشش بن جاتا ہے۔

نسیم کے غالباً دو فلم تیار ہو چکے تھے۔ جو سہراب مودی نے بنائے تھے۔ اور عوام میں کافی مقبول ہوئے تھے۔ یہ فلم میں نہیں دیکھ سکا۔ معلوم نہیں کیوں؟ عرصہ گذر گیا۔ اب منروا مووی ٹون کی طرف سے اُس کے شاندار تاریخی فلم "پکار" کا اشتہار بڑے زوروں پر ہو رہا تھا۔ پری چہرہ نسیم اس میں نورجہاں کے روپ میں پیش کی جا رہی تھی۔ اور سہراب مودی خود اس میں ایک بڑا اہم کردار ادا کر رہے تھے۔

فلم کی تیاری میں کافی وقت صرف ہوا۔ اس دوران میں اخباروں اور رسالوں میں جو "اسٹل" شائع ہوئے بڑے شاندار تھے۔ نسیم، نورجہاں کے لباسِ فاخرہ میں بڑی پُروقار دکھائی دیتی تھی۔

"پکار" کی نمائش عظمیٰ پر میں مدعو تھا۔ جہانگیر کے عدل و انصاف کا ایک من گھڑت قصہ تھا۔ جو بڑے جذباتی اور تھیٹری انداز میں پیش کیا گیا تھا۔ فلم میں دو باتوں پر بہت زور تھا۔ مکالموں پر اور ملبوسات پر۔ مکالمے گو غیر فطری اور تھیٹری تھے۔ لیکن بہت زوردار اور پرشکوہ تھے۔ جو سننے والوں پر اثر انداز ہوتے تھے چونکہ ایسا فلم اس سے پہلے نہیں بنا تھا۔ اس لئے سہراب مودی کا "پکار" سونے کی کان ثابت ہونے کے علاوہ ہندوستانی صنعت فلم سازی میں ایک انقلاب پیدا کرنے کا موجب ہوا۔

نسیم کی اداکاری کمزور تھی۔ لیکن اس کمزوری کو اُس کے خداداد حسن اور نورجہاں کے لباس نے جو اس پر خوب سجتا تھا اپنے اندر چھپا لیا تھا۔ مجھے یاد نہیں رہا۔ خیال ہے کہ "پکار" کے بعد نسیم غالباً دو تین فلموں میں پیش ہوئی۔ مگر یہ فلم کامیابی کے لحاظ سے "پکار" کا مقابلہ نہ کر سکے۔

اس دوران میں نسیم کے متعلق طرح طرح کی افواہیں پھیل رہی تھیں۔ فلمی دنیا میں اسکینڈل عام ہوتے ہیں۔ کبھی یہ سننے میں آتا تھا کہ سہراب مودی نسیم بانو سے شادی کرنے والا ہے۔ کبھی اخباروں میں یہ خبر شائع ہوتی تھی۔ کہ نظام حیدرآباد کے صاحبزادے معظم جاہ صاحب نسیم بانو پر ڈورے ڈال رہے ہیں اور عنقریب اسے لے اڑیں گے۔ یہ خبر درست تھی۔ کیونکہ شہزادے کا قیام اُن دنوں اکثر بمبئی میں ہوتا تھا۔ اور وہ کئی بار نسیم کے مکان واقع میرین ڈرائیو پر دیکھے گئے تھے۔

شہزادے نے لاکھوں روپے خرچ کیے۔ بعد میں جن کا حساب دینے کے سلسلے میں انھیں بڑی الجھنوں کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن یہ بعد کی بات تھی۔ آپ روپے کے زور سے نسیم کی والدہ شمشاد عرف چھمیاں کو رضامند کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ چنانچہ پری چہرہ نسیم کا التفات خرید کر آپ اُسے اُس کی والدہ سمیت حیدر آباد لے گئے۔

تھوڑے ہی عرصے کے بعد جہاں دیدہ چھمیاں نے یہ محسوس کیا کہ حیدر آباد ایک قید خانہ ہے۔ جس میں اسکی بچّی کا دم گھٹ رہا ہے۔ آرام و آسائش کے تمام سامان موجود تھے۔ مگر فضا میں گھٹن سی تھی۔ پھر کیا پتہ تھا کہ شہزادے کی لاابالی طبیعت میں ایکا ایکی انقلاب آجاتا اور نسیم بانو ادھر کی رہتی نہ اُدھر کی۔ چنانچہ چھمیاں نے حکمتِ عملی سے کام لیا۔ حیدر آباد سے نکلنا بہت مشکل تھا۔ مگر وہ اپنی بچّی نسیم کے ساتھ واپس بمبئی آنے میں کامیاب ہوگئی۔

اس کی آمد پر کافی شور مچا۔ بڑی پوسٹر بازی ہوئی۔ دو پارٹیاں بن گئی تھیں۔ ایک شہزادہ معظم جاہ کے کاسہ لیسوں کی۔ دوسری نسیم بانو کے ہمدردوں کی بہت دیر تک کیچڑ اُچھالی گئی۔ اس کے بعد یہ معاملہ خاموش ہوگیا۔

میں اب فلمی دنیا میں داخل ہو چکا تھا۔ کچھ دیر "منشی" کی حیثیت سے امپیریل فلم کمپنی میں کام کیا۔ یعنی ڈائرکٹروں کے حکم کے مطابق الٹی سیدھی زبان میں فلموں کے مکالمے لکھتا رہا، ساٹھ روپے ماہوار پر، ترقی کی تو ہندوستان سِنے ٹون

پری چہرہ نسیم بانو

میں سیٹھ نانو بھائی ڈیسائی کے یہاں سو روپے ماہوار پہ ملازم ہو گیا۔ یہاں میں نے اپنی پہلی فلمی کہانی "مڈ" کے عنوان سے لکھی۔ اس کا عرف "اپنی نگریا" تھا۔ کہنا یہ ہے کہ فلمی حلقے اب میرے نام سے واقف ہو چکے تھے۔

اس دوران میں ایک اعلان نظروں سے گذرا کہ کوئی صاحب احسان ہیں۔ انھوں نے ایک فلم کمپنی تاج محل پکچرز کے نام سے قائم کی ہے۔ پہلا فلم "اجالا" ہو گا۔ جس کی ہیروئن پری چہرہ نسیم بانو ہے۔

اس فلم کے بنانے والوں میں دو مشہور ہستیاں تھیں۔ "پکار" کا مصنف کمال امروہی اور پکار ہی کا پبلسٹی منیجر ایم۔ اے مغنی فلم کی تیاری کے دوران میں کئی جھگڑے کھڑے ہوئے۔ امیر حیدر کمال امروہی اور ایم۔ اے مغنی کی کئی بار آپس میں چخ ہوئی۔ یہ دونوں حضرات غالباً عدالت تک بھی پہنچے۔ مگر "اجالا" انجام کار مکمل ہو ہی گیا۔

کہانی معمولی تھی۔ موسیقی کمزور تھی۔ ڈائرکشن میں کوئی دم نہیں تھا۔ چنانچہ یہ فلم کامیاب نہ ہوا اور احسان صاحب کو کافی خسارہ اٹھانا پڑا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کو اپنا کاروبار بند کرنا پڑا۔

مگر اس کاروبار میں وہ اپنا دل نسیم بانو کو دے بیٹھے۔ احسان صاحب کے لئے نسیم اجنبی نہیں تھی۔ اُن کے والد خان بہادر محمد سلیمان چیف انجنیئر نسیم کی والدہ عرف چھمیاں کے پرستار تھے۔ بلکہ یوں کہئے کہ ایک لحاظ سے وہ اُن کی دوسری بیوی

تھی۔ احسان صاحب کو یقیناً نسیم سے ملنے کا اتفاق ہوا ہو گا۔ فلم کی تیاری کے دوران میں تو خیر وہ نسیم کے بالکل قریب رہے تھے۔ لیکن لوگوں کا بیان ہے کہ احسان اپنی جھینپو اور شرمیلی طبیعت کے باعث نسیم سے پوری طرح کھل نہیں سکے تھے۔ سیٹ پر آتے تو خاموش ایک کونے میں بیٹھے رہتے۔ نسیم سے بہت کم بات کرتے۔ کچھ بھی ہو آپ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے۔ کیونکہ ایک دن ہم نے سنا۔ کہ پری چہرہ نسیم نے مسٹر احسان سے دلّی میں شادی کر لی ہے۔ اور یہ ارادہ ظاہر کیا ہے۔ کہ وہ اب فلموں میں کام نہیں کرے گی۔

نسیم بانو کے پرستاروں کے لیئے یہ خبر بڑی افسوس ناک تھی۔ اس کے حسن کا جلوہ کیونکہ صرف ایک آدمی کے لیئے وقف ہو گیا تھا۔

احسان اور نسیم کا عشق تمام مراحل طے کر کے شادی کی منزل تک کیسے پہنچا۔ مجھے اس کا علم نہیں لیکن اس سلسلے میں اشوک کمار کا بیان بہت دلچسپ ہے۔ اشوک ایک صاحب کیپٹن صدیقی کا دوست تھا۔ یہ مسٹر احسان کے قریبی عزیز تھے۔ "اجالا" میں انھوں نے کافی روپیہ لگایا تھا۔

اشوک قریب قریب ہر روز کیپٹن صدیقی کے یہاں جایا کرتا تھا۔ کچھ دنوں سے وہ محسوس کر رہا تھا کہ کیپٹن صاحب کے گھر کی فضا بدلی ہوئی ہے۔ شروع شروع میں تو وہ کچھ سمجھ نہ سکا۔ لیکن ایک دن اس کی ناک نے محسوس کیا۔ کہ ہوائیں بہت ہی عمدہ سینٹ کی خوشبو بسی ہوئی ہے۔ اشوک نے ازراہِ مذاق کیپٹن صدیقی سے

اس خوشبو کے ماخذ کے بارے میں پوچھا۔ لیکن وہ گول کر گئے۔

ایک دن جب اشوک، صدیقی صاحب کے گھر گیا۔ تو وہ موجود نہیں تھے۔ لیکن وہ خوشبو موجود تھی۔ بڑی لطیف لیکن بڑی شریر۔ اشوک نے سونگھ سونگھ کر ناک کے ذریعے سے معلوم کر لیا کہ یہ اُوپر کی منزل سے آ رہی ہے۔ سیڑھیاں طے کر کے وہ اُوپر پہنچا۔ کمرے کے کواڑ تھوڑے سے کھلے تھے۔ اشوک نے جھانک کر دیکھا۔ نسیم بانو پلنگ پر لیٹی تھی۔ اور اس کے پہلو میں ایک صاحب بیٹھے اُس سے ہولے ہولے باتیں کر رہے تھے۔ اشوک نے پہچان لیا۔ مسٹر احسان تھے جن سے اس کا تعارف ہو چکا تھا۔

اشوک نے جب کیپٹن صدیقی سے اس معاملے کے متعلق بات کی تو وہ مسکرائے "یہ سلسلہ کافی دیر سے جاری ہے۔"

اشوک کے اس بیان سے نسیم اور احسان کے اس معاشقے پر جو روشنی پڑتی ہے اس پر کسی تبصرے کی ضرورت نہیں۔ عشق و محبّت میں جو کچھ ہوتا ہے ہوا ہو گا۔ مجھے اتنا علم ہے کہ احسان کی والدہ اور بہنیں سخت خلاف تھیں کہ وہ نسیم سے شادی کرے۔ چنانچہ اس سلسلے میں بہت جھگڑے ہوئے۔ مگر خان بہادر محمد سلیمان صاحب کو کوئی اعتراض نہیں تھا۔ اس لئے یہ شادی عمل میں آ گئی۔ اور نسیم فلمی دنیا سے دُور دلّی میں رہنے لگی۔ جہاں اس نے اپنے بچپن کے دن گزارے تھے۔

شادی پر اور شادی کے بعد کچھ دیر اخباروں میں ہنگامہ رہا۔ مگر پھر نسیم فلمی

حلقوں سے اوجھل ہوگئی۔

اس دوران میں فلمی دنیا میں کئی انقلاب آئے۔ کئی فلم کمپنیاں بنیں۔ کئی ٹوٹیں کئی ستارے اُبھرے۔ کئی ڈوبے۔ ہمانسو رائے کی افسوسناک موت کے بعد بمبئی ٹاکیز میں طوائف الملوکی پھیلی ہوئی تھی۔ (دیوکا رانی (مسز ہمانسو رائے) اور رائے بہادر چونی لال (جنرل منیجر) میں بات بات پر چلتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا۔ کہ رائے بہادر اپنے گروپ کے ساتھ بمبئی ٹاکیز سے علیحدہ ہو گئے۔ اس گروپ میں پروڈیوسر ایس مکرجی، افسانہ نگار اور ڈائرکٹر گیان مکرجی مشہور ہیرو اشوک کمار۔ کوی پردیپ۔ ساؤنڈ ریکارڈسٹ ایس واچا۔ کامیڈین وی ایچ ڈیسائی۔ مکالمہ نگار شاہد لطیف اور سنتوشی شامل تھے۔

بمبئی ٹاکیز سے نکلتے ہی اس گروپ نے ایک نئی فلم کمپنی "فلمستان" کے نام سے قائم کی۔ پروڈکشن کنٹرولر ایس مکرجی مقرر ہوئے۔ جو سلور جوبلی فلم بنا کر بہت شہرت حاصل کر چکے تھے۔ کہانی وہانی لکھی گئی۔ اسٹوڈیو نئے سازو سامان سے آراستہ ہو گیا۔ سب ٹھیک ٹھاک تھا۔ مگر پروڈیوسر ایس مکرجی سخت پریشان تھے۔ بمبئے ٹاکیز سے علیحدہ ہو کر وہ دیوکا رانی کو خار دینے کے لئے کوئی سنسنی پھیلانے والی بات پیدا کرنا چاہتے تھے۔ اور یہ بات ہیروئن کے انتخاب کے متعلق تھی۔

بیٹھے بیٹھے ایک دن ایس مکرجی کو یہ سوجھی کہ نسیم بانو کو واپس کھینچ کر لایا جائے یہ وہ زمانہ تھا۔ جب اُسے اپنے اُوپر پورا اعتماد تھا۔ پے درپے کئی کامرانیوں کے بعد اس کو یہ محسوس ہونے لگا تھا۔ کہ وہ جس کام میں ہاتھ ڈالے گا پورا کرلے گا۔

چنانچہ فوراً ہی نسیم بانو تک پہنچنے کے راستے سوچ لئے گئے۔
اشوک کی وجہ سے ایس مکرجی کے بھی کیپٹن صدیقی سے بڑے اچھے تعلقات تھے۔ اس کے علاوہ رائے بہادر چونی لال کے احسان کے والد خان بہادر محمد سلیمان سے بہت بے تکلف مراسم تھے۔ چنانچہ دلی میں نسیم تک رسائی حاصل کرنے میں ایس مکرجی کو کسی مشکل کا سامنا نہ کرنا پڑا۔ لیکن سب سے بڑا مرحلہ پہلے احسان کو اور پھر نسیم کو رضامند کرنا تھا۔
مکرجی کی خود اعتمادی کام آئی۔ احسان نے پہلے تو صاف جواب دے دیا۔ لیکن آخر کار رضامند ہو گیا۔ فتح مند ہو کر جب وہ واپس بمبئی آیا۔ تو اخباروں میں یہ خبر بڑے ٹھاٹ سے شائع کرائی۔ کہ فلمستان کے پہلے فلم "چل چل رے نوجوان" کی ہیروئن پری چہرہ نسیم بانو ہو گی۔ فلمی حلقوں میں سنسنی پھیل گئی۔ کیونکہ نسیم فلمی دنیا سے ہمیشہ کے لئے علٰحدگی اختیار کر چکی تھی۔
یہ اُس زمانے کی بات ہے جب میں ڈیڑھ برس آل انڈیا ریڈیو دلّی کے ساتھ منسلک رہ کر واپس بمبئی آیا تھا۔ اور سیّد شوکت حسین رضوی کے لئے ایک کہانی لکھنے میں مصروف تھا۔
یہ کہانی لکھی گئی۔ چند اور کہانیاں بھی لکھی گئیں۔ اس دوران میں گھر سے نکلنا بہت کم ہوتا تھا۔ میری بیوی میرے اس "گھر بلو پنے" سے تنگ آ گئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ میں یوں اپنی صحت خراب کر رہا ہوں۔

شاہد لطیف سے میرے مراسم علی گڈھ یونیورسٹی سے چلے آ رہے تھے۔ فلمستان کے کاموں سے جب بھی فراغت ملتی۔ میرے یہاں ضرور آتا۔ ایک دن آیا تو میری بیوی نے اس سے کہا۔ "شاہد بھائی اِن سے کہئے کہیں ملازمت کریں۔ گھر بیٹھ کر ان کا کام کرنا مجھے اچھا نہیں لگتا۔ صحت خراب کر رہے ہیں کہیں ملازمت کریں گے تو گھر سے باہر تو قدم رکھا کریں گے۔"

چند روز کے بعد "ملاد" سے شاہد لطیف کا فون آیا۔ کہ پروڈیوسر ایس مکرجی مجھ سے انٹرویو کرنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ سنیریو ڈیپارٹمنٹ کے لئے انھیں ایک آدمی کی ضرورت ہے۔

ملازمت کی مجھے کوئی خواہش نہیں تھی۔ صرف اسٹوڈیو دیکھنے کے لئے میں فلمستان چلا گیا۔ فضا بڑی اچھی تھی جیسے کسی یونیورسٹی کی۔ اس نے مجھے بہت متاثر کیا۔ مکرجی سے ملاقات ہوئی تو وہ مجھے بیحد پسند آئے۔ چنانچہ وہیں کنٹریکٹ پر دستخط کر دئے۔ تنخواہ بہت تھوڑی تھی۔ کل تین سو روپے ماہوار۔ اور فاصلہ بھی کافی تھا۔ الیکٹرک ٹرین سے ایک گھنٹہ کے قریب لگتا تھا۔ "گورے گاؤں" پہنچنے میں۔ لیکن میں نے سوچا ٹھیک ہے۔ تنخواہ تھوڑی ہے لیکن میں ادھر ادھر سے کما لیا کروں گا۔

شروع شروع میں تو فلمستان میں میری حالت اجنبی کی سی تھی۔ لیکن بہت جلد میں تمام اسٹاف کے ساتھ گھل مل گیا۔ ایس مکہ جی سے تو میرے تعلقات دوستانہ حد تک پہنچ گئے تھے۔

اِس دوران میں نسیم بانو کی صرف چند جھلکیاں دیکھنے کا اتفاق ہوُا۔ چونکہ سنیریو لکھا جا رہا تھا۔ اس لیئے وہ چند لمحات کے لیئے موٹر میں آتی اور واپس چلی جاتی تھی۔

ایس مکرجی بڑا مشکل پسند واقع ہوُا ہے۔ مہینوں کہانی کی نوک پلک درست کرنے میں لگ گئے۔ خدا خدا کر کے فلم کی شوٹنگ شروع ہوئی۔ مگر یہ وہ سین تھے جن میں نسیم بانو نہیں تھی۔ بالآخر اس سے ایک روز ملاقات ہوئی۔ اسٹڈیو کے باہر فولڈنگ کرسی پہ بیٹھی تھی۔ ٹانگ پر ٹانگ رکھے تھرموس سے چائے پی رہی تھی۔ اشوک نے میرا اس سے تعارف کرایا۔ خندہ پیشانی سے پیش آئی۔ اور بڑی باریک آواز میں کہا۔ "میں نے ان کے مضامین اور افسانے پڑھے ہیں۔"

تھوڑی دیر رسمی گفتگو ہوئی۔ اور یہ پہلی ملاقات ختم ہوئی۔ چونکہ وہ میک اپ میں تھی۔ اس لیئے میں اس کے اصلی حسن کا اندازہ نہ کر سکا۔ ایک بات جو میں نے خاص طور پر نوٹ کی۔ وہ یہ تھی کہ بولتے وقت اسے کوشش سی کرنی پڑتی تھی۔ یوں کہیئے کہ جب وہ بولتی تھی تو مجھے یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ تھوڑی سی مشقت کر رہی ہے۔

"پکار" کی نسیم میں اور "چل چل رے نوجوان" کی نسیم میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ اُدھر وہ ملکہ نورجہاں کے لباس فاخرہ میں ملبوس! اور اِدھر بھارت سیوادل کی ایک رضاکار کی وردی میں نسیم بانو کو تین چار مرتبہ میک اپ کے بغیر دیکھا تو میں نے سوچا۔ آرائشِ محفل کے لیئے اس سے بہتر عورت اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ وہ جگہ وہ کونہ جہاں وہ بیٹھی یا کھڑی ہوتی ایک دم سج جاتا۔

لباس کے انتخاب میں وہ بہت محتاط ہے۔ اور رنگ چننے کے معاملے میں جو سلیقہ اور قرینہ میں نے اس کے یہاں دیکھا ہے اور کہیں نہیں دیکھا۔ زرد رنگ بڑا خطرناک ہے۔ کیونکہ زرد رنگ کے کپڑے آدمی کو اکثر زرد و مریض بنا دیتے ہیں۔ مگر نسیم کچھ اس بے پروا بے تکلفی سے یہ رنگ استعمال کرتی تھی کہ مجھے حیرت ہوتی تھی۔

نسیم کا محبوب لباس ساڑھی ہے۔ غرارہ بھی پہنتی ہے۔ مگر گاہے گاہے۔ شلوار قمیص پہنتی ہے مگر صرف گھر میں، وہ کپڑے پہنتی ہے۔ استعمال نہیں کرتی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے پاس برسوں کے پرانے کپڑے بڑی اچھی حالت میں موجود ہیں۔

نسیم کو میں نے بہت محنتی پایا۔ بڑی نازک سی عورت ہے۔ مگر سیٹ پر برابر ڈٹی رہتی تھی۔ مگر جی کو مطمئن کرنا آسان کام نہیں۔ کئی کئی ریہرسلیں کرنا پڑتی تھیں۔ گھنٹوں جھلسا دینے والی روشنی کے سامنے اٹھک بیٹھک کرنا پڑتی تھی۔ لیکن میں نے دیکھا کہ نسیم اکتاتی نہیں تھی۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا۔ کہ اس کو اداکاری کا بہت شوق ہے۔ ہم شوٹنگ کے ساتھ ساتھ رشنر دیکھتے تھے۔ نسیم بانو کا کام بس گوارا تھا۔ اس میں چمک نہیں تھی۔ وہ سنجیدہ ادائیں مہیا کر سکتی ہے اپنے مغلئی خدوخال کی حسین جھلکیاں پیش کر سکتی ہے۔ لیکن ناقدانہ نگاہوں کے لئے اداکاری کا جوہر پیش نہیں کر سکتی۔ لیکن پھر بھی "چل چل رے نوجوان" میں اس کا ایکٹنگ پہلے فلموں کے مقابلے میں کچھ بہتر ہی تھا۔

مکرجی اس میں کرختگی اور درشتگی پیدا کرنا چاہتا تھا۔ مگر یہ کیسے پیدا ہوتی۔ نسیم بے حد سرد مزاج ہے۔ چنانچہ نتیجہ یہ ہوا کہ "چل چل رے نوجوان" میں نسیم کا کیریکٹر گڈمڈ ہو کے رہ گیا۔

فلم ریلیز ہوا۔ رات کو تاج میں ایک شاندار پارٹی دی گئی۔ فلم میں نسیم جیسی بھی تھی ٹھیک ہے۔ مگر تاج میں وہ سب سے الگ نظر آتی تھی۔ پر وقار، باعظمت مغلیہ شہزادیوں کی سی شان اور انفرادیت لیئے۔

"چل چل رے نوجوان" کی تیاری میں دو برس۔ دو اکتا دینے والے برس لگ گئے تھے۔ جب فلم توقعات کے مطابق کامیاب اور مقبول نہ ہوا۔ تو ہم سب پر افسردگی طاری ہو گئی۔ مکرجی تو بہت بددل ہوا۔ مگر کنٹریکٹ کے مطابق چونکہ اسے تاج محل پکچرز کے ایک فلم کی نگرانی کرنا تھی اس لیئے کمربستہ ہو کر کام شروع کرنا پڑا۔

فلم "چل چل رے نوجوان" کی تیاری کے دوران میں احسان سے مکرجی کے تعلقات بہت بڑھ گئے تھے۔ جب تاج محل پکچرز کے فلم کا سوال آیا۔ تو احسان نے اس کی پروڈکشن کا سارا بوجھ مکرجی کے کندھوں پر ڈال دیا۔ مکرجی نے مجھ سے مشورہ کیا۔ آخر یہ طے ہوا۔ کہ "بیگم" کے عنوان سے میں ایک ایسی کہانی لکھوں۔ جس میں نسیم کی خوبصورتی کو زیادہ سے زیادہ استعمال کیا جا سکے۔

میں نے ایک خاکہ تیار کیا۔ مکرجی نے اس میں کچھ تبدیلیاں کرائیں۔ جب فلم تیار

ہوا۔ تو میں نے بڑی حیرت سے یہ محسوس کیا کہ جو کہانی میں نے سوچی تھی۔ وہ تو ردی کا غذوں پر ہے اور جو پردے پر چل پھر رہی ہے وہ محض اس کا ہلکا سا سایہ ہے۔

کہانی کا قصّہ چھوڑیئے۔ مجھے کہنا یہ ہے کہ "بیگم" لکھنے کے دوران میں مجھے نسیم بانو کو بہت قریب سے دیکھنے کے مواقع ملے۔ میں اور مکرجی دوپہر کا کھانا اُن کے گھر پر کھاتے تھے اور بہر دونہ رات کو دیر تک کہانی میں ترمیم و تنسیخ کرنے میں مصروف رہتے تھے۔

میرا خیال تھا نسیم بڑے عالیشان مکان میں رہتی ہے لیکن جب گھوڑ بندر روڈ پر اس کے بنگلے میں داخل ہوا۔ تو میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ بنگلہ نہایت شکستہ حالت میں تھا۔ بڑا معمولی قسم کا فرنیچر، جو غالباً کرائے پر لایا گیا تھا۔ گھسا ہوا قالین، دیواریں اور فرش سیل زدہ۔

اس پس منظر کے ساتھ میں نے پری چہرہ نسیم بانو کو دیکھا۔ بنگلے کے برآمدے میں وہ گوالے سے دودھ کے کوپنوں کے متعلق بات چیت کر رہی تھی۔ اس کی دبی دبی آواز، جو ایسا معلوم ہوتا تھا کوشش کے ساتھ حلق سے نکالی جا رہی ہے گوالے سے قبولوا رہی تھی کہ اُس نے آدھ سیر دودھ کا ہیر پھیر کیا ہے۔ آدھ سیر دودھ اور پری چہرہ نسیم بانو جس کے لئے کئی فرہاد دودھ کی نہریں نکالنے کے لئے تیار تھے ــــ میں چکرا گیا۔

آہستہ آہستہ مجھے معلوم ہوا۔ کہ "پکار" کی نورجہاں بڑی گھریلو قسم کی عورت ہے

اور اس میں وہ تمام خصوصیات موجود ہیں۔ جو ایک غایت درجہ گھریلو عورت میں ہوتی ہیں۔ اُس کی پکچر "بیگم" کی پروڈکشن شروع ہوئی۔ تو ملبوسات کا سارا کام اُس نے سنبھال لیا۔ اندازہ تھا کہ دس بارہ ہزار روپے اس مد پر اُٹھ جائیں گے مگر نسیم نے درزی گھر میں بٹھا کر اپنی پرانی ساڑھیوں، قمیصوں اور غراروں سے تمام لباس تیار کروا لئے

نسیم کے پاس بے شمار کپڑے ہیں۔ میں اس سے قبل کہہ چکا ہوں کہ وہ لباس پہنتی ہے استعمال نہیں کرتی۔ اُس پر ہر لباس سجتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ "بیگم" میں ایس مکرجی نے اس کو کشمیر کے دیہات کی ایک الھڑ لڑکی کے روپ میں پیش کیا، اس کو قلوبطرہ بنایا۔ ہیر کا لمبا کرتہ اور لاچا پہنایا۔ موڈرن لباس میں بھی پیش کیا۔ یقین واثق تھا۔ کہ صرف ملبوسات کے تنوع ہی کے باعث "بیگم" بے حد مقبول ثابت ہوگی۔ مگر افسوس کہ نکمی ڈائرکشن اور کمزور میوزک کی وجہ سے اس نے درمیانے درجے کے فلموں کی بزنس کی۔

ہم سب نے اس فلم کی تیاری پر بہت محنت کی تھی۔ خاص طور پہ مکرجی نے ہم سب دیر تک (بعض اوقات رات کے تین تین بجے تک) بیٹھے کام کرتے رہتے میں اور مکرجی کہانی کی نوک پلک درست کرتے رہتے اور نسیم اور احسان جاگنے کی کوشش کرتے رہتے۔ جب تک احسان صاحب کی ٹانگ ہلتی رہتی۔ وہ میری اور مکرجی کی باتیں سنتے رہتے۔ لیکن جونہی ان کی ٹانگ ہلنا بند ہو جاتی۔ ہم سب سمجھ جاتے

کہ وہ گہری نیند سو گئے ہیں۔

نسیم کو اس سے بڑی جھنجھلاہٹ ہوتی تھی کہ اس کا شوہر نیند کا ایسا ماتا ہے کہ کہانی کے نہایت ہی دشوار گذار موڑ پر لمبی تان کر سو جاتا ہے۔ میں اور مکرجی احسان کو چھیڑتے تھے تو نسیم بہت جز بز ہوتی تھی۔ وہ اُن کو اپنی طرف سے جھنجھوڑ کر جگاتی تھی۔ مگر ایسا معلوم ہوتا کہ لوری دے کر انھیں اور گہری نیند سُلا رہی ہے ——جب نسیم کی آنکھیں بھی مندنے لگتیں تو مکرجی رخصت چاہتے اور چلے جاتے۔

میرا گھر گھوڑ بندر سے بہت دُور تھا۔ برقی ٹرین قریب پون گھنٹے میں مجھے وہاں پہنچاتی تھی۔ ہر روز نصف شب کے بعد گھر پہنچتا۔ ایک اچھا خاصا عذاب تھا۔ میں نے جب اس کا ذکر مکرجی سے کیا تو یہ طے ہُوا۔ کہ میں کچھ عرصے کے لیے نسیم ہی کے یہاں اُٹھ آؤں۔

احسان بے حد جھینپو ہیں۔ کوئی بات کہنا ہو تو برسوں لگا دیتے ہیں۔ انھیں میری آسائش کا خیال تھا وہ چاہتے تھے کہ جس چیز کی مجھے ضرورت ہو۔ میں اُن سے بلا تکلف کہہ دیا کروں۔ مگر تکلف کی یہ حد تھی کہ وہ حرفِ مدّعا زبان پر لا ہی نہیں پاتے تھے۔ آخر ایک روز اُن کے اصرار پر نسیم نے مجھ سے کہا۔

"تہانوں جس چیز دی ضرورت ہووے دس دیا کرو۔"

نسیم فسٹ کلاس پنجابی بولتی تھی۔ "چل چل رے نوجوان" کے زمانے میں جب میں نے رفیق غزنوی سے جو اس پکچر میں ایک اہم رول ادا کر رہا تھا ذکر

کیا۔ کہ نسیم پنجابی بولتی ہے۔ تو اُس نے اپنے مخصوص انداز میں مجھ سے کہا۔ کہ تم بکتے ہو۔ میں نے اُس کو یقین دلانے کی کوشش کی۔ مگر وہ نہ مانا۔

ایک روز شوٹنگ کے دوران میں جب نسیم اور رفیق دونوں موجود تھے۔ اور اشوک انگریزی کے "زبان مروڑ" فقرے نسیم سے کہلوانے کی کوشش کر رہا تھا۔ تو میں نے رفیق سے پوچھا۔ "لالے! اُدّھڑ ونجا کسے کہتے ہیں؟"

رفیق نے جواب دیا۔ "یہ کس زبان کا لفظ ہے۔"

میں نے کہا۔ "پنجابی زبان کا؟ —— بتاؤ اس کا کیا مطلب ہے؟"

رفیق نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ "مینوں معلوم نئیں۔ او ادھڑ ونجے دے پتر۔"

نسیم نے گردن میں ہلکا سا خم دے کر رفیق کی طرف دیکھا۔ اور مسکرا کر پنجابی میں اس سے پوچھا۔ "سچی۔ تہانوں ملوم نئیں۔"

رفیق نے جب نسیم کے منہ سے پنجابی سُنی۔ تو بقول شخصے وہ اپنی پشتو بھول گیا۔ لکنت بھرے لہجہ میں اُس نے نسیم سے اردو میں کہا۔ "آپ پنجابی جانتی ہیں۔"

نسیم نے اسی طرح مسکرا کر کہا۔ "جی ہاں۔"

میں نسیم سے مخاطب ہوا۔ "تو آپ بتائیے اُدّھڑ ونجے کا مطلب کیا ہے؟"
نسیم نے کچھ دیر سوچا۔ "وہ —— وہ لباس جو گھر میں استعمال کیا جاتا ہے۔"

رفیق غزنوی اپنی پشتو اور زیادہ بھول گیا۔

نسیم کی نانی امرت سر کی کشمیرن تھی۔ پنجابی زبان اس نے غالباً اسی سے سیکھی تھی۔ اردو اس لئے بہت شستہ و رفتہ بولتی ہے کہ دلّی میں اپنی ماں کے ساتھ رہی۔ انگریزی جانتی ہے اس لئے کہ کنونٹ میں پڑھتی تھی۔ موسیقی سے شغف رکھتی ہے۔ اس کی تعلیم ماں ہی سے پائی۔ مگر ماں جیسا سُریلا گلا نہ پایا۔ فلموں میں اپنے گانے خود ہی گاتی ہے۔ مگر اُن میں رس نہیں ہوتا۔ لیکن اب میں نے سنا ہے کہ اُس نے خود گانا ترک کر دیا ہے۔

نسیم کے اردگرد جو ایک خیرہ کن ہالہ تھا۔ آہستہ آہستہ غائب ہو گیا۔ مجھے اُن کے بنگلے کے غسل خانے میں پہلی بار نہانے کا اتفاق ہوا۔ تو مجھے بڑی ناامیدی ہوئی۔ میرا خیال تھا کہ وہ جدید ساز و سامان سے آراستہ ہو گا۔ متعدد قسم کے نہانے والے نمک ہوں گے۔ نایاب صابن ہو گا۔ ٹب ہو گا۔ وہ تمام اوٹ پٹانگ چیزیں ہوں گی۔ جو حسین عورتیں اور ایکٹریسیں اپنے حسن کی افزائش کے لئے استعمال کرتی ہیں۔ مگر وہاں صرف ایک جست کی بالٹی تھی۔ ایلومینیم کا ایک ڈونگا اور ملاڈ کے کنوئیں کا بھاری پانی کہ صابن گھستے رہو اور جھاگ پیدا نہ ہو۔

لیکن نسیم کو جب بھی دیکھو تر و تازہ اور نکھری نکھری نظر آتی تھی۔ میک اپ کرتی تھی مگر ہلکا ـــــ شوخ رنگوں سے اُسے نفرت ہے۔ وہ صرف وہی رنگ استعمال کرتی ہے۔ جو اس کے مزاج کے موافق ہوں یعنی معتدل۔

عطریات سے اُس کو عشق ہے۔ چنانچہ انواع و اقسام کی خوشبویات اس کے پاس موجود رہتی ہیں۔ بعض سینٹ تو بہت ہی قیمتی اور نایاب ہیں۔ زیور ایک سے ایک اعلیٰ اور بیش قیمت ہے۔ مگر ان میں لدی پھندی نہیں ہوتی۔ کبھی ہیرے کا ایک کنگن پہن لیا۔ کبھی جڑاؤ چوڑیاں اور کبھی موتیوں کا ہار۔

ان کا دسترخوان میں نے کبھی پرتکلف نہیں دیکھا۔ احسان کو دمے کی شکایت رہتی ہے۔ اور نسیم کو زکام کی۔ دونوں پرہیز کی کوشش کیا کرتے تھے۔ نسیم میری ہری مرچیں لے اُڑتی تھی اور احسان نسیم کی پلیٹ پر ہاتھ صاف کر دیتے تھے۔ دونوں میں کھانے پر قریب قریب ہر روز ایک عجیب بچگانہ قسم کی چخ ہوتی تھی۔ دونو کی نگاہیں جب اِس دوران میں ایک دوسرے سے ٹکراتیں۔ تو دیکھنے والوں کو صاف پتہ لگ جاتا کہ وہ محبّت آشنا ہیں۔

نسیم کو جب میری بیوی نے اپنے یہاں مدعو کیا۔ تو اُسے سالنوں میں استعمال کیا ہوا گھی بہت پسند آیا۔ کھانے کی میز ہی پر اُس نے پوچھا۔ "یہ گھی آپ کہاں سے منگواتی ہیں؟"

میری بیوی نے جواب دیا۔ "بازار سے —— پولسن کا گھی ہے —— عام ملتا ہے۔"

نسیم نے کہا۔ "دو ڈبّے مجھے منگوا دیجئے۔" میں نے نوکر سے کہا۔ وہ فوراً پاس والے اسٹور سے جس کے ساتھ میرا حساب چلتا تھا۔ دو ڈبّے لے آیا۔

اسی طرح وہ کل آٹھ ٹین لے گئی۔ ایک دن مجھ سے کہنے لگی۔" آپ وہ گھی کا حساب تو کر لیجئے۔"

میں نے کہا۔" اس کی کیا ضرورت ہے؟

لیکن جب اُس نے اصرار کیا۔ تو میں نے کہا۔" کل آٹھ ٹین ہوتے ہیں ——
آپ حساب کر لیجے۔"

نسیم نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔" آٹھ؟ میرا خیال ہے سات ٹین آئے ہیں"

"سات ہی ہوں گے۔"

"ہوں گے کیا —— آپ کہتے ہیں تو آٹھ ہی ہوں گے۔"

"آپ نے بھی ہوں گے ہی کہا۔"

کافی دیر تک سات اور آٹھ کا ہیر پھیر رہا۔ نسیم کے حساب کے مطابق ٹین سات تھے اور میرے اور اسٹور والے کے حساب کے مطابق آٹھ۔ فیصلہ یوں ہی ہو سکتا تھا کہ ہم میں سے ایک دوسرے کا حساب مان لے مگر جب بات حساب کی تھی تو کون مانتا۔ آخر نسیم نے اپنے ملازم سے کہا۔ کہ خالی ٹین اکٹھے کرے۔ جب یہ اکٹھے کر کے نسیم کے روبرو پیش کئے گئے۔ تو ان کی تعداد سات تھی۔ نسیم نے فاتحانہ انداز میں میری طرف دیکھا اور کہا۔" گن لیجئے۔ سات ہیں۔"

میں نے پھر کہا۔" سات ہی ہوں گے —— لیکن میرے حساب کے مطابق آٹھ ہوتے ہیں۔"

ملازم نسیم سے مخاطب ہوا۔ "جی ہاں! آٹھ ہی ہوتے ہیں۔ ایک بھنگن لے گئی تھی"

میں اُن سے پانچ سو روپے ماہوار لیتا تھا۔ ہر مہینے اس کی پائی پائی کا حساب ہوتا تھا۔ لیکن اس میں کبھی سات اور آٹھ کا ہیر پھیر نہ ہوا۔ میاں بیوی دونوں میرے کام سے مطمئن تھے۔ لیکن مسٹر احسان کسی حد تک میری تیز طبیعت سے نالاں تھے۔ مگر اس کا اظہار وہ اپنی حد سے بڑھی پُرتکلف طبیعت کے باعث مجھ پر کبھی نہ کر سکے۔

بظاہر مسٹر احسان بہت ڈھیل قسم کے انسان ہیں۔ مگر اپنی بیوی کے معاملے میں بہت سخت قسم کے واقع ہوئے ہیں۔ نسیم کو صرف خاص خاص لوگوں سے ملنے کی اجازت ہے۔ عام ایکٹروں اور ایکٹرسوں سے نسیم کو بات چیت کی ممانعت ہے۔ ویسے نسیم بھی چھچھوروں سے نفرت کرتی ہے۔ شور و غل برپا کرنے والی پارٹیوں سے وہ خود بھی دور رہتی ہے۔ لیکن ایک دفعہ اسے ایک بہت بڑے ہنگامے میں حصّہ لینا پڑا۔

یہ ہنگامہ ہولی کا ہنگامہ تھا۔ جس طرح علی گڑھ یونیورسٹی کی ایک "ٹریڈیشن" برکھا کے آغاز پر "مڈ پارٹی" ہے۔ اسی طرح بمبےٹاکیز کی ایک ٹریڈیشن ہولی کی رنگ پارٹی تھی۔ چونکہ فلمستان کے قریب قریب تمام کارکن بمبےٹاکیز کے مہاجر تھے۔ اس لیے یہ ٹریڈیشن یہاں بھی قائم رہی۔

ایس مکرجی اس رنگ پارٹی کے رنگ لیڈر تھے۔ عورتوں کی کمان اُنکی موٹی اور ہنس مکھ بیوی (اشوک کی بہن) کے سپرد تھی۔ میں شاہد لطیف کے ہاں بیٹھا تھا۔ شاہد کی بیوی عصمت (چغتائی) اور میری بیوی (صفیہ) دونو خدا معلوم کیا باتیں کر

رہی تھیں۔ ایک دم شور برپا ہوا۔ عصمت چلّائی۔ "لو صفیہ وہ آ گئے۔۔۔ لیکن میں بھی......"

عصمت اس بات پر اڑ گئی۔ کہ وہ کسی کو اپنے اُوپر رنگ پھینکنے نہیں دے گی۔ مجھے ڈر تھا کہ اس کی یہ ضد کہیں دوسرا رنگ اختیار نہ کر لے۔ کیونکہ رنگ پارٹی والے سب "ہولی وڈے موڈ" میں تھے۔ خدا کا شکر ہے کہ عصمت کا موڈ خود بخود بدل گیا اور وہ چند لمحات ہی میں رنگوں میں لت پت بھتنی بن کر دوسری بھتنیوں میں شامل ہو گئی۔ میرا اور شاہد لطیف کا حلیہ بھی وہی تھا۔ جو ہولی کے دوسرے بھتنوں کا تھا۔

پارٹی میں جب کچھ اور لوگ شامل ہوئے۔ تو شاہد لطیف نے بآوازِ بلند کہا "چلو پری چہرہ نسیم کے گھر کا رُخ کرو۔"

رنگوں سے مسلح گروہ گھوڑ بندر روڈ کی اُونچی نیچی تار کول لگی سطح پر بے ڈھنگے بیل بوٹے بناتا اور شور مچاتا نسیم کے بنگلے کی طرف روانہ ہوا۔ چند منٹوں ہی میں ہم سب وہاں تھے۔ شور سن کر نسیم اور احسان باہر نکلے۔ نسیم ہلکے رنگ کی جارجٹ کی ساڑھی میں ملبوس میک اپ کی نوک پلک نکالے۔ جب ہجوم کے سامنے برآمدے میں نمودار ہوئی۔ تو شاہد نے یورش کا حکم دیا۔ مگر میں نے اسے روکا۔ "ٹھیرو! پہلے ان سے کہو کپڑے بدل آئیں۔"

نسیم سے کپڑے تبدیل کرنے کے لئے کہا گیا۔ تو وہ ایک ادا کے ساتھ

مسکرائی۔ "یہ بھی ٹھیک ہے۔"

ابھی یہ الفاظ اس کے منہ ہی میں تھے۔ کہ ہولی کی پچکاریاں برس پڑیں چند لمحات ہی میں پری چہرہ نسیم بانو ایک عجیب و غریب قسم کی خوفناک چڑیل میں تبدیل ہو گئی۔ نیلے پیلے رنگوں کی تہوں میں سے جب اس کے سفید اور چمکیلے دانت اور بڑی بڑی آنکھیں نظر آتیں تو ایسا معلوم ہوتا۔ کہ بہزاد اور مانی کی مصوّری پر کسی بچے نے سیاہی انڈیل دی ہے۔

رنگ بازی ختم ہوتے پہ کبڈی شروع ہوئی۔ پہلے مردوں کا میچ شروع ہوا پھر عورتوں کا۔ یہ بہت دلچسپ تھا۔ مسٹر مکرجی کی فربہ بیوی جب بھی گرتی قہقہوں کا طوفان برپا ہو جاتا۔ میری بیوی عینک پوش تھی۔ شیشے رنگ آلود ہونے کے باعث اسے بہت کم نظر آتا تھا۔ چنانچہ وہ اکثر غلط سمت دوڑنے لگتی۔ نسیم سے بھاگا نہیں جاتا تھا یا وہ یہ ظاہر کرنا چاہتی تھی کہ وہ اس مشقّت کی عادی نہیں۔ بہرحال وہ برابر کھیل میں دلچسپی لیتی رہی۔

نسیم اور اس کے میاں بڑے مذہبی قسم کے آدمی ہیں۔ میرا مطلب اس قسم کے مذہبی آدمیوں سے ہے۔ جو اردو کے اخباروں کے پرزے زمین سے اٹھا کر چومتے ہیں اور سر آنکھوں پر لگاتے ہیں۔ شام کو ایک ستارہ دیکھتے ہیں۔ تو اور دو دیکھنے کے لئے سارا آسمان کھنگالنا شروع کر دیتے ہیں۔ دونوں توہم پرست ہیں۔ خاص طور پر میاں احسان۔ ریس کورس پر ان کی حالت دیکھنے والی ہوتی ہے۔ پاس بہت اچھی ٹپ ہے۔ قریب ہے کہ اُس پر روپیہ لگا دیں۔ کہ ایک کانا آدمی پاس سے

گذر گیا۔ بس وہیں رک جائیں گے۔ ٹپ کا گھوڑا دن آجائے گا تو نسیم سے الجھ پڑیں گے
"تم نے کیوں کہا تھا کہ اِس گھوڑے پر نہ لگانا ۔۔۔۔ نہیں آئے گا۔"

ایسی ہلکی ہلکی چخ ان میں عام ہوتی رہتی تھی۔ جو ان کی ازدواجی زندگی میں رنگ بھرتی رہتی ہے۔

نسیم کے دو بچے ہیں جو اکثر نانی کے پاس رہتے ہیں۔ وہ ان کو اسٹڈیو کی فضا سے دور رکھنا چاہتی ہے۔ اُس کو اپنے مرحوم باپ سے بہت پیار ہے۔ ان کا فوٹو ہر وقت اس کے وینیٹی بیگ میں موجود رہتا ہے۔ مجھے عورتوں کے بیگ چوری چوری دیکھنے کا بہت شوق ہے۔ ایک روز میں حسبِ عادت نسیم کا بیگ کھول کر یہ فوٹو دیکھ رہا تھا۔ کہ وہ آگئی۔ میں نے اس سے کہا۔ "معاف کیجئے گا ۔۔۔ یہ میری بہت بُری عادت ہے ۔۔۔ بتائیے، یہ کس کا فوٹو ہے۔"

نسیم نے فوٹو ہاتھ میں لے کر اس کو پیار بھری نظروں سے دیکھا اور کہا۔
"میرے اباجی کا۔"

مجھے ایسا محسوس ہوا۔ کہ ایک چھوٹی سی بچی ہے۔ جو مجھ سے یوں کہہ رہی ہے
"میرے اباجی کا اور کس کا؟"

میں نے اس سے یہ نہ پوچھا۔ کہ وہ کون ہیں؟ کہاں ہیں؟ ۔۔۔ کیا یہی کافی نہ تھا کہ وہ اُس کے باپ ہیں ۔۔۔ نہیں ۔۔۔ اُس کے اباجی ہیں۔

ذیل کا یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد میں یہ مضمون ختم کروں گا۔

"بیگم" لکھنے کے دوران میں مسٹر مکرجی کے ساتھ ایک منظر پر بحث و تمحیص کرتے کرتے بہت دیر ہوگئی۔ رات کے دو بجے تھے۔ صبح کی پہلی گاڑی ساڑھے تین بجے ملتی تھی۔ میری بیوی ساتھ تھی۔ جب ہم نے رخصت چاہی تو نسیم نے کہا۔ "نہیں صفیہ — یہیں ٹھیر جاؤ۔ یہ بھی کوئی وقت ہے جانے کا۔"

ہم نے بہت کہا کہ کوئی بات نہیں۔ موسم اچھا ہے۔ کچھ دیر پلیٹ فارم پر ٹہلیں گے اتنے میں گاڑی آجائے گی۔ مگر نسیم اور احسان نے بہت اصرار کیا۔ کہ ہم ٹھیر جائیں۔ مکرجی چلے گئے۔ اس لئے کہ اُن کے پاس موٹر تھی۔ اور انھیں بہت دور نہیں جانا تھا میں باہر برآمدے میں سو گیا۔ احسان وہیں کمرے میں صوفے پر لیٹ گئے۔

صبح ناشتہ کرکے جب میں اور صفیہ گھر چلے تو راستے میں اس نے مجھے یہ بات سنائی جو دلچسپی سے خالی نہیں۔

جب صفیہ اور نسیم سونے کے لئے کمرے میں داخل ہوئیں تو وہاں ایک پلنگ تھا۔ صفیہ نے اِدھر اُدھر دیکھا اور نسیم سے کہا۔ "آپ سو جائیے۔"

نسیم مسکرائی اور پلنگ پر نئی چادر بچھا کر کہنے لگی۔ "کپڑے تو بدل لیں۔"

یہ کہہ کر اُس نے ایک نیا سلیپنگ سوٹ نکالا۔ "یہ تم پہن لو — بالکل نیا ہے۔"

"بالکل نیا" پر زور تھا جس کا مطلب میری بیوی سمجھ گئی۔ اور لباس تبدیل کرکے بستر پر لیٹ گئی۔ نسیم نے اطمینان سے آہستہ آہستہ شب خوابی کا لباس پہنا چہرے کا میک اپ اتارا۔ تو صفیہ نے حیرت زدہ ہوکر کہا۔ "ہائے تم کتنی پیلی ہو نسیم۔"

نسیم کے پھیکے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔"یہ سب میک اپ کی کارستانی ہے۔"

میک اپ اتارنے کے بعد اُس نے چہرے پر مختلف روغنیات ملے اور ہاتھ دھو کر قرآن اٹھایا۔ اور تلاوت شروع کر دی۔ میری بیوی بیحد متاثر ہوئی۔ بے اختیار اُس کے منہ سے نکلا۔"نسیم —— خدا کی قسم، تم تو ہم لوگوں سے کہیں اچھی ہو....."

اس احساس سے کہ یہ بات اس نے ڈھنگ سے نہیں کہی۔ صفیہ ایک دم خاموش ہو گئی۔

قرآن کی تلاوت کرنے کے بعد نسیم سو گئی۔

پری چہرہ نسیم —— پکاری نور جہاں —— ملکۂ حسن —— احسان کی روشن —— چھمیاں کی بیٹی اور دو بچوں کی ماں!

اشوک کمار

نجم الحسن جب دیو کا رانی کو لے اڑا۔ تو بمبئی ٹاکیز میں افراتفری پھیل گئی۔ فلم کا آغاز ہو چکا تھا۔ چند مناظر کی شوٹنگ پایۂ تکمیل کو پہنچ چکی تھی کہ نجم الحسن اپنی ہیروئن کو سلولائڈ کی دنیا سے کھینچ کر حقیقت کی دنیا میں لے گیا۔ بمبے ٹاکیز میں سب سے زیادہ پریشان اور متفکر شخص ہمانسو رائے تھا۔ دیوکا رانی کا شوہر اور بمبے ٹاکیز کا "دل و دماغ پسِ پردہ"

ایس مکر جی مشہور جوبلی میکر فلم ساز (اشوک کمار کے بہنوئی) ان دنوں بمبئی ٹاکیز میں مسٹر ساوک واچا ساؤنڈ انجنیئر کے اسسٹنٹ تھے۔ صرف بنگالی ہونے کی وجہ سے انھیں ہمانسو رائے سے ہمدردی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ کسی نہ کسی طرح دیوکا رانی واپس آجائے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے آقا ہمانسو رائے سے مشورہ کیے بغیر

اپنے طور پر کوشش کی۔ اور اپنی مخصوص حکمتِ عملی سے دیوکا رانی کو آمادہ کرلیا کہ وہ کلکتے میں اپنے عاشق نجم الحسن کی آغوش چھوڑ کر واپس بمبے ٹاکیز کی آغوش میں چلی آئے۔ جس میں اس کے جوہر کے پنپنے کی زیادہ گنجائش تھی۔

دیوکارانی واپس آگئی۔ ایس مکرجی نے اپنے جذباتی آقا ہمانسو رائے کو بھی اپنی حکمت عملی سے آمادہ کرلیا کہ وہ اسے قبول کرلیں۔ اور بے چارہ نجم الحسن ان عاشقوں کی فہرست میں داخل ہوگیا۔ جن کو سیاسی، مذہبی اور سرمایہ دارانہ حکمت عملیوں نے اپنی محبوباؤں سے جدا کردیا تھا۔

زیرِ تکمیل فلم سے نجم الحسن کو قینچی سے کاٹ کر ردّی کی ٹوکری میں پھینک دیا گیا۔ مگر اب یہ سوال درپیش تھا کہ عشق آشنا دیوکارانی کے لیے سیلولائڈ کا ہیرو کون ہو۔

ہمانسو رائے اک بے حد محنتی اور دوسروں سے الگ تھلگ رہ کر خاموشی سے اپنے کام میں شب و روز منہمک رہنے والے فلم ساز تھے۔ انھوں نے بمبے ٹاکیز کی نیو کچھ اس طرح ڈالی تھی کہ وہ ایک باوقار درس گاہ معلوم ہو۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے بمبئی شہر سے دور مضافات میں ایک گاؤں کو جس کا نام "ملاڈ" ہے اپنی فلم کمپنی کے لیے منتخب کیا تھا ـــــ وہ باہر کا آدمی نہیں چاہتے تھے۔ اس لیے کہ باہر کے آدمیوں کے متعلق ان کی رائے اچھی نہیں تھی (نجم الحسن بھی باہر کا آدمی تھا)

یہاں پھر ایس مکرجی نے اپنے جذباتی آقا کی مدد کی۔ ان کا سالا اشوک کمار

بی۔ایس۔سی پاس کر کے ایک برس کلکتے میں وکالت پڑھنے کے بعد بمبے ٹاکیز کی لیبارٹری میں بغیر تنخواہ کے کام سیکھ رہا تھا۔ناک نقشہ اچھا تھا۔تھوڑا بہت گا بجا بھی لیتا تھا۔ مکرجی نے چنانچہ برسبیل تذکرہ ہیرو کے لئے اس کا نام لیا۔ہمانسو رائے کی ساری زندگی تجربوں سے دوچار رہی تھی۔انھوں نے کہا دیکھ لیتے ہیں۔جرمن کیمرہ مین ورشنگ نے اشوک کا ٹیسٹ لیا۔ہمانسو رائے نے دیکھا۔اور پاس کر دیا۔جرمن فلم ڈائرکٹر فرانز اوسٹن کی رائے ان کے برعکس تھی۔مگر بمبے ٹاکیز میں کس کی مجال کہ ہمانسو رائے کی رائے کے خلاف اظہارِ خیال کر سکے۔چنانچہ اشوک کمار کا نگولی جو ان دنوں بمشکل بائیس برس کا ہو گا۔دیوکا رانی کا ہیرو منتخب ہو گیا۔

ایک فلم بنا، دو فلم بنے — کئی فلم بنے اور دیوکا رانی اور اشوک کمار کا نہ جُدا ہونے والا فلمی جوڑا بن گیا۔ان فلموں میں سے اکثر بہت کامیاب ہوئے۔گڑیا سی دیوکا رانی، اور بڑا ہی بے ضرر اشوک کمار، دو نو سیلولائڈ پر شیر و شکر ہو کر آتے تو بہت ہی پیارے لگتے۔معصوم ادائیں۔الھڑ غمزے — بڑا اہنسائی قسم کا عشق — لوگوں کو جو جارحانہ عشق کرنے اور دیکھنے کے شوقین تھے۔یہ نرم و نازک اور لچکیلا عشق بہت پسند آیا۔خاص طور پر اس نئے فلمی جوڑے کی گرویدہ ہو گئے اسکولوں اور کالجوں میں طالبات کا (خصوصاً ان دنوں) آئیڈیل ہیرو اشوک کمار تھا اور کالجوں کے لڑکے لمبی اور کھلی آستینوں والے بنگالی کرتے پہن کر گاتے پھرتے تھے

تو بن کی چڑیا۔میں بن کا پنچھی بن بن بولوں رے

میں نے اشوک کے چند فلم دیکھے۔ دیوکا رانی اُس کے مقابلے میں جہاں تک کردار نگاری کا تعلق ہے میلوں آگے تھی۔ اور ہیرو کے روپ میں اشوک ایسا معلوم ہوتا تھا کہ چوکولیٹ کا بنا ہے۔ مگر آہستہ آہستہ اُس نے پر پرُزے نکالے اور بنگال کے آورش فیمی عشق کی پینک سے بیدار ہونے لگا۔

اشوک جب لیبارٹری کی چلمن سے باہر نکل کر نقرئی پردے پر آیا۔ تو اُس کی تنخواہ پچھتر روپے مقرر ہوئی۔ اشوک بہت خوش تھا۔ ان دنوں اکیلی جان کے لئے اور وہ بھی شہر سے دور دراز گاؤں "ملاد" میں اتنے روپے کافی تھے جب اسکی تنخواہ ایک دم دوگنی ہوگئی یعنی ایک سو پچاس روپے ماہوار تو وہ اور بھی زیادہ خوش تھا۔ لیکن جب ڈیڑھ کے ڈھائی مقرر ہوئے تو وہ گھبرا گیا۔ اس نے مجھے اس وقت کی کیفیت بیان کرتے ہوئے کہا۔" بائی گوڈ ـــــ میری حالت عجیب غریب تھی۔ ڈھائی سو روپے ـــــ میں نے کیشیر سے نوٹ لئے۔ تو میرا ہاتھ کانپنے لگا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ کہ اتنے روپے کہاں رکھوں گا ـــــ میرا گھر تھا ـــــ ایک چھوٹا سا کوارٹر۔ ایک چارپائی تھی۔ دو تین کرسیاں۔ چاروں طرف جنگل ـــــ رات کو اگر کوئی چور آجائے ـــــ یعنی اگر اس کو معلوم ہو جائے کہ میرے پاس ڈھائی سو روپے ہیں تو کیا ہو؟ ـــــ میں ایک عجیب چکر میں پڑ گیا۔ چوری ڈکیتی سے میری جان جاتی تھی۔ گھر آکر بہت سکیمیں بنائیں۔ آخر یہ کیا کہ وہ نوٹ چارپائی کے نیچے بچھی ہوئی دری میں چھپا دیئے ـــــ ساری رات بڑے ڈراؤنے خواب

آتے رہے ـــــ صبح اٹھ کر میں نے پہلا کام یہ کیا کہ وہ نوٹ اٹھا کر ڈاک خانے میں جمع کرا دئے۔"

اشوک مجھے یہ بات اپنے مکان پہ سنا رہا تھا کہ کلکتے کا ایک فلم ساز اُس سے ملنے آیا۔ کنٹریکٹ تیار تھا مگر اشوک نے اس پر دستخط نہ کئے۔ وہ اسّی ہزار روپے دیتا تھا۔ اور اشوک کمار کا مطالبہ پورے ایک لاکھ کا تھا ـــــ کہاں ڈھائی سو روپے اور کہاں ایک لاکھ!

بمبے ٹاکیز میں اشوک کے ساتھ ساتھ اس کے بہنوئی ایس مکرجی نے بھی ترقی کی آدمی ذہین تھا ـــــ گرد و پیش جو کچھ بھی ہوتا تھا اس کا بنظر غائر مطالعہ کرتا تھا۔ آہستہ آہستہ پروڈیوسر بن گیا ـــــ معمولی پروڈیوسر نہیں بہت بڑا پروڈیوسر جس نے بمبے ٹاکیز کے جھنڈے تلے کئی سلور اور گولڈن جوبلی فلم بنائے اور منظر نگاری میں ایک خاص اسکول کی بنیاد ڈالی ـــــ راقم الحروف اس صنعت میں اس کو اپنا استاد مانتا ہے۔

اشوک کی دلعزیزی دن بدن بڑھتی چلی گئی۔ چونکہ وہ باہر بہت ہی کم نکلتا تھا اور الگ تھلگ رہتا تھا۔ اس لئے جب لوگ کہیں اس کی جھلک دیکھ پاتے۔ تو ایک ہنگامہ برپا ہو جاتا۔ چلتی ٹریفک بند ہو جاتی۔ اس کے چاہنے والوں کے ٹھٹھ لگ جاتے اور اکثر اوقات پولیس کے ڈنڈے کے زور سے اُسے ہجوم کی بے پناہ عقیدت سے نجات دلانا پڑتی۔

اشوک اپنے عقیدت مندوں کے والہانہ اظہار کو وصول اور برداشت کرنے کے معاملے میں بہت ہی ذلیل واقع ہوا ہے۔ فوراً ہی چڑ جاتا ہے۔ جیسے کسی نے گالی دی ہے۔ میں نے اس سے کئی دفعہ کہا۔ "دادا منی۔ تمھاری یہ حرکت بڑی واہیات ہے ـــــ خوش ہونے کے بجائے تم ناراض ہوتے ہو۔ کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ یہ لوگ تم سے محبّت کرتے ہیں۔" لیکن یہ بات سمجھنے کے لیئے شاید اس کے دماغ میں کوئی ایسا خانہ ہی نہیں ہے۔

محبّت سے وہ قطعاً ناآشنا ہے (یہ تقسیم سے پہلے تک کی بات ہے۔ اس عرصے میں اس کے اندر کیا تبدیلیاں پیدا ہوئی ہیں۔ ان کے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتا) سینکڑوں حسین لڑکیاں اس کی زندگی میں آئیں۔ مگر وہ نہایت ہی روکھے انداز میں ان کے ساتھ پیش آیا۔ طبعاً وہ ایک ٹھیٹ جاٹ ہے۔ اس کے کھانے پینے اور رہنے سہنے میں ایک عجیب قسم کا گنوار پن ہے۔ دیوکا رانی نے اس سے عشق کرنا چاہا۔ مگر اس نے بہت ہی غیر صنّاعانہ انداز میں اس کی حوصلہ شکنی کی۔ ایک اور ایکٹرس نے جرأت سے کام لے کر اس کو اپنے گھر بلایا۔ اور بڑے ہی نرم و نازک طریقے سے اُس پر اپنی محبّت کا اظہار کیا۔ مگر جب اشوک نے بڑے بھنڈے پن سے اُس کا دل توڑا۔ تو اس غریب کو پینترہ بدل کر یہ کہنا پڑا۔ "میں آپ کا امتحان لے رہی تھی۔ آپ تو میرے بھائی ہیں۔"

اشوک کو اس ایکٹرس کا جسم پسند تھا۔ ہر وقت دھلی دھلی۔ نکھری نکھری رہتی تھی۔ اس کی یہ چیز بھی اشوک کو بہت بھاتی تھی۔ چنانچہ جب اس نے قلابازی لگا کر اس کو اپنا بھائی بنا لیا۔ تو اشوک کو کافی کوفت ہوئی۔

اشوک عشق پیشہ نہیں۔ لیکن تاک جھانک کا مرض اُس کو عام مردوں کا سا ہے۔ عورتوں کی دعوت طلب چیزوں کو باقاعدہ غور سے دیکھتا ہے اور اُن کے متعلق اپنے دوستوں سے باتیں بھی کرتا ہے۔ کبھی کبھار کسی عورت کی جسمانی قربت کی خواہش بھی محسوس کرتا ہے۔ مگر بقول اس کے "منٹو یار ــــ ہمت نہیں پڑتی"۔

ہمت کے معاملے میں وہ واقعی بہت بودا ہے۔ لیکن یہ بوداپن اس کی ازدواجی زندگی کے لئے بہت ہی مبارک ہے۔ اس کی بیوی شوبھا سے اگر اس کی اس کمزوری کا ذکر کیا جائے۔ تو یقیناً وہ یہی کہے گی "خدا کا شکر ہے کہ گانگولی میں ایسی ہمت نہیں اور خدا کرے اُس میں یہ ہمت کبھی پیدا نہ ہو"

مجھے حیرت ہے کہ اُس میں یہ ہمت اور جرأت کیوں پیدا نہ ہوئی۔ جب کہ سینکڑوں لڑکیوں نے جرأتِ رندانہ سے کام لے کر اس کو عشق کی آگ میں کود نے کی ترغیب دی۔ اس کی ذاتی ڈاک میں بلا مبالغہ ہزاروں عورتوں کے عشق و محبت سے لبریز خطوط آئے ہوں گے۔ مگر جہاں تک میں جانتا ہوں خطوط کے اس انبار میں سے اُس نے شاید ایک سو بھی خود نہیں پڑھے ــــ خط آتے ہیں اس کا

مریل سیکریٹری تُو ذرا انھیں مزے لے لے کر پڑھتا ہے۔ اور دن بدن مریل ہوتا جاتا ہے۔

تقسیم سے چند ماہ پہلے اشوک فلم چندر شیکھر کے سلسلے میں کلکتے میں تھا۔ شہید سہروردی (اس وقت وزیر اعظم بنگال) کے ہاں سے سولہ ملی میٹر فلم دیکھنے کے بعد اپنے ڈیرے لوٹ رہا تھا۔ کہ راستے میں دو خوبصورت اینگلو انڈین لڑکیوں نے اس کی موٹر روکی اور لفٹ چاہی۔ اشوک نے چند منٹ کی یہ عیاشی تو کرلی۔ مگر اُسے اپنے نئے سگریٹ کیس سے ہاتھ دھونے پڑے۔ ایک لڑکی جو شوخ و شنگ تھی۔ سگریٹ کے ساتھ سگریٹ کیس بھی لے اُڑی۔ اس واقعے کے بعد اشوک نے کئی بار سوچا کہ ان سے رسم و راہ پیدا کی جائے۔ بات معمولی تھی مگر اس کی ہمّت نہ پڑی۔

کولھاپور میں گرزہ، تلوار اور ڈھال قسم کا بھاری بھر کم ہونّق فلم بن رہا تھا اشوک کا تھوڑا سا کام اس میں باقی رہ گیا تھا۔ وہاں سے کئی بلاوے آئے مگر وہ نہ گیا۔ اس کی طبیعت اس رول سے بہت متنفر تھی۔ جو اُسے ادا کرنے کے لئے دیا گیا تھا۔ مگر کنٹریکٹ تھا۔ آخر ایک روز اُسے جانا ہی پڑا۔ ساتھ مجھے لے گیا۔ اُن دنوں میں فلمستان کے لئے "آٹھ دن" نامی فلم لکھ رہا تھا چونکہ یہ فلم اُسے پروڈیوس اور ڈائرکٹ کرنا تھی۔ اس لئے اس نے کہا۔ "چلو یار۔ وہاں آرام سے کام کریں گے۔"

مگر آرام کہاں ـــــ لوگوں کو فوراً معلوم ہو گیا کہ اشوک کمار کولھاپور آیا ہے
چنانچہ اُس ہوٹل کے ارد گرد جہاں ہم ٹھیرے تھے۔ زائرین جمع ہونے شروع ہو گئے
ہوٹل کا مالک ہوشیار تھا۔ کسی نہ کسی بہانے وہ ان لوگوں کو منتشر کر دیتا۔ لیکن پھر بھی
بعض چپکو قسم کے لوگ ہوٹل کا طواف کرتے رہتے۔ اور اپنے محبوب ایکٹر کی زیارت
کر ہی لیتے۔ اپنے عقیدت مندوں کے ساتھ اشوک جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں بہت
ہی اکھڑ قسم کا سلوک کرتا رہا۔ مجھے معلوم نہیں اُن کا ردِ عمل کیا تھا۔ مگر بحیثیت
ایک ناظر کے مجھے سخت کوفت ہوتی تھی۔

ایک شام ہم دونو سیر کو نکلے۔ اشوک "کیموفلاز" کئے تھا۔ آنکھوں پر چوڑا
چکلا گہرے رنگ کا چشمہ ـــــ ایک ہاتھ میں چھڑی دوسرے ہاتھ میں میرا
کندھا۔ تاکہ حسبِ ضرورت مجھے آگے پیچھے کر سکے۔ اسی طرح ایک اسٹور میں
پہنچے۔ اشوک کو کولھاپور کے اسٹڈیو کے گرد و غبار کے اثرات سے محفوظ رہنے
کے لئے کوئی دوا خریدنا تھی۔ جب اُس نے اسٹور والے سے یہ طلب کی۔ تو
اُس نے سرسری نظر سے اپنے گاہک کی طرف دیکھا۔ اور الماری کی طرف
بڑھا۔ لیکن فوراً ہی "ڈی لیڈ ایکشن" بمب کی طرح پھٹا۔ اور مڑ کر اشوک سے
مخاطب ہوا۔ "آپ ـــ آپ کون ہیں؟"

اشوک نے جواب دیا۔ "میں کون ہوں؟ ـــــ میں وہی ہوں جو کہ میں
ہوں؟"

اسٹور والے نے غور سے اشوک کے چشمہ اوڑھے چہرے کی طرف دیکھا۔

"آپ اشوک کمار ہیں؟"

اشوک نے بڑے دل شکن لہجے میں کہا۔ "اشوک کمار کوئی اور ہوگا۔ چلو منٹو۔"

یہ کہہ کر اُس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اور دوا خریدے بغیر ہی ہم دونوں اسٹور سے باہر تھے۔ ہوٹل کا موڑ مڑنے لگے تو سامنے تین مرہٹی لڑکیاں نمودار ہوئیں۔ بہت صاف ستھری۔ گوری چٹی۔ ماتھوں پر کُم کُم، بالوں میں وینیاں (پھولوں کے گجرے) پیروں میں ہلکے پھلکے چپل۔ ان میں سے ایک جس کے ہاتھوں میں موسمبیاں تھیں، اشوک کو دیکھ کر زور سے کانپی، بھنچی ہوئی آواز میں اُس نے اپنی سہیلیوں سے کہا۔ "اشوک!" اور اس کے ہاتھوں کی ساری موسمبیاں سڑک پر گر پڑیں۔ اشوک نے میرا کندھا چھوڑا اور بھاگ گیا۔

اشوک سے میری پہلی ملاقات فلمستان میں ہوئی۔ جب ایس مکرجی کی پوری ٹیم نے بمبے ٹاکیز چھوڑ کر اپنا نیا فلمی ادارہ قائم کر لیا تھا۔ یوں تو میں نے کئی بار اُس کی جھلکیاں دیکھی تھیں۔ مگر اس سے مفصّل ملاقات فلمستان ہی میں ہوئی۔ جب میں وہاں ملازم ہو گیا۔

فلمی دنیا کی ہر شخصیت پردے پر کچھ اور پردے سے دُور کچھ اور ہی ہوتی ہے۔ اشوک کو چنانچہ جب میں نے پہلی مرتبہ قریب سے دیکھا تو پردے کے اشوک سے بہت مختلف تھا۔ گہرا سانولا رنگ۔ موٹے اور کھردرے ہاتھ۔

مضبوط کسرتی جسم۔ نیم گنوار لب و لہجہ۔ اکھڑا اکھڑا غیر فطری تکلف۔ تعارف کرایا گیا تو میں نے اُس سے کہا۔ "آپ سے مل کر بڑی مسرّت ہوئی ہے۔"

اشوک نے اس کے جواب میں جو کچھ کہا وہ موٹے موٹے الفاظ پر مشتمل تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اُس نے یہ لفظ رٹے ہوئے ہیں۔

ایک مرتبہ فلمستان میں ایک صاحب سیر و تفریح کے لئے آئے۔ آپ نے بڑے پُر تکلف انداز میں اشوک سے کہا۔ "مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ خاکسار کو اس سے پہلے بھی جناب سے شرفِ ملاقات حاصل ہو چکا ہے۔"

اشوک نے گڈمڈ لہجے میں جواب دیا۔ "جی...... جی مجھے کبھی مقابلہ نہیں ہوا۔" مقابلے کا قاف اُس نے حلق سے نکالا...... لیکن فوراً ہی اس کو احساس ہوا کہ اُس نے یہ لفظ غلط استعمال کیا ہے۔ مگر وہ گول کر گیا۔

اشوک کو اردو بہت اچھی لگتی ہے۔ شروع شروع میں اُس نے اس زبان میں لکھنا پڑھنا شروع کیا۔ مگر قاعدے سے آگے نہ بڑھ سکا۔ پھر بھی اس کو تھوڑی سی شُدبُد ہے۔ ایک دو سطر اردو میں لکھ لیتا ہے۔ تقسیم کے بعد جب میں اُسے چھوڑ کر بمبے ٹاکیز سے چلا آیا۔ تو اُس نے مجھے اردو میں ایک خط لکھا کہ واپس آجاؤ۔ مگر افسوس ہے کہ میں چند در چند وجوہ کے باعث اس کا جواب نہ دے سکا۔

میری بیوی بھی دوسری عورتوں کی طرح اشوک کمار کی بہت مدّاح تھی۔

ایک دن میں اشوک کو اپنے گھر لے آیا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی میں نے زور سے آواز دی۔ "صفیہ ـــ آؤ اشوک کمار آیا ہے۔"

صفیہ اندر روٹی پکا رہی تھی۔ جب میں نے پے در پے آوازیں دیں۔ تو وہ باہر نکلی۔ میں نے اشوک سے اس کا تعارف کرایا۔ "یہ میری بیوی ہے۔ دادا منی ـــ ہاتھ ملاؤ اس سے۔"

صفیہ اور اشوک دونوں جھینپ گئے۔ میں نے اشوک کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"ہاتھ ملاؤ دادا امنی ـــ شرماتے کیا ہو۔"

مجبوراً اُسے ہاتھ ملانا پڑا۔ اتفاق سے اُس روز قیمے کی روٹیاں تیار کی جا رہی تھیں۔ اشوک کھا کے آیا تھا۔ مگر جب کھانے پر بیٹھا تو تین ہڑپ کر گیا۔ یہ عجیب بات ہے کہ بمبئی میں اس کے بعد جب کبھی ہمارے یہاں قیمے کی روٹیاں تیار ہوئیں۔ اشوک کسی نہ کسی طرح آن موجود ہوتا۔ اس کی توجیہہ میں کر سکتا ہوں نہ اشوک۔ دانے دانے پر مہر والا ہی قصّہ معلوم ہوتا ہے۔

میں نے ابھی ابھی اشوک کو دادا امنی کہا ہے۔ بنگلہ میں اس کا مطلب ہے بڑا بھائی ـــ اشوک سے جب میرے مراسم بڑھ گئے۔ تو اُس نے مجھے مجبور کیا۔ کہ میں اُسے دادا امنی کہا کروں۔ میں نے اُس سے کہا۔ "تم بڑے کیسے ہوئے۔ حساب کر لو۔ میں عمر میں تم سے بڑا ہوں۔"

حساب کیا گیا تو وہ مجھ سے عمر میں دو ماہ اور کچھ دن بڑا نکلا۔ چنانچہ اشوک

اور مسٹر گانگولی کے بجائے مجھے دادامنی کہنا پڑا۔ یہ مجھے پسند بھی تھا۔ کیونکہ اس میں بنگالیوں کی محبوب مٹھائی ''رس گلے'' کی مٹھاس اور گولائی تھی۔ وہ مجھے پہلے مسٹر منٹو کہتا تھا۔ جب اس سے دادامنی کہنے کا معاہدہ ہوا۔ تو وہ مجھے صرف منٹو کہنے لگا۔ حالانکہ مجھے یہ ناپسند تھا۔

پردے پر وہ مجھے چاکولیٹ ہیرو معلوم ہوتا تھا۔ مگر جب میں نے اس کو سلولائڈ کے خول سے باہر دیکھا تو وہ ایک کسرتی آدمی تھا۔ اُس کے مکّے میں اتنی قوّت تھی کہ دروازے کی لکڑی میں شگاف پڑ جاتا تھا۔ ہر روز گھر پر باکسنگ کی مشق کرتا تھا۔ شکار کھیلنے کا شوقین تھا۔ سخت سے سخت کام کر سکتا تھا۔ افسوس مجھے صرف اس بات کا ہوا کہ اُسے آرائش کا قطعاً ذوق نہیں تھا۔ وہ اگر چاہتا تو اُس کا گھر دلکش ساز و سامان سے آراستہ ہوتا۔ مگر اس طرف وہ کبھی توجہ دیتا ہی نہیں تھا۔ اور اگر دیتا تھا۔ تو اُس کے نتائج غیر صنّاعانہ ہوتے تھے۔ برش اُٹھا کر خود ہی سارے فرنیچر پر گہرا نیلا پینٹ تھوپ دیتا۔ یا کسی صوفے کی پشت توڑ کر اسے دیوان کی بھونڈی شکل میں تبدیل کر دیا۔

مکان سمندر کے ایک غلیظ کنارے پر ہے۔ نمکین پانی کے چھینٹے باہر کھڑکیوں کی سلاخوں کو چاٹ رہے ہیں۔ جگہ جگہ لوہے کے کام پر زنگ کی پپڑیاں جمع ہیں۔ ان سے بڑی اداسی پھیلانے والی بُو آ رہی ہے۔ مگر اشوک اس سے قطعاً غافل ہے۔ ریفریجریٹر باہر کوری ڈور میں پڑا جھک مار رہا ہے۔

اس کے ساتھ لگ کر اس کا گرانڈیل السے شین کتا سو رہا ہے۔ پاس کمرے میں بچے اودھم مچا رہے ہیں۔ اور اشوک غسل خانے کے اندر پاٹ پر بیٹھا دیواروں پہ حساب لگا کر دیکھ رہا ہے کہ ریس میں کون سا گھوڑا دِن آئے گا یا مکالموں کا پرچہ ہاتھ میں لئے ان کی ادائگی سوچ رہا ہے۔ اشوک کو فراست الید یعنی پامسٹری اور علمِ نجوم سے خاص شغف ہے۔ موخرالذکر علم اس نے اپنے باپ سے سیکھا ہے متعدد کتابیں بھی پڑھی ہیں۔ فرصت کے اوقات میں وہ شغل کے طور پہ اپنے دوستوں کی جنم پتریاں دیکھا کرتا ہے۔

میرے ستاروں کا مطالعہ کر کے اس نے ایک دن مجھ سے سرسری طور پر پوچھا۔ "تم شادی شدہ ہو؟"

میں نے اس سے کہا۔ "تمھیں معلوم نہیں؟"

اس نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔ "جانتا ہوں —— لیکن دیکھو منٹو، ایک بات بتاؤ —— نہیں —— تمہارے تو ابھی اولاد نہیں ہوئی۔"

میں نے اس سے پوچھا۔ "بات کیا ہے —— بتاؤ تو سہی۔"

اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "کچھ نہیں —— جن لوگوں کے ستاروں کی پوزیشن ایسی ہوتی ہے ان کی پہلی اولاد لڑکا ہوتی ہے .... مگر وہ زندہ نہیں رہتی۔"

اشوک کو یہ معلوم نہیں تھا کہ میرا لڑکا ایک سال کا ہو کر مر گیا تھا۔

اشوک نے مجھے بعد میں بتایا کہ اس کا پہلا بچّہ جو کہ لڑکا تھا مردہ پیدا ہُوا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ تمھارے اور میرے ستاروں کی پوزیشن قریب قریب ایک جیسی ہے۔ اور یہ کبھی ہو ہی نہیں سکتا کہ جن لوگوں کے ستاروں کی پوزیشن ایسی ہو۔ اُن کے ہاں پہلی اولاد لڑکا نہ ہو اور وہ نہ مرے۔

اشوک کو علم نجوم کی صحت پر پورا پورا یقین ہے بشرطیکہ حساب درست ہو۔ وہ کہا کرتا ہے۔"جس طرح ایک پائی کی کمی بیشی حساب میں بہت بڑی گڑ بڑ پیدا کر دیتی ہے۔ اس طرح ستاروں کے حساب میں معمولی سی غلطی ہمیں کہیں کی کہیں لے جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ وثوق کے ساتھ کوئی نتیجہ قائم نہیں کرنا چاہیئے۔ کیونکہ ہو سکتا ہے ہم سے سہو ہو گیا ہو۔"

ریس کے گھوڑوں کے ٹپ حاصل کرنے میں بھی عام طور پر اشوک اِسی علم سے مدد لیتا ہے۔ گھنٹوں باتھ روم میں بیٹھا حساب لگاتا رہتا ہے۔ مگر پوری ریس میں سو روپے سے زیادہ اُس نے کبھی نہیں کھیلا۔ اور یہ عجیب اتفاق ہے۔ کہ وہ ہمیشہ جیتتا ہے۔ سو کے ایک سو دس ہو گئے۔ سو کے سو ہی رہے۔ مگر ایسا کبھی نہیں ہُوا۔ کہ اُس کے سو میں سے ایک پائی کم ہوئی ہو —— وہ ریس جیتنے کے لئے نہیں محض تفریح کے لئے کھیلتا ہے۔ اس کی حسین و جمیل بیوی شوبھا تین بچّوں کی ماں ہمیشہ اس کے ساتھ ہوتی ہے۔ ممبرز انکلوژر میں داخل ہوتے ہی وہ ایک کونے میں الگ تھلگ بیٹھ جاتا ہے۔ ریس شروع ہونے سے چند منٹ پہلے اپنی

بیوی کو روپے دیتا ہے کہ فلاں فلاں نمبر کے ٹکٹ لے آؤ۔ جب ریس ختم ہوتی ہے تو اُس کی بیوی ہی کھڑکی پہ جاکر جیتنے والے ٹکٹوں کے روپے وصول کرتی ہے۔

شوبھا گھریلو عورت ہے۔ تعلیم واجبی ہے۔ اشوک کہا کرتا ہے کہ اَن پڑھ ہے مگر صرف ازراہِ مذاق۔ اس کی ازدواجی زندگی بہت کامیاب ہے۔ شوبھا اتنی دولت ہونے کے باوجود گھر کے کام کاج میں مشغول رہتی ہے۔ ٹھیٹ بنگالیوں کی طرح سُوتی دھوتی پہنے اور اس کے پلّو کے ایک کونے میں چابیوں کا یہ بڑا گچھّا اُڑسے وہ مجھے ہمیشہ اپنے گھر میں مصروفِ کار نظر آئی۔ شام کو جب کبھی وسکی کا ایک دَور چلتا تو گزک کی چیزیں شوبھا اپنے ہاتھ سے تیار کرتی تھی۔ کبھی نمکین پارے کبھی بھُنی ہوئی دال۔ کبھی آلوؤں کے قتلے۔

میں ذرا زیادہ پینے کا عادی تھا۔ اس لئے شوبھا اشوک سے کہتی تھی۔ "دیکھو گانگولی! مسٹر منٹو کو زیادتی مت دینا۔ مسز منٹو ہم کو بولیں گی۔"

مسز منٹو اور مسز گانگولی دونوں سہیلیاں تھیں۔ ان سے ہم دونوں بہت کام نکالتے تھے۔ جنگ کے باعث بڑے اچھے سگرٹ قریب قریب ناپید تھے۔ جتنے بھی باہر سے آتے تھے۔ سب کے سب بلیک مارکٹ میں چلے جاتے تھے۔ یوں تو ہم عام طور پر اس بلیک مارکٹ ہی سے اپنے لئے سگرٹ حاصل کرتے تھے مگر جب کسی وسیلے سے صحیح قیمت پر کوئی چیز مل جاتی۔ تو ہم عجیب و غریب مسرّت محسوس کرتے۔

مسز گانگولی جب شوپنگ کرنے نکلتی۔ تو میری بیوی صفیہ کو کبھی کبھی اپنے ساتھ لے جاتی۔ قریب قریب ہر بڑے دکاندار کو معلوم تھا کہ مسز گانگولی مشہور ایکٹر اشوک کمار کی بیوی ہے۔ چنانچہ اس کے طلب کرنے پر بلیک مارکٹ کی تاریک تہوں میں چھپائی ہوئی چیزیں باہر نکل آتی تھیں۔ یوں بھی بمبے کے مرد عورتوں کے معاملے میں کافی نرم دل واقع ہوئے ہیں۔

بنک سے روپیہ نکلوانا ہو۔ کوئی رجسٹری کرانا ہو۔ سینما یا ریل گاڑی کے ٹکٹ لینا ہوں۔ مرد پڑا ڈیڑھ گھنٹہ سوکھتا رہے گا۔ لیکن اس کے مقابلے میں عورت کو ایک منٹ بھی انتظار کرنا نہیں پڑے گا۔

اشوک نے اپنی شہرت اور ہر دلعزیزی سے شاید ہی فائدہ اُٹھایا۔ مگر دوسرے بعض اوقات اس کے علم کے بغیر اس کے ذریعے سے اپنا اُلّو سیدھا کر لیتے تھے۔ راجہ مہدی علی خاں نے ایک دفعہ بڑے ہی دلچسپ طریقے سے اپنا اُلّو سیدھا کیا۔

راجہ فلمستان میں ملازم تھا۔ میں فلمستان چھوڑ کر ولی صاحب کے لئے ایک کہانی لکھ رہا تھا۔ ایک روز مجھے ٹیلیفون پر اشوک کے سکرٹری نے بتایا۔ کہ راجہ مہدی علی خاں بیمار ہیں۔ میں وہاں پہنچا تو دیکھا کہ جناب کی بہت بری حالت ہے گلا اس قدر خراب ہے کہ آواز ہی نہیں نکلتی۔ نقاہت کا یہ عالم ہے کہ سہارا لے کر بھی اُٹھا نہیں جاتا۔ اور آپ نمکین پانی کے غراروں اور اورینٹل بام کی مالش سے اپنا مرض دور کرنے کی کوشش فرما رہے ہیں۔

مجھے شبہ سا ہوُا۔ کہیں ڈپتھیریا نہ ہو چنانچہ میں نے انھیں فوراً موٹر میں لادا اور اشوک کو ٹیلیفون کیا۔ اُس نے مجھے اپنے ایک واقف ڈاکٹر کا نام بتایا کہ وہاں لے جاؤ۔ میں راجہ صاحب کو وہاں لے گیا۔ تشخیص کے بعد معلوم ہوُا۔ کہ واقعی وہی موذی مرض ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے مشورے کے مطابق میں نے فوراً ہی متعدی امراض کے ہسپتال میں اُن کو داخل کرا دیا۔ ٹیکے وغیرہ دیئے گئے دوسرے روز صبح میں نے اشوک کو ٹیلیفون پر راجہ کے مرض کی نوعیت بتائی۔ جب اُس نے کوئی تشویش ظاہر نہ کی۔ تو مجھے غصہ آگیا۔ کہ تم کیسے انسان ہو۔ ایک آدمی ایسے خوفناک مرض میں مبتلا ہے۔ بیچارے کا یہاں کوئی پرسانِ حال بھی نہیں اور تم کوئی دلچسپی ہی نہیں لے رہے۔

اشوک نے جواباً صرف اس قدر کہا۔ "آج شام کو چلیں گے اُس کے پاس"

ٹیلیفون بند کر کے میں ہسپتال پہنچا اور دیکھا کہ راجہ کی حالت پہلے کی نسبت کسی قدر بہتر ہے۔ ڈاکٹر نے جو ٹیکے کہے تھے وہ میں لے آیا تھا۔ یہ اُس کے حوالے کر کے اور دم دلاسہ دے کر میں اپنے کام پر چلا گیا۔

شام کو اشوک نے مجھے دلّی کے دفتر میں پکڑ لیا۔ میں ناراض تھا مگر اُس نے مجھے منا لیا۔ موٹر میں ہسپتال پہنچے۔ اشوک نے راجہ سے معذرت طلب کی کہ وہ بے حد مصروف تھا۔ ادھر اُدھر کی باتیں ہوئیں۔ اس کے بعد اشوک مجھے گھر چھوڑ کر چلا گیا۔

دوسرے روز ہسپتال پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں۔ راجہ، راجہ بنا بیٹھا ہے۔ بستر کی چادر اُجلی، تکیے کا غلاف اُجلا۔ سگرٹ کی ڈبیا، پان، سرہانے کی ونڈوسل پر پھولدان ٹانگ پر ٹانگ رکھے ہسپتال کا صاف ستھرا جوڑا پہنے بڑے عیاشانہ طور پر اخبار کا مطالعہ کر رہا تھا۔ میں نے حیرت بھرے لہجہ میں اُس سے پوچھا۔ "کیوں راجہ۔ یہ سب کیا۔"

راجہ مسکرایا۔ اس کی یہ بڑی بڑی مونچھیں تھرائیں۔ "یہ تو کچھ بھی نہیں —— ابھی اور دیکھنا۔"

میں نے پوچھا "کیا؟"

"عیاشی کے سامان —— کچھ روز اور میں یہاں رہا تو تم دیکھو گے کہ پاس والے کمرہ میں میری حرم سرائے ہو گی۔ خدا جیتا رکھے میرے اشوک کمار کو —— بتاؤ وہ کیوں نہیں آیا۔"

تھوڑی دیر کے راجہ نے بتایا۔ کہ وہ سب کچھ اشوک کا نورِ ظہور ہے —— ہسپتال والوں کو پتہ چل گیا۔ کہ اشوک اس کی بیمار پُرسی کے لئے آیا تھا۔ چنانچہ ہر چھوٹا بڑا راجہ کے پاس آیا۔ ہر ایک نے اس سے ایک ہی قسم کے متعدد سوال کئے۔

"کیا اشوک واقعی اس کی بیمار پرسی کے لئے آیا تھا؟"

"اشوک سے اُس کے کیا تعلقات ہیں؟"

"کیا وہ پھر آئے گا؟"

"کب اور کس وقت آئے گا؟"

راجہ نے ان کو بتایا کہ اشوک اس کا بہت ہی گہرا دوست ہے۔ اس کے لئے اپنی جان تک دینے کو تیار ہے وہ ہسپتال میں اس کے ساتھ ہی رہنے کو تیار تھا۔ مگر ڈاکٹر نہ مانے۔ صبح شام آتا مگر کنٹریکٹ کچھ ایسے ہیں کہ مجبور ہے۔ آج شام کو ضرور آئے گا ــــ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خیراتی ہسپتال کے خیراتی کمرے میں اس کو ہر قسم کی سہولت میسر تھی۔

وقت ختم ہونے پر میں جانے ہی والا تھا کہ میڈیکل اسٹوڈنٹ لڑکیوں کا ایک گروہ کمرے میں داخل ہو...... راجہ مسکرایا۔

"خواجہ...... حرم سرائے کے لئے یہ ساتھ والا کمرہ میرا خیال ہے چھوٹا رہے گا"

اشوک بہت اچھا ایکٹر ہے، مگر وہ صرف اپنی جان پہچان کے بے تکلف لوگوں کے ساتھ مل کر ہی پوری دلجمعی سے کام کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن فلموں میں اُس کا کام اطمینان بخش نہیں ہے جو اُس کی ٹیم نے نہیں بنائے۔ اپنے لوگوں میں ہو تو وہ کھل کر کام کرتا ہے ٹیکنیشنوں کو مشورے دیتا ہے، ان کے مشورے قبول کرتا ہے۔ اپنی ایکٹنگ کے متعلق لوگوں سے استفسار کرتا ہے۔ ایک سین کو مختلف شکلوں میں ادا کر کے خود پرکھتا ہے اور دوسروں

کی رائے لیتا ہے۔ اس فضا سے اگر کوئی اسے باہر لے جاتا ہے تو وہ بہت الجھن محسوس کرتا ہے۔

تعلیم یافتہ ہونے اور بمبئی ٹاکیز جیسے با ذوق فلمی ادارے کے ساتھ کئی برسوں تک منسلک رہنے کی وجہ سے اشوک کو فلمی صنعت کے قریب قریب ہر شعبے سے واقفیت حاصل ہو گئی تھی۔ وہ کیمرے کی باریکیاں جانتا تھا۔ لیبارٹری کے تمام پیچیدہ مسائل سمجھتا تھا۔ ایڈیٹنگ کا عملی تجربہ رکھتا تھا اور ڈائرکشن کی گہرائیوں کا بھی مطالعہ کر چکا تھا۔ چنانچہ فلمستان میں جب اُس سے رائے بہادر چونی لال نے ایک فلم پروڈیوس کرنے کے لئے کہا تو وہ فوراً تیار ہو گیا۔

ان دنوں فلمستان کا پروپیگنڈا فلم "شکاری" مکمل ہو چکا تھا۔ اس لئے میں کئی مہینوں کی لگاتار محنت کے بعد گھر میں چھٹیوں کے مزے اڑا رہا تھا۔ ایک دن ساوک واچا آئے۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد کہنے لگے۔ سعادت ...... ایک کہانی لکھ دو گنگولی کے لئے۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ ساوک کا کیا مطلب ہے۔ میں فلمستان کا ملازم تھا اور میرا کام ہی کہانیاں لکھنا تھا۔ گنگولی کے لئے کہانی لکھوانے کے لئے ساوک کی سفارش کی کیا ضرورت تھی۔ مجھ سے وہاں فلمستان کا کوئی ذمہ دار رکن بھی کہتا، میں کہانی لکھنا شروع کر دیتا، لیکن بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ اشوک چونکہ فلم خود پروڈیوس کرنا چاہتا ہے۔ اس لئے اُس کی خواہش ہے کہ میں اُس کی خواہش کے مطابق کوئی نہایت ہی اچھوتی کہانی

لکھوں۔ وہ خود میرے پاس اس لئے نہ آیا کہ وہ دوسروں سے کئی کہانیاں سن چکا تھا۔

بہرحال ساوک کے ساتھ وقت مقرر ہوا اور ہم سب ساوک ہی کے صاف ستھرے فلیٹ میں جمع ہوئے۔ اشوک کو کیسی کہانی چاہیے تھی۔ یہ خود اس کو معلوم نہیں تھا۔ "بس منٹو ایسی کہانی ہو کہ مزا آجائے...... اتنا خیال رکھو کہ یہ میرا پہلا فلم ہوگا۔"

ہم سب نے مل کر گھنٹوں مغز پاشی کی، مگر کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ اُن دنوں آغاخاں کی ڈائمنڈ جوبلی ہونے والی تھی جس کے لئے ساوک کے فلیٹ کی پرلی طرف برے بورن اسٹیڈیم میں ایک بہت بڑا پنڈال تعمیر کیا جا رہا تھا۔ میں نے اس سے انسپی ریشن حاصل کرنے کی کوشش کی.... ساوک کے سٹنگ روم میں صنم تراشی کا ایک نہایت ہی عمدہ نمونہ تھا۔ اس کو بھی دماغ میں گھمایا پھرایا۔ اپنے پرانے کارناموں پر نظر ڈالی مگر کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔

دن بھر کی سعیٔ ناکام کی کوفت دور کرنے کے لئے شام کو باہر ٹیرس پر برانڈی کا دور شروع ہوا۔ شراب کے انتخاب میں ساوک واچا بہت ہی عمدہ ذوق کا مالک ہے۔ برانڈی چنانچہ ذائقہ اور قوام کی بہت ہی اچھی تھی۔ حلق سے اُترتے ہی لطف آگیا۔ سامنے چرچ گیٹ اسٹیشن تھا۔ نیچے بازار میں خوب چہل پہل تھی۔ ادھر بازار کے اختتام پر سمندر اوندھے منہ لیٹا سستا رہا تھا۔ بڑی بڑی قیمتی کاریں سڑک کی چمکیلی سطح پر تیر رہی تھیں.... تھوڑی دیر کے بعد

بعد ایک ہانپتا ہُوا سڑکیں کوٹنے والا انجن نمودار ہوا...... میں نے ایسے ہی سوچا...... خدا معلوم کہاں سے یہ خیال میرے دماغ میں آن ٹپکا کہ اگر اس ٹیرس سے کوئی خوبصورت لڑکی ایک رقعہ گرائے اس نیت سے کہ وہ جس کے ہاتھ لگے گا وہ اس سے شادی کرے گی تو کیا ہو؟...... ہو سکتا ہے کہ رقعہ کسی پیکارڈ موٹر میں جا گرے...... اور یہ بھی سکتا ہے کہ اُڑتا اُڑتا سڑکیں کوٹنے والے انجن کے ڈرائیور کے پاس جا پہنچے...... ہو سکنے کا یہ سلسلہ کتنا دراز تھا اور کتنا دلچسپ!

میں نے اس کا ذکر اشوک اور ساوک سے کیا۔ اُن کو مزا آ گیا۔ اور مزا لینے کی خاطر ہم نے برانڈی کا ایک اور دور چلایا اور بے لگام خیال آرائیاں شروع کر دیں۔ جب محفل برخواست ہوئی تو طے پایا کہ کہانی کی بنیادیں اسی خیال پر استوار کی جائیں۔

کہانی تیار ہو گئی مگر اس کی شکل کچھ اور ہی تھی۔ حسینہ کا لکھا ہُوا رقعہ رہا، نہ سڑکیں کوٹنے والا انجن۔ پہلے پہلے خیال تھا کہ ٹریجڈی ہونی چاہیے۔ مگر اشوک چاہتا تھا کہ کومیڈی ہو اور وہ بھی بہت ہی تیز رفتار، چنانچہ دماغ کی ساری قوتیں اسی طرف صرف ہونے لگیں۔ کہانی مکمل ہو گئی تو اشوک کو پسند آئی۔ شوٹنگ شروع ہو گئی۔ اب فلم کا ایک ایک فریم اشوک کی ہدایات کے ماتحت تیار ہونے لگا۔ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ "آٹھ دن" تمام و کمال

اشوک کی ڈائرکشن کا نتیجہ تھی کہ پردے پر ڈائرکٹر کا نام ڈی، این پائی تھا، جس نے اس فلم کا ایک انچ بھی ڈائرکٹ نہیں کیا تھا۔ بمبئی ٹاکیز میں فلم ڈائرکٹر کو بہت کم اہمیت دی جاتی تھی۔ سب مل کر کام کرتے تھے۔ جب فلم نمائش کے لئے پیش ہوتا تھا تو ایک کارکن کا نام بطور ڈائرکٹر کے پیش کر دیا جاتا تھا۔ یہ طریقۂ کار فلمستان میں بھی رائج تھا۔ ڈی، این، پائی فلم ایڈیٹر تھا اور اپنے کام میں بہت ہوشیار۔ چنانچہ متفقہ طور پر یہی فیصلہ ہوا تھا کہ بحیثیت ڈائرکٹر کے اُس کا نام فلم کے کریڈٹ ٹائٹلز میں پیش کیا جائے۔

اشوک جتنا اچھا کردار کار ہے اتنا ہی اچھا ہدایت کار بھی ہے۔ اس کا علم مجھے "آٹھ دن" کی شوٹنگ کے دوران میں ہوا۔ معمولی سے معمولی منظر پر بھی وہ بہت محنت کرتا تھا۔ شوٹنگ سے ایک روز پہلے وہ مجھ سے نظر ثانی کیا ہوا سین لیتا اور غسل خانے میں بیٹھ کر گھنٹوں اس کی نوک پلک پر غور کرتا رہتا.....

یہ عجیب بات ہے کہ باتھ روم کے علاوہ اور کسی جگہ وہ پوری توجہ سے فکر طلب امور پر غور نہیں کر سکتا۔

اس فلم میں چار نئے آدمی بطور ایکٹر پیش ہوئے۔ راجہ مہدی علی خاں، اوپندر ناتھ اشک، محسن عبداللہ (پراسرار نینا کے سابق شوہر) اور راقم الحروف۔ ـــــ طے یہ ہوا تھا کہ ایس مکرجی کو ایک رول دیا جائے گا۔ مگر وقت آنے پر وہ اپنی بات سے پھر گئے۔ اس لئے کہ ان کے فلم "چل چل رے نوجوان" میں

کیمرے کی دہشت کے باعث میں نے کام کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ مکرجی کو بہانہ ہاتھ آیا۔ اصل میں وہ خود کیمرے سے خوف زدہ تھے۔

ان کا رول ایک "شل شوکڈ" فوجی کا تھا۔ اس کے لئے لباس وغیرہ سب تیار تھے۔ جب مکرجی نے انکار کیا تو اشوک بہت ٹپٹایا کہ ان کی جگہ اور کسے منتخب کرے۔ کئی دن شوٹنگ بند رہی۔ رائے بہادر چونی لال جب لال پیلے ہونے لگے تو اشوک میرے پاس آیا۔ میں چند مناظر کو دوبارہ لکھ رہا تھا۔ اس نے میز پر سے میرے کاغذ اٹھا کر ایک طرف رکھے اور کہا۔ "چلو منٹو"

میں اس کے ساتھ چل پڑا۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھے نئے گیت کی دھن سنوانے لے جارہا ہے۔ مگر وہ مجھے سیٹ پر لے گیا اور کہنے لگا۔ "پاگل کا پارٹ تم کرو گے۔"

مجھے معلوم تھا کہ مکرجی انکار کر چکا ہے۔ اور اشوک کو اُس خاص رول کے لئے کوئی آدمی نہیں مل رہا، لیکن یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ مجھ سے کہے گا کہ میں یہ رول ادا کروں، چنانچہ میں نے اُس سے کہا۔ "پاگل ہوئے ہو؟" اشوک سنجیدہ ہو گیا اور کہنے لگا کہ نہیں منٹو تمہیں یہ رول لینا ہی پڑے گا۔ راجہ مہدی علی خاں اور اوپندر ناتھ اشک نے بھی اصرار کیا۔ راجہ نے کہا۔ "تم نے مجھ کو اشوک کا بہنوئی بنا دیا۔ حالانکہ میں شریف آدمی ہرگز اس کے لئے تیار نہ تھا، کیونکہ میں اشوک کی عزت کرتا ہوں۔ تم پاگل بن جاؤ گے تو کون سی آفت آجائے گی؟"

اس پر مذاق شروع ہو گیا اور مذاق مذاق میں سعادت حسن منٹو، پاگل فلائٹ لفٹنٹ کا پارام بن گیا...... کیمرے کے سامنے میری جو حالت ہوئی اس کو اللہ بہتر جانتا ہے۔

فلم تیار ہو کر نمائش کے لئے پیش ہوا تو کامیاب ثابت ہوا۔ ناقدین نے اسے بہترین کامیڈی قرار دیا...... میں اور اشوک خاص طور پر بہت ہی مسرور تھے اور ہمارا ارادہ تھا کہ اب کی کوئی بالکل نئے ٹائپ کا فلم بنائیں گے۔ مگر قدرت کو یہ منظور نہیں تھا۔

ساوک واچا "آٹھ دن" کی شوٹنگ کے آغاز ہی میں اپنی والدہ کے علاج کے سلسلہ میں لندن چلا گیا تھا۔ وہ جب واپس آیا تو فلمی صنعت میں ایک انقلاب برپا ہو چکا تھا۔ کئی اداروں کے دیوالے پٹ گئے تھے۔ بمبئی ٹاکیز کی نہایت ابتر حالت تھی۔ ہمانسو رائے آنجہانی کے بعد دیوکارانی چند برسوں کی عدت کے بعد روس کے ایک جلاوطن نواب کے آرٹسٹ لڑکے رورک سے رشتۂ ازدواج قائم کر کے فلمی دنیا تیاگ چکی تھی۔ دیوکارانی کے بعد بمبئی ٹاکیز پر کئی بیرونی حملہ آوروں نے قبضہ کیا مگر اس کی حالت نہ سدھار سکے۔ آخر ساوک واچا لنڈن سے واپس آئے اور جرأتِ رندانہ سے کام لے کر بمبئی ٹاکیز کی عنانِ حکومت اشوک کی مدد سے اپنے ہاتھ میں لے لی۔

اشوک کو فلمستان چھوڑنا پڑا۔ اس دوران میں لاہور سے مسٹر موتی بی گڑوانی

نے تار کے ذریعے سے ایک ہزار روپیہ ماہوار کی اوفر دی۔ میں چلا گیا ہوتا۔ مگر مجھے ساوک کا انتظار تھا۔ جب اشوک اور وہ دونوں بمبئی ٹاکیز میں اکٹھے ہوئے تو میں ان کے ساتھ تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ہندوستان کی تقسیم کے لیئے انگریز رف کاپیوں پر نقشے بنا رہا تھا۔ جس میں چنگی ڈال یہ بی جمالو الگ کھڑی ہو کر تماشا دیکھنے کے لیئے جگہ بنا رہی تھی۔

میں نے جب بمبئی ٹاکیز میں قدم رکھا تو ہندو مسلم فسادات شروع تھے۔ جس طرح کرکٹ کے میچوں میں وکٹیں اڑتی ہیں یا ونڈریاں لگتی ہیں۔ اس طرح ان فسادوں میں لوگوں کے سر اڑتے تھے اور بڑی بڑی آگیں لگتی تھیں۔

ساوک واچا نے بمبئی ٹاکیز کی ابتر حالت کا اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد جب انتظام سنبھالا تو اسے بہت سی مشکلیں درپیش آئیں۔ غیر ضروری عنصر کو جو مذہب کے لحاظ سے ہندو تھا نکال باہر کیا تو کافی گڑبڑ ہوئی۔ مگر جب اس کی جگہ پر کی گئی، تو مجھے محسوس ہوا کہ کلیدی آسامیاں سب مسلمانوں کے پاس ہیں۔ میں تھا، شاہد لطیف تھا، عصمت چغتائی تھی، کمال امروہی تھا، حسرت لکھنوی تھا، نذیر اجمیری، ناظم پانی پتی اور میوزک ڈائرکٹر غلام حیدر تھے۔ یہ سب جمع ہوئے تو ہندو کارکنوں میں ساوک واچا اور اشوک کے خلاف نفرت کے جذبات پیدا ہو گئے۔ میں نے اشوک سے اس کا ذکر کیا تو ہنسنے لگا، "میں واچا سے کہہ دوں گا کہ وہ ایک ڈانٹ پلا دے۔"

ڈانٹ بتائی گئی تو اس کا اثر الٹا ہوا۔ واچا کو گمنام خط موصول ہونے لگے کہ اگر اس نے اپنے اسٹڈیو سے مسلمانوں کو باہر نہ نکالا تو اس کو آگ لگا دی جائے گی یہ خط واچا پڑھتا تو آگ بگولا ہو جاتا۔ "سالے مجھ سے کہتے ہیں کہ میں غلطی پر ہوں..... میں غلطی پر ہوں..... میں غلطی پر ہوں تو اُن کے باوا کا کیا جاتا ہے..... آگ لگائیں تو میں اُن سب کو اس میں جھونک دوں گا"

اشوک کا دل و دماغ فرقہ وارانہ تعصب سے بالکل پاک ہے۔ وہ کبھی اُن خطوط پر سوچ ہی نہیں سکتا تھا۔ جن پر آگ لگانے کی دھمکیاں دینے والے سوچتے تھے۔ وہ مجھ سے ہمیشہ کہتا۔ "منٹو یہ سب دیوانگی ہے...... آہستہ آہستہ دور ہو جائے گی۔"

مگر آہستہ آہستہ دور ہونے کے بجائے یہ دیوانگی بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی۔ ..... اور میں خود کو مجرم محسوس کر رہا تھا، اس لئے کہ اشوک اور واچا میرے دوست تھے۔ وہ مجھ سے مشورے لیتے تھے، اس لئے کہ اُن کو میرے خلوص پر بھروسہ تھا۔ لیکن میرا یہ خلوص میرے اندر سکڑ رہا تھا..... میں سوچتا تھا، اگر بمبے ٹاکیز کو کچھ ہو گیا تو میں اشوک اور واچا کو کیا منہ دکھاؤں گا۔

فسادات زوروں پر تھے۔ ایک دن میں اور اشوک بمبئی ٹاکیز سے واپس آ رہے تھے۔ راستے میں اُس کے گھر دیر تک بیٹھے رہے۔ شام کو اُس نے کہا۔ چلو میں تمھیں چھوڑ آؤں..... شورٹ کٹ کی خاطر وہ موٹر کو ایک خالص اسلامی محلے میں

لے گیا..... سامنے سے ایک برات آرہی تھی۔ جب میں نے بینڈ کی آواز سنی، تو میرے اوسان خطا ہوگئے۔ ایک دم اشوک کا ہاتھ پکڑ کر میں چلّایا۔ "دادامنی۔ یہ تم کدھر آنکلے!"

اشوک میرا مطلب سمجھ گیا۔ مسکرا کر اس نے کہا۔ "کوئی فکر نہ کرو۔"

میں کیونکر فکر نہ کرتا۔ موٹر ایسے اسلامی محلّے میں تھی جہاں کسی ہندو کا گذر ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ اور اشوک کو کون نہیں پہچانتا تھا۔ کون نہیں جانتا تھا کہ وہ ہندو ہے...... ایک بہت بڑا ہندو جس کا قتل معرکہ خیز ہوتا...... مجھے عربی زبان میں کوئی دعا یاد نہیں تھی۔ قرآن کی کوئی موزون و مناسب آیت بھی نہیں آتی تھی۔ دل ہی میں میں اپنے اوپر لعنتیں بھیج رہا تھا اور دھڑکتے ہوئے دل سے اپنی زبان میں بے جوڑ سی دعا مانگ رہا تھا کہ اے خدا مجھے سرخرو رکھیو...... ایسا نہ ہو کوئی مسلمان اشوک کو مار دے۔ اور میں ساری عمر اس کا خون اپنی گردن پر محسوس کرتا رہوں۔ یہ گردن قوم کی نہیں میری اپنی گردن تھی۔ مگر یہ ایسی ذلیل حرکت کے لئے دوسری قوم کے سامنے ندامت کی وجہ سے جھکنا نہیں چاہتی۔

جب موٹر برات کے جلوس کے پاس پہنچی تو لوگوں نے چلّانا شروع کر دیا "اشوک کمار — اشوک کمار"۔ میں بالکل یخ ہو گیا۔ اشوک اسٹیرنگ پر ہاتھ رکھے خاموش تھا۔ میں خوف و ہراس کی یخ بستگی سے نکل کر ہجوم سے یہ کہنے والا تھا کہ

دیکھو ہوش کرو۔ میں مسلمان ہوں۔ یہ مجھے میرے گھر چھوڑنے جا رہا ہے..... کہ دو نوجوانوں نے آگے بڑھ کر بڑے آرام سے کہا۔" اشوک بھائی آگل راستہ نہیں ملے گا۔ ادھر باجو کی گلی سے چلے جاؤ۔"

اشوک بھائی؟ اشوک ان کا بھائی تھا۔ اور میں کون تھا؟..... میں نے دفعتہً اپنے لباس کی طرف دیکھا جو کھادی کا تھا..... معلوم نہیں انھوں نے مجھے کیا سمجھا ہوگا۔ مگر ہو سکتا ہے کہ انھوں نے اشوک کی موجودگی میں مجھے دیکھا ہی نہ ہو۔

موٹر جب اس اسلامی محلے سے نکلی۔ تو میری جان میں جان آئی۔ میں نے اللہ کا شکر ادا کیا تو اشوک ہنسا۔ "تم خواہ مخواہ گھبرا گئے ـــــ آرٹسٹوں کو یہ لوگ کچھ نہیں کہا کرتے۔"

چند روز بعد بمبے ٹاکیز میں نذیر اجمیری کی کہانی (جو "مجبور" کے نام سے فلم بند ہوئی) پر میں نے جب کڑی نکتہ چینی کی اور اس میں کچھ تبدیلیاں کرنا چاہیں، تو نذیر اجمیری نے اشوک اور واچا سے کہا۔ "منٹو کو آپ ایسے مباحثوں کے دوران میں نہ بٹھایا کریں۔ وہ چونکہ خود افسانہ نویس ہے اس لئے متعصب ہے۔"

میں نے بہت غور کیا۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ آخر میں نے اپنے آپ سے کہا۔ "منٹو بھائی ـــــ آگل راستہ نہیں ملے گا ـــــ موٹر روک لو ـــــ ادھر باجو کی گلی سے چلے جاؤ۔"

اور میں چپ چاپ باجو کی گلی سے پاکستان چلا آیا جہاں میرے افسانے "ٹھنڈا گوشت" پر مقدمہ چلایا گیا۔

نرگس

عرصہ ہُوا۔ نواب چھتاری کی صاحب زادی تسنیم (مسز تسنیم سلیم) نے مجھے ایک خط لکھا تھا:

"تو کیا خیال ہے آپ کا اپنے بہنوئی کے متعلق؟ وہ جو اندازہ آپ کی طرف سے لگا کر لوٹے ہیں۔ تو مجھے اپنے لئے شادی مرگ کا اندیشہ ہُوا جاتا ہے۔ اب میں آپ کو تفصیل سے بتا دوں کہ یہ حضرت مجھے آپ کے نام سے چھیڑا کرتے تھے۔ اور اُن کا خیال تھا کہ جب وہ میرے نادیدہ بھائی سے ملیں گے، تو نہ جانے کیا کیا حماقتیں سرزد ہوں گی...... اور مجھے شرمندگی ہو گی۔ اور اب پرسوں سے مُصر ہیں کہ بمبئی چل کر منٹو سے ملو۔

بہت ہی دلچسپ آدمی ہیں" اور اس طرح کہتے ہیں۔ گویا منٹو میرے بجائے ان کا بھائی ہے۔ اور میں ہمیشہ سے کہتی تھی کہ دیکھنا یہ حضرت کیسے نکلتے ہیں...... زبردستی تو ملاحظہ کیجئے...... بہر حال بہت خوش ہیں کہ میرا انتخاب بہت خوب رہا...... ہمارے برادرِ محترم یعنی ابن بھائی سلیم سے قبل ہی پہنچ گئے تھے۔ اور انھوں نے سب سے قبل یہی بات بتائی کہ وہ آپ سے نیاز حاصل کر کے آئے ہیں۔ نرگس کا ذکر عمداً گول کر کے باقی سب تفصیل سے بتا دیا۔ پھر جب سلیم آئے تو انھوں نے نہ صرف داستانِ جدّن سائی بتائی۔ بلکہ آپ کی اور نخشب کی جنگ کا واقعہ بھی دلچسپی سے بیان کیا۔ اس سلسلے میں سلیم معافی خواہ ہیں۔ دوبارہ جدّن بائی کے یہاں جانے کے محرّک شمشاد بھائی (جو آپ سے مل چکے ہیں) وغیرہ تھے۔ اور اُن سے ممکن ہوتا۔ تو آپ سے علاوہ نہ جاتے۔ اور یہ تو آپ بھی جانتے ہیں کہ سلیم کو اگر عشق ہؤا ہے تو بیلا چٹنس سے ورنہ ایسے بد نظر بھی نہیں۔

میں بہت مصروف تھا۔ جب سلیم میرے یہاں آئے۔ ان سے میری پہلی

ملاقات تھی۔ اور بقول تسنیم کے وہ میرے بہنوئی تھے۔ اس لیئے ان کی خاطرداری کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ گھر میں جو حاضر تھا ان کو اور ان کے مصاحبوں کی خدمت میں پیش کر دیا۔ فلم سے متعلق لوگوں کے پاس ایک تحفے کی چیز "شوٹنگ" ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ بھی ان کو شری ساؤنڈ اسٹڈیو میں دکھا دی گئی۔ غالباً "پھول" کی تھی جسے ڈائرکٹر دھانسو یعنی آصف بنا رہا تھا۔

سلیم اور اُن کے ساتھیوں کو بظاہر مطمئن ہو جانا چاہیئے تھا۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنا پروگرام بنا کر بمبے پہنچے تھے۔ سلیم نے برسبیلِ تذکرہ مجھ سے پوچھا۔ "کیوں صاحب نرگس کہاں ہوتی ہے آج کل؟"

میں نے ازراہِ مذاق کہا۔ "اپنی ماں کے پاس۔"

میرا مذاق غیر طبعی موت کی گود میں چلا گیا۔ جب میرے مہمانوں میں سے ایک نے بڑی نوّابانہ سادہ لوحی سے کہا۔ "جدّن بائی کے پاس؟"

"جی ہاں"

سلیم نے پوچھا۔ "کیا اس سے ملاقات ہو سکتی ہے — میرا یہ مطلب ہے کہ میرے یہ دوست اس کو دیکھنے کے بہت مشتاق ہیں...... کیا آپ اس کو جانتے ہیں؟"

میں نے جواب دیا۔ "جانتا ہوں..... مگر معمولی سا۔"

ایک صاحب نے بڑے بے ڈھب انداز میں سوال کیا۔ "کیوں؟"

"اس لئے کہ اُسے اور مجھے ابھی تک کسی فلم میں اکٹھے کام کرنے کا موقعہ نہیں ملا۔"
سلیم نے یہ سن کر کہا۔ "تو چھوڑ دیجئے ۔۔۔ ہم آپ کو خواہ مخواہ تکلیف دینا نہیں چاہتے۔"

لیکن میں خود نرگس کے ہاں جانا چاہتا تھا۔ کئی دفعہ ارادہ کیا تھا۔ مگر اکیلا جانا مجھے پسند نہیں تھا۔ ساتھ ملتا تو تھا مگر نہایت ہی بے ہودہ۔ یعنی دیدے پھاڑ پھاڑ کر گھورنے والا۔ اب موقعہ تھا آدمی سادہ لوح تھے۔ محض عیّاشی کے طور پر نرگس کو ایک نظر دیکھنا چاہتے تھے تاکہ واپس اپنی جاگیروں اور ریاستوں میں جاکر اپنے دوستوں اور مصاحبوں کو مشہور فلم اسٹار نرگس کے چشم دید حالات سنائیں۔ چنانچہ میں نے سلیم سے کہا۔ "تکلیف کی کوئی بات نہیں۔ چلتے ہیں۔ ممکن ہے ملاقات ہو جائے۔"

میں نرگس سے کیوں ملنا چاہتا تھا۔ بمبے میں اتنی ایکٹرسیں تھیں۔ جن کے ہاں میں جب چاہتا آ جا سکتا تھا۔ مگر خاص طور پر نرگس سے ملنے کا مطلب کیا تھا؟ میرا خیال ہے۔ اس کا جواب دینے سے پہلے میں آپ کو ایک دلچسپ واقعہ سنا دوں۔

میں فلمستان میں ملازم تھا۔ صبح جاتا تو شام کو آٹھ کے قریب لوٹتا۔ ایک روز اتفاق سے واپسی جلدی ہوئی۔ یعنی میں دوپہر ہی کے قریب گھر پہنچ گیا۔ اندر داخل ہوا تو ساری فضا مرتعش نظر آئی۔ جیسے کوئی ساز کے تار چھیڑ کر خود چھپ گیا ہے

ڈریسنگ ٹیبل کے پاس میری دو سالیاں کھڑی بظاہر اپنے بال گوندھ رہی تھیں۔ مگر اُن کی انگلیاں ہوا میں چل رہی تھیں۔ ہونٹ دونوں کے پھڑپھڑا رہے تھے۔ مگر آواز نہیں نکلتی تھی۔ دونوں مل جل کر گھبراہٹ کی ایسی تصویر پیش کر رہی تھیں جو اپنی گھبراہٹ چھپانے کی خاطر بے مطلب دوپٹہ اوڑھنے کی کوشش کر رہی ہو۔ ملحقہ کمرے کے دروازے کا پردہ اندر کی طرف دبا ہوا تھا۔

میں صوفے پر بیٹھ گیا۔ دونوں بہنوں نے ایک دوسرے کی طرف قصور وار نگاہوں سے دیکھا۔ ہولے ہولے کھسر پھسر کی۔ پھر دونوں نے بیک وقت کہا۔ "بھاجی سلام۔"

"وعلیکم السلام" میں نے غور سے اُن کی طرف دیکھا۔ "کیا بات ہے؟"

میں نے سوچا کہ سب مل کر سینما جا رہی ہیں۔ دونوں نے میرا سوال سن کر پھر کھسر پھسر کی۔ پھر ایک دم کھلکھلا کر ہنسیں اور دوسرے کمرے میں بھاگ گئیں۔ میں نے سوچا کہ شاید انھوں نے اپنی کسی سہیلی کو مدعو کیا ہے، وہ آنے والی ہے اور چونکہ میں غیر متوقع طور پر جلد چلا آیا ہوں۔ اس لئے ان کا پروگرام درہم برہم ہو گیا ہے۔

دوسرے کمرے میں کچھ دیر تک تینوں بہنوں میں سرگوشیاں ہوتی رہی ہیں۔ دبی دبی ہنسی کی آوازیں بھی آتی رہیں۔ اس کے بعد سب سے بڑی بہن یعنی میری بیوی بظاہر اپنی بہنوں سے مخاطب، مگر دراصل مجھے سنانے کے لئے یہ

کہتی ہوئی باہر نکلی۔ "مجھے کیا کہتی ہو۔ کہنا ہے تو خود اُن سے کہو — سعادت صاحب آج بہت جلدی آگئے ؟"

میں نے وجہ بیان کر دی کہ اسٹوڈیو میں کوئی کام نہیں تھا اس لئے چلا آیا۔ پھر اپنی بیوی سے پوچھا۔ "کیا کہنا چاہتی ہیں میری سالیاں ؟"

"یہ کہنا چاہتی ہیں کہ نرگس آرہی ہے۔"

"تو کیا ہوا — آئے۔ کیا وہ پہلے کبھی نہیں آئی۔"

میں سمجھا کہ وہ اُس پارسی لڑکی کی بات کر رہی ہے جس کی ماں نے ایک مسلمان سے شادی کر لی تھی اور ہمارے پڑوس میں رہتی تھی۔ مگر میری بیوی نے کہا۔ "ہائے، وہ پہلے کب ہمارے ہاں آئی ہے۔"

"تو کیا وہ کوئی اور نرگس ہے ؟"

"میں نرگس ایکٹرس کی بات کر رہی ہوں۔"

میں نے تعجب سے پوچھا۔ "وہ کیا کرنے آرہی ہے یہاں ؟"

میری بیوی نے مجھے سارا قصّہ سنایا۔ گھر میں ٹیلیفون تھا۔ جسے تینوں بہنیں فرصت کے اوقات میں بڑی فراخدلی سے استعمال کرتی تھیں۔ جب اپنی سہیلیوں سے باتیں کرتی کرتی تھک جاتیں تو کسی ایکٹرس کا نمبر گھما دیتیں۔ وہ مل جاتی تو اُس سے اوٹ پٹانگ گفتگو شروع ہو جاتی — ہم آپ کی بہت مدّاح ہیں۔ آج ہی دلّی سے آئی ہیں۔ بڑی مشکلوں سے آپ کا نمبر حاصل کیا ہے۔ آپ سے

ملاقات کرنے کے لئے تڑپ رہی ہیں۔ ضرور حاضر ہوتیں مگر پردے کی پابندی ہے
۔ آپ بہت حسین ہیں چندے آفتاب چندے ماہتاب۔ گلا ماشاء اللہ بہت ہی
سریلا ہے (حالانکہ ان کو معلوم ہوتا تھا کہ اس میں امیر بائی بولتی ہے یا شمشاد)
عام طور پر مشہور فلم ایکٹرسوں کے ٹیلیفون نمبر ڈائرکٹری میں درج نہیں ہوتے۔
وہ خود نہیں کراتیں کہ اُن کے چاہنے والے بیکار تنگ نہ کریں۔ مگر ان تین بہنوں
نے میرے دوست آغا خلش کاشمیری کے ذریعے سے قریب قریب اُن تمام
ایکٹرسوں کے فون نمبر معلوم کر لئے تھے۔ جو انھیں ڈائرکٹری میں نہیں ملے تھے
اس ٹیلی فونی شغل کے دوران میں جب انھوں نے نرگس کو بلایا اور اس سے
بات چیت کی۔ تو بہت پسند آگئی۔ اس گفتگو میں ان کو اپنی عمر کی آواز سنائی دی۔
چنانچہ چند گفتگوؤں ہی میں وہ اس سے بے تکلف ہو گئیں۔ مگر اپنی اصلیت چھپائے
رکھی۔ ایک کہتی میں افریقہ کی رہنے والی ہوں۔ وہی دوسری بار یہ بتاتی کہ لکھنو
سے اپنی خالہ کے پاس آئی ہے۔ دوسری یہ ظاہر کرتی کہ وہ راولپنڈی کی رہنے
والی ہے۔ اور صرف اس لئے بمبے آئی ہے۔ کہ اُسے نرگس کو ایک بار دیکھنا ہے۔
تیسری، یعنی میری بیوی کبھی گجراتن بن جاتی کبھی پارسن۔
ٹیلیفون پر کئی بار نرگس نے جھنجھلا کر پوچھا کہ تم لوگ اصل میں کون ہو۔ کیوں اپنا
نام پتہ چھپاتی ہو۔ صاف صاف کیوں نہیں بتاتیں کہ یہ روز روز کی ٹن ٹن ختم ہو۔
ظاہر ہے کہ نرگس ان سے متاثر تھی۔ اس کو یقیناً اپنے سینکڑوں مداحوں کے

فون آتے ہوں گے۔ مگر یہ تین لڑکیاں ان سے کچھ مختلف تھیں اس لئے وہ سخت بے چین تھی کہ اُن کی اصلیت جانے اور اُن سے ملے جلے، چنانچہ جب بھی اُسے معلوم ہوتا کہ اُن پر اسرار لڑکیوں نے اُسے بلایا ہے تو وہ سو کام چھوڑ کر آتی۔ اور بہت دیر تک ٹیلیفون کے ساتھ چپکی رہتی۔

ایک دن نرگس کے پیہم اصرار پر بالآخر طے ہو گیا کہ اُن کی ملاقات ہو کے رہے گی میری بیوی نے اپنے گھر کا پتہ اچھی طرح سمجھا دیا۔ اور کہا کہ اگر پھر بھی مکان ملنے میں دقّت ہو تو بائی کھلّہ کے پل کے پاس کسی ہوٹل سے ٹیلیفون کر دیا جائے۔ وہ سب وہاں پہنچ جائیں گی۔

جب میں گھر میں داخل ہوا۔ بائی کھلّہ پل کے ایک اسٹور سے نرگس نے فون کیا تھا کہ وہ پہنچ چکی ہے۔ مگر مکان نہیں مل رہا۔ چنانچہ تینوں افراتفری کے عالم میں تیار ہو رہی تھیں کہ میں بلائے ناگہانی کی طرح پہنچ گیا۔

چھوٹی دو کا خیال تھا کہ میں ناراض ہوں گا۔ بڑی یعنی میری بیوی محض بوکھلائی ہوئی تھی کہ یہ سب کیا ہوا ہے ـــــ میں نے ناراض ہونے کی کوشش کی مگر مجھے اس کے لئے کوئی معقول جواز نہ ملا۔ سارا قصّہ کافی دلچسپ اور بے حد معصوم تھا۔ اگر "دکان مچولی" کی یہ حرکت صرف میری بیوی سے سرزد ہوئی ہوتی تو بالکل جدا بات تھی۔ ایک سالی آدھی گھر والی ہوتی ہے اور یہاں دو سالیاں تھیں۔ پورا گھر ہی ان کا تھا۔ میں جب اٹھا تو دوسرے کمرے میں خوش ہونے اور تالیاں

بجانے کی آوازیں بلند ہوئیں۔

بائی کھلہ کے چوک میں جدّن بائی کی لمبی چوڑی موٹر کھڑی تھی۔ میں نے سلام کیا تو اُس نے حسبِ معمول بڑی بلند آواز میں اس کا جواب دیا اور پوچھا۔ "کہو منٹو کیسے ہو۔"

میں نے کہا۔ "اللہ کا شکر ہے ــــــ کیسے آپ یہاں کیا کر رہی ہیں۔"

جدّن بائی نے پچھلی نشست پر بیٹھی ہوئی نرگس کی طرف دیکھا۔ "کچھ نہیں بے بی کو اپنی سہیلیوں سے ملنا تھا۔ مگر ان کا مکان نہیں مل رہا۔"

میں نے مسکرا کر کہا۔ "چلیے میں آپ کو لے چلوں۔"

نرگس یہ سن کر کھڑکی کے پاس آگئی۔ "آپ کو ان کا مکان معلوم ہے؟"

میں نے اور زیادہ مسکرا کر کہا۔ "کیوں نہیں ــــــ اپنا مکان کون بھول سکتا ہے"

جدّن بائی کے حلق نے عجیب سی آواز نکالی۔ پان کے بیڑے کو دوسرے کلّے میں تبدیل کرتے ہوئے کہا۔ "یہ تم کیا افسانہ نگاری کر رہے ہو۔"

میں دروازہ کھول کر جدّن بائی کے پاس بیٹھ گیا۔ "بی بی! یہ افسانہ نگاری میری نہیں ہے۔ میری بیوی اور اُس کی بہنوں کی ہے۔" اس کے بعد میں نے مختصراً تمام واقعات بیان کر دئیے۔ نرگس بڑی دلچسپی سے سنتی رہی۔ جدّن بائی کو بہت کوفت ہوئی۔ "لاحول ولا..... یہ کیسی لڑکیاں ہیں۔ پہلے ہی دن کہہ دیا ہوتا کہ ہم منٹو کے گھر سے بول رہی ہیں ــــــ خدا کی قسم میں فوراً بے بی کو بھیج دیتی۔ بھئی حد ہو گئی ہے اتنے دن پریشان کیا..... خدا کی قسم بے چاری بے بی کو اتنی الجھن ہوتی تھی کہ

میں تم سے کیا کہوں۔ جب ٹیلی فون آتا۔ بھاگی بھاگی جاتی ——— میں ہزار پوچھتی یہ کون ہے جس سے اتنی دیر میٹھی میٹھی باتیں ہوتی ہیں۔ مجھ سے کہتی کوئی ہیں۔ جانتی نہیں کون نہیں۔ مگر ہیں بڑی اچھی۔ دو ایک بار میں نے بھی ٹیلیفون اٹھایا۔ گفتگو ماشاءاللہ بڑی شائستہ تھی۔ کسی اچھے گھر کی معلوم ہوتی تھیں۔ مگر معاف کرنا۔ کم بخت اپنا نام پتہ صاف بتاتی ہی نہیں تھیں۔ آج بے بی آئی۔ خوشی سے دیوانی ہو رہی تھی۔ کہنے لگی۔ بی بی! انھوں نے بلایا ہے۔ اپنا ایڈریس دے دیا ہے۔ میں نے کہا۔ پاگل ہوئی ہو۔ ہٹو جانے کون ہیں۔ کون نہیں ہیں۔ پر اس نے میری ایک نہ مانی، بس پیچھے پڑ گئی۔ چنانچہ مجھے ساتھ آنا ہی پڑا ——— خدا کی قسم اگر معلوم ہوتا کہ یہ آفتیں تمھارے گھر کی ہیں......"

میں نے بات کاٹ کر کہا۔ "تو ساتھ آپ نازل نہ ہوتیں"

جدن بائی کے کلّے میں دبے ہوئے پان میں چوڑی مسکراہٹ پیدا ہوئی۔

"اس کی ضرورت ہی کیا تھی ——— میں کیا تمھیں جانتی نہیں"

مرحومہ کو اردو ادب سے بڑا شغف تھا۔ میری تحریریں بڑے شوق سے پڑھتی اور پسند کرتی تھیں۔ ان دنوں میرا ایک مضمون "ساقی" میں شائع ہوا تھا۔ غالباً ترقی یافتہ قبرستان" معلوم نہیں اس کا ذہن کیوں اس طرف چلا گیا" خدا کی قسم منٹو ——— بہت خوب لکھتے ہو۔ ظالم کیا طنز کیا ہے اس مضمون میں ——— کیوں بے بی۔ اس دن کیا حال ہوا تھا میرا یہ مضمون پڑھ کر"

مگر نرگس اپنی نادیدہ سہیلیوں کے متعلق سوچ رہی تھی۔ اضطراب بھرے لہجہ میں اس نے اپنی ماں سے کہا۔ "چلو بی بی"

جدّن بائی مجھ سے مخاطب ہوئی۔ "چلو بھائی"

گھر پاس ہی تھا۔ موٹر اسٹارٹ ہوئی۔ اور ہم پہنچ گئے۔ اُوپر بالکنی سے تینوں بہنوں نے ہمیں دیکھا۔ چھوٹی دو کا مارے خوشی کا بُرا حال ہو رہا تھا۔ خدا معلوم آپس میں کیا کھسر پھُسر کر رہی تھیں۔ جب ہم اُوپر پہنچے تو عجیب و غریب طریقے پر سب کی ملاقات ہوئی۔ نرگس اپنی ہم عمر لڑکیوں کے ساتھ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ اور میں، میری بیوی اور جدّن بائی وہیں بیٹھ گئے۔

بہت دیر تک مختلف زاویوں سے کان مچولی کے سلسلے پر تبصرہ کیا گیا۔ میری بیوی کی بوکھلاہٹ جب کسی قدر کم ہوئی تو اُس نے میزبان کے فرائض سرانجام دینے شروع کر دئے۔

میں اور جدّن بائی فلم انڈسٹری کے حالات پر تبادلہ خیالات کرتے رہے۔ پان کھانے کے معاملے میں بڑی خوش ذوق تھی۔ ہر وقت اپنی پنڈنیا ساتھ رکھتی تھی۔ بڑی دیر کے بعد موقع ملا تھا۔ اس لئے میں نے اس پر خوب ہاتھ صاف کیا۔

نرگس کو میں نے ایک مدّت کے بعد دیکھا تھا۔ دس گیارہ برس کی بچّی تھی جب میں نے ایک دو مرتبہ فلموں کی نمائش عظمیٰ میں اُسے اپنی ماں کی اُنگلی کے ساتھ

20/9/1976

گنجے فرشتے

لپٹی دیکھا تھا۔ چندھیائی ہوئی آنکھیں بے کشش سا لمبوترا چہرہ۔ سوکھی سوکھی ٹانگیں، ایسا معلوم ہوتا تھا۔ سو کے اُٹھی ہے یا سونے والی ہے۔ مگر اب وہ ایک جوان لڑکی تھی۔ عمر نے اُس کی خالی جگہیں پُر کر دی تھیں۔ مگر آنکھیں ویسی کی ویسی تھیں۔ چھوٹی اور خواب زدہ ـــــ بیمار بیمار ـــــ میں نے سوچا اس رعایت سے اس کا نام نرگس موزون و مناسب ہے۔

طبیعت میں نہایت ہی معصوم کھلنڈرا پن تھا۔ بار بار اپنی ناک پونچھتی تھی جیسے ازلی زکام کی شکار رہے (برسات میں اس کو ادا کے طور پر پیش کیا گیا ہے) مگر اس کے اداس اداس چہرے سے صاف عیاں تھا۔ کہ وہ اپنے اندر کردار نگاری کا جوہر رکھتا ہے۔ ہونٹوں کو کسی قدر بھینچ کر بات کرنے اور مسکرانے میں گو بظاہر ایک بناوٹ تھی۔ مگر صاف پتہ چلتا تھا کہ یہ بناوٹ سنگار کا روپ اختیار کر کے رہے گی۔ آخر کردار نگاری کی بنیادیں بناوٹ ہی پر تو استوار ہوتی ہیں۔

ایک بات جو خاص طور پر میں نے محسوس کی وہ یہ ہے کہ نرگس کو اس بات کا کامل احساس تھا کہ وہ ایک دن بہت بڑی اسٹار بننے والی ہے۔ مگر یہ دن قریب تر لانے اور اُسے دیکھ کر خوش ہونے میں اسے کوئی عجلت نہیں تھی۔ اس کے علاوہ اپنے لڑکپن کی ننھی منی خوشیاں گھسیٹ کر بڑی بڑی بے ہنگم خوشیوں کے دائرے میں نہیں لے جانا چاہتی تھی۔

تینوں ہم عمر لڑکیاں دوسرے کمرے میں جو باتیں کر رہی تھیں۔ ان کا دائرہ

گھر اور کنونٹ کی چار دیواری تک محدود تھا۔ فلم اسٹڈیو میں کیا ہوتا ہے۔ رومانس کیا بلا ہے۔ اس سے ان کو کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ نرگس بھول گئی تھی کہ وہ فلم اسٹار ہے پردے پر جس کی ادائیں بکتی ہیں۔ اور اس کی سہیلیاں بھی یہ بھول گئی تھیں کہ نرگس اسکرین پہ بُری بُری حرکتیں کرنے والی ایکٹرس ہے۔

میری بیوی جو عمر میں نرگس سے بڑی تھی۔ اب اس کی آمد پہ بالکل بدل گئی تھی۔ اس کا سلوک اس سے ایسا ہی تھا جیسا اپنی چھوٹی بہنوں سے تھا۔ پہلے اُس کو نرگس سے اس لیے دلچسپی تھی کہ وہ فلم ایکٹرس ہے۔ پردے پر بڑی خوبی سے نت نئے مردوں سے محبت کرتی ہے۔ ہنستی ہے آہیں بھرتی ہے۔ کدکڑے لگاتی ہے۔ اب اسے خیال تھا کہ وہ کھٹّی چیزیں نہ کھائے۔ بہت ٹھنڈا پانی نہ پیئے۔ زیادہ فلموں میں کام نہ کرے۔ اپنی صحت کا خیال رکھے۔ اب اس کے نزدیک نرگس کا فلموں میں کام کرنا کوئی معیوب بات نہیں تھی۔

میں، میری بیوی، اور جدّن بائی اِدھر اُدھر کی باتوں میں مشغول تھے کہ آپا سعادت آ گئیں۔ میری ہم نام ہیں اور بڑی دلچسپ چیز ہیں۔ تصنّع سے لاکھوں میل دور — حسبِ معمول وہ اس انداز سے آئیں کہ جدّن بائی سے اُن کو متعارف کرانے کا ہمیں موقعہ ہی نہ ملا۔ اپنے دو ڈھائی من کے وجود کے بوجھ کو صوفے پہ ہلکا کرتے ہوئے بولیں ”صفو جان! تمھارے بھائی جان سے میں نے لاکھ کہا تھا کہ ایسی مردار موٹر نہ خریدو۔ مگر انھوں نے ایک نہ سُنی — دو قدم چلی ہوگی،

کہ ہانپنے لگی اور کھڑی ہوگئی۔ اب کھڑے ہینڈل مار رہے ہیں۔ میں نے کہا آپ جائیے۔ میں تو صفّو کے پاس بیٹھتی ہوں۔"

جدّن بائی غالباً کسی نواب کی بات کر رہی تھیں جو بہت عیاش تھا۔ آپا سعادت کی وجہ سے یہ بات مکمل نہ ہو سکی تھی۔ جب پھر شروع ہوئی تو آپا سعادت نے بھی اس میں حصّہ لینا شروع کر دیا۔ کاٹھیاواڑ کی قریب قریب تمام ریاستوں اور اُن کے نوابوں کو وہ اچھی طرح جانتی تھیں۔ کیونکہ ریاست مانگرول کے نوابی خاندان میں بیاہی گئی تھیں۔

جدّن بائی اپنے پیشے کی وجہ سے تمام والیانِ ریاست کو اچھی طرح جانتی پہچانتی تھیں۔ باتوں باتوں میں ایک بڑی ریاست خور قسم کی طوائف کا ذکر چھڑ گیا۔ آپا سعادت شروع ہو گئیں۔ "خدا ان سے محفوظ رکھے۔ جس کے ساتھ چمٹتی ہیں۔ اس کو دین کا رکھتی ہیں نہ دنیا کا۔ دولت برباد، صحت برباد، عزت برباد۔ صفّو جان میں تمھیں کیا بتاؤں، سو بیماریوں کی ایک بیماری ہے یہ طوائف ——"

میں اور میری بیوی سخت پریشان کہ آپا سعادت کو کیسے روکیں۔ جدّن بائی بڑی فراخدلی سے آپا سعادت کی ہاں میں ہاں ملا رہی تھی اور ہم دونوں پسینہ پسینہ ہوئے جا رہے تھے۔ ایک دو بار میں نے اُن کو روکنے کی کوشش کی مگر وہ اور زیادہ جوش میں آگئیں۔ جی بھر کے گالیاں دینے لگیں لیکن یک لخت انھوں نے جدّن بائی کی طرف دیکھا۔ ان کے سفید گوشت بھرے چہرے پر ایک

عجیب و غریب تھرتھری پیدا ہوئی۔ ان کی ناک کی کیل کا ہیرا گردن کی جنبش کے ساتھ دو تین دفعہ بڑی تیزی سے چمکا اور پھر اُن کا منھ کھلا۔ زور سے اپنی رانوں پر دو ہتّڑ مار کر اُنھوں نے تتلائے ہوئے لہجے میں جدّن بائی سے کہا۔ "آپ؟ ...... آپ تو جدّن ...... آپ جدّن بائی ہیں نا؟"

جدّن بائی نے بڑی متانت سے جواب دیا۔ "جی ہاں!"

آپا سعادت کا منھ اور زیادہ کھلا ...... "اوہ ...... تو آپ ...... میرا مطلب ہے کہ آپ تو بہت اونچی طوائف ہیں ...... کیوں صفو جان؟" صفو جان برف ہو گئی۔ میں نے جدّن بائی کی طرف دیکھا اور مسکرایا — میرا خیال ہے بہت ہی واہیات قسم کی مسکراہٹ تھی۔ جدن بائی نے یوں ظاہر کیا جیسے کوئی بات ہی نہیں ہوئی اور اُس بڑی ریاست خور قسم کی طوائف کے بقایا حالات بیان کرنے شروع کر دیئے جس کا ذکر چھیڑنے پر آپا سعادت کو پکھر دینا پڑا تھا۔

جدّن بائی کی کوشش کے باوجود بات نہ جمی۔ آپا سعادت کو اپنی غلطی کا اور ہمیں اپنی خفت کا بہت ہی شدید احساس تھا۔ مگر جب لڑکیاں آگئیں تو فضا کا تکدر دور ہو گیا۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد نرگس سے فرمائش کی گئی کہ وہ گا تا سنائے۔ اس پر جدّن بائی نے کہا۔ "میں نے اس کو موسیقی کی تعلیم نہیں دی موہن بابو اس کے خلاف تھے اور سچ پوچھئے تو مجھے بھی پسند نہیں تھا — تھوڑا بہت ٹوں ٹاں کر لیتی ہے۔" اس کے بعد وہ اپنی بیٹی سے مخاطب ہوئی۔

"سنا دو بے بی...... جیسا بھی آتا ہے سنا دو۔"

نرگس نے بڑی ہی معصومانہ بے تکلفی سے گانا شروع کر دیا۔۔ پرلے درجے کی کن سُری تھی۔ آواز میں رس نہ لوچ، میری چھوٹی سالی اُس سے لاکھوں درجے بہتر گاتی تھی۔ مگر فرمائش کی گئی تھی اور وہ بھی بڑی پُر اصرار، اس لیئے دو تین منٹ تک اس کا گانا برداشت کرنا ہی پڑا۔ جب اُس نے ختم کیا تو سب نے تعریف کی۔ میں اور آپا سعادت خاموش رہے۔ تھوڑی دیر کے بعد جدّن بائی نے رخصت چاہی۔ لڑکیاں نرگس سے گلے ملیں۔ دوبارہ ملنے کے وعدے وعید ہوئے۔ کچھ کھسر پھسر بھی ہوئی اور ہمارے مہمان چلے گئے۔

نرگس سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔

اس کے بعد اور کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ لڑکیاں ٹیلیفون کرتی تھیں اور نرگس اکیلی موٹر میں چلی آتی تھی۔ اس آمد و رفت میں اس کے ایکٹرس ہونے کا احساس قریب قریب مٹ گیا۔ وہ لڑکیوں سے اور لڑکیاں اس سے یوں ملتی تھیں جیسے وہ ان کی بہت پرانی سہیلی ہے۔ یا کوئی رشتہ دار ہے۔ لیکن جب وہ چلی جاتی تو کبھی کبھی تینوں بہنیں اس استعجاب کا اظہار کرتیں۔ خدا کی قسم عجیب بات ہے کہ نرگس بالکل ایکٹرس معلوم نہیں ہوتی۔

اس دوران میں تینوں بہنوں نے اس کا ایک تازہ فلم دیکھا۔ جس میں ظاہر ہے کہ وہ اپنے ہیرو کی محبوبہ تھی۔ جس سے وہ پیار محبت کی باتیں کرتی تھی اور اُسے

عجیب عجیب نگاہوں سے دیکھتی تھی۔ اس کے ساتھ لگ کر کھڑی ہوتی تھی۔ اس کا ہاتھ دباتی تھی۔ میری بیوی کہتی۔ "کم بخت اُس کے فراق میں کیسی لمبی لمبی آہیں بھر رہی تھی۔ جیسے سچ مچ اُس کے عشق میں گرفتار ہے۔" اور اُس کی چھوٹی دو بہنیں اپنے کنوارے ایکٹنگ سے ناآشنا دلوں میں سوچتیں۔ "اور کل وہ ہم سے پوچھ رہی تھی کہ گرم کی ٹوفی کیسے بنائی جاتی ہے۔"

نرگس کی اداکاری کے متعلق میرا خیال بالکل مختلف تھا۔ وہ قطعی طور پر جذبات و احساسات کی صحیح عکاسی نہیں کرتی تھی۔ محبت کی نبض کس طرح چلتی ہے یہ اناڑی انگلیاں کیسے محسوس کر سکتی تھیں۔ عشق کی دوڑ میں تھک کر ہانپنا اور اسکول کی دوڑ میں تھک کر سانس کا پھول جانا دو بالکل مختلف چیزیں ہیں۔ میرا خیال ہے کہ خود نرگس بھی اس کے فرق سے آگاہ نہیں تھی۔ اس کے شروع شروع کے فلموں میں چنانچہ دقیقہ رس نگاہیں فوراً معلوم کر سکتی ہیں۔ کہ اس کی اداکاری یکسر فریب کاری سے معرّا تھی۔

تصنّع کا یہ کمال ہے کہ وہ تصنّع معلوم نہ ہو۔ لیکن نرگس کے تصنّع کی بنیادیں چونکہ تجربے پر استوار نہیں تھیں۔ اس لیے اس میں یہ خوبی نہیں تھی۔ یہ صرف اس کا خلوص تھا۔ وہ بے پناہ خلوص جو اسے اپنے شوق سے تھا کہ وہ جذبات و احسات کے نہایت ہی خام اظہار کے باوجود اپنا کام نبھا جاتی تھی۔ عمر اور تجربے کے ساتھ ساتھ اب وہ بہت پختگی اختیار کر چکی ہے۔ اب اس کو عشق کی دوڑ

اور اسکول کی ایک میل کی دوڑ میں تھک کر ہانپنے کا فرق معلوم ہے۔ اب تو اس کو سانس کے ہلکے سے ہلکے زیر و بم کا نفسیاتی پس منظر بھی معلوم ہے۔

یہ بہت اچھا ہوا کہ اس نے اداکاری کی منازل آہستہ آہستہ طے کیں۔ اگر وہ ایک ہی جست میں آخری منزل پر پہنچ جاتی۔ تو اہلِ ذوق فلم بینوں کے صنّاعانہ جذبات کو بہت ہی گنوارہ قسم کا صدمہ پہنچتا۔ اور اگر لڑکپن کے زمانے میں پردے سے الگ زندگی میں بھی وہ ایکٹرس بنی رہتی اور اپنی عمر کو عیار بزازوں کے گز سے ماپ کر دکھاتی۔ تو میں اس صدمے کی تاب نہ لا کر یقیناً مر گیا ہوتا۔

نرگس ایسے گھرانے میں پیدا ہوئی تھی کہ اس کو لامحالہ ایکٹرس بننا ہی تھا۔۔۔ جدّن بائی کے گلے میں بڑھاپے کا گھنگرو بول رہا تھا۔ اس کے دو بیٹے تھے۔ مگر اُس کی ساری توجہ بے بی نرگس پر مرکوز تھی۔ اس کی شکل و صورت معمولی تھی۔ گلے میں سُر کی پیدائش کا بھی کوئی امکان نہیں تھا۔ مگر جدن بائی جانتی تھی کہ سُر مستعار لیا جا سکتا ہے اور معمولی شکل و صورت میں اندرونی روشنی سے جسے جوہر کہتے ہیں۔ دلکشی پیدا کی جا سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے جان مار کر اس کی پرورش کی۔ اور کانچ کے نہایت ہی نازک اور چھوٹے چھوٹے ذرّے جوڑ جوڑ کر اپنا درخشاں و تاباں خواب پُورا کیا۔

جدّن بائی تھی۔ اس کی ماں تھی ۔۔۔۔ موہن بابو تھا۔ بے بی نرگس تھی۔ اس کے دو بھائی تھے۔ اتنا بڑا کنبہ تھا جس کا بوجھ صرف جدن بائی کے کندھوں پر تھا۔۔۔

موہن بابو ایک بڑے رئیس زادہ تھے۔ جدن بائی کے گلے کی تانوں اور مرکیوں میں ایسے اُلجھے کہ دین دنیا کا ہوش نہ رہا۔ خوبصورت تھے۔ صاحبِ ثروت تھے۔ تعلیم یافتہ تھے۔ صحت مند تھے۔ مگر یہ سب دولتیں جدن بائی کے در پر مفلس اور گداگر بن گئیں۔ جدن بائی کے نام کا اُس زمانے میں ڈنکا بجتا تھا۔ بڑے بڑے نواب اور راجے اُس کے مجروں پر سونے اور چاندی کی بارش برساتے تھے۔ مگر جب بارشیں تھم جاتیں اور آسمان نکھر جاتا تو جدّن بائی اپنے موہن کو اٹھا کر سینے سے لگا لیتی کہ اسی موہن کے پاس اس کا من تھا۔

موہن بابو تا دمِ آخر جدّن بائی کے ساتھ تھے۔ وہ ان کی بہت عزّت کرتی تھی۔ اس لئے کہ وہ راجوں اور نوابوں کی دولت میں غریبوں کے خون کی بُو سونگھ چکی تھی۔ اس کو اچھی طرح معلوم تھا۔ کہ اُن کے عشق کا دھارا ایک ہی سمت نہیں بہتا۔ وہ موہن بابو سے محبّت کرتی تھی۔ کہ وہ اُس کے بچوں کا باپ تھا۔

خیالات کی رَو میں جانے کدھر بہہ گیا۔ نرگس کو بہر حال ایکٹرس بننا تھا۔ چنانچہ وہ بن گئی۔ اس کے بامِ عروج تک پہنچنے کا راز جہاں تک میں سمجھتا ہوں اُسی کا خلوص ہے جو قدم بہ قدم، منزل بہ منزل اس کے ساتھ رہا ہے۔

ایک بات جو اُن ملاقاتوں میں خاص طور پر میں نے محسوس کی وہ یہ ہے۔ کہ نرگس کو اس بات کا احساس تھا کہ جن لڑکیوں سے وہ ملتی ہے وہ جُدا قسم کے آب و گِل سے بنی ہیں۔ وہ اُن کے پاس آتی تھی۔ گھنٹوں ان سے معصوم معصوم

باتیں کرتی تھی۔ مگر وہ اُن کو اپنے گھر مدعو کرنے میں ایک عجیب قسم کی جھجک محسوس کرتی تھی۔ اس کو شاید یہ ڈر تھا کہ وہ اس کی دعوت ٹھکرا دیں گی۔ یہ کہیں گی کہ وہ اس کے یہاں کیسے جاسکتی ہیں۔ میں ایک دن گھر پر موجود تھا کہ اس نے سرسری طور پر اپنی سہیلیوں سے کہا "اب کبھی تم بھی ہمارے گھر آؤ۔"

یہ سن کر تینوں بہنوں نے بڑے ہی بھنڈے پن سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ وہ شاید یہ سوچ رہی تھیں، کہ ہم نرگس کی یہ دعوت کیسے قبول کرسکتی ہیں۔ لیکن میری بیوی چونکہ میرے خیالات سے واقف تھی۔ اس لئے ایک روز نرگس کے پیہم اصرار پر اُس کی دعوت قبول کر لی گئی۔ اور مجھے بتائے بغیر تینوں اُس کے گھر چلی گئیں۔

نرگس نے اپنی کار بھیج دی تھی۔ جب وہ بمبے کے خوبصورت ترین مقام میرین ڈرائیو کے اُس فلیٹ میں پہنچیں جہاں نرگس رہتی تھی۔ تو انھوں نے محسوس کیا کہ ان کی آمد پر خاص انتظامات کئے گئے تھے۔ موہن بابو اور اُس کے دونو جوان لڑکوں کو منع کر دیا گیا تھا کہ وہ گھر میں داخل نہ ہوں۔ کیونکہ نرگس کی سہیلیاں آرہی ہیں۔ مرد نوکروں کو بھی اس کمرے میں آنے کی اجازت نہیں تھی۔ جہاں ان "معزز" مہمانوں کو بٹھایا گیا تھا۔ خود جدّن بائی تھوڑی دیر کے لئے رسمی طور پر ان کے پاس بیٹھی اور اندر چلی گئی۔ وہ اُن کی معصوم گفتگوؤں میں حارج نہیں ہونا چاہتی تھی۔

تینوں بہنوں کا بیان ہے کہ نرگس اُن کی آمد پر پھولی نہ سماتی تھی۔ وہ اس قدر

خوش تھی کہ بار بار گھبراسی جاتی تھی۔ اپنی سہیلیوں کی خاطرداری میں اس نے بڑے جوش کا اظہار کیا۔ پاس ہی پیرژین ڈیری تھی۔ اس کے "ملک شیک" مشہور تھے۔ گاڑی میں جاکر نرگس خود یہ مشروب جگ میں تیار کرا کے لائی۔ کیونکہ وہ یہ کام نوکر کے سپرد کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس لئے کہ پھر اس کے اندر آنے کا احتمال تھا۔

خاطرداری کے اس جوش و خروش میں نرگس نے اپنے نیئے سیٹ کا گلاس توڑ دیا۔ مہمانوں نے افسوس کا اظہار کیا تو نرگس نے کہا۔ "کوئی بات نہیں بی بی غصّے ہوں گی مگر ڈیڈی ان کو چپ کرا دیں گے اور معاملہ رفع دفع ہو جائیگا۔"

موہن بابو کو اس سے اور اس کو موہن بابو سے بہت محبت تھی۔

"ملک شیک" پلانے کے بعد نرگس نے مہمانوں کو اپنا البم دکھایا جس میں اس کے مختلف فلموں کے اسٹِل تھے۔ اُس نرگس میں جو اُن کو یہ فوٹو دکھا رہی تھی۔ اور اُس نرگس میں جو ان تصویروں میں موجود تھی کتنا فرق تھا۔ تینوں بہنیں کبھی اس کی طرف دیکھتیں۔ اور کبھی البم کے اوراق کی طرف اور اپنی حیرت کا یوں اظہار کرتیں۔ "نرگس۔ تم یہ نرگس کیسے بن جاتی ہو۔"

نرگس جواب میں صرف مسکرا دیتی۔

میری بیوی نے مجھے بتایا کہ گھر میں نرگس کی ہر حرکت، ہر ادا میں الّھڑپن تھا۔ اُس میں وہ شوخی، وہ طراری، وہ تیکھا پن نہیں تھا جو اُس کے سراپا میں پردے پر نظر آتا ہے۔ وہ بڑی ہی گھریلو قسم کی لڑکی تھی۔ میں نے خود بھی محسوس

کیا تھا۔ لیکن جانے کیوں۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں مجھے ایک عجیب و غریب قسم کی اداسی تیرتی نظر آتی تھی۔ جیسے کوئی لاوارث لاش، تالاب کے ٹھیرے پانی پہ ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکوں سے ارتعاش پذیر ہے۔

یہ قطعی طور پہ طے تھا کہ شہرت کی جس منزل پہ نرگس کو پہنچنا تھا۔ وہ کچھ زیادہ دور نہیں۔ تقدیر اپنا فیصلہ اس کے حق میں کر کے تمام متعلقہ کاغذات اُس کے حوالے کر چکی تھی۔ لیکن پھر وہ کیوں مغموم تھی۔ کیا غیر شعوری طور پر وہ یہ محسوس تو نہیں کر رہی تھی۔ کہ عشق و محبّت کا یہ مصنوعی کھیل کھیلتے کھیلتے ایک دن وہ کسی ایسے لق و دق صحرا میں نکل جائے گی۔ جہاں سراب ہی سراب ہوں گے۔ پیاس سے اُس کا حلق سوکھ رہا ہو گا۔ اور آسمان پہ چھوٹی چھوٹی بدلیوں کے تھنوں میں صرف اس لئے دودھ نہیں اُترے گا کہ وہ یہ خیال کریں گی کہ نرگس کی پیاس محض بناوٹ ہے۔ زمین کی کوکھ میں پانی کی بوندیں اور زیادہ اندر کو سمٹ جائیں گی۔ اس خیال سے کہ اُس کی پیاس صرف ایک دکھاوا ہے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خود نرگس بھی یہ محسوس کرنے لگے کہ میری پیاس کہیں جھوٹی پیاس تو نہیں۔

اتنے برس گذر جانے پر میں اب اُسے پردے پہ دیکھتا ہوں۔ تو مجھے اُس کی اداسی کچھ مضمحل سی نظر آتی ہے۔ پہلے اُس میں ایک مستعد جستجو تھی۔ لیکن اب یہ جستجو بھی اداس اور مضمحل ہے۔ کیوں ــــ؟ اس کا جواب خود نرگس ہی

دے سکتی ہے۔

تینوں بہنیں چونکہ چوری چوری نرگس کے ہاں گئی تھیں۔ اس لئے وہ زیادہ دیر تک اس کے پاس نہ بیٹھ سکیں۔ چھوٹی دو کو یہ اندیشہ تھا کہ ایسا نہ ہو مجھے اس کا علم ہو جائے۔ چنانچہ انھوں نے نرگس سے رخصت چاہی۔ اور واپس گھر آگئیں۔ نرگس کے متعلق وہ جب بھی بات کرتیں۔ گھوم پھر کر اُس کی شادی کے مسئلے پر آجاتیں۔ چھوٹی دو کو یہ جاننے کی خواہش تھی کہ وہ کب اور کہاں شادی کرے گی۔ بڑی جس کی شادی ہوئے پانچ برس ہو چکے تھے۔ یہ سوچتی تھی کہ شادی کے بعد وہ ماں کیسی بنے گی۔

کچھ دیر تک میری بیوی نے نرگس سے اس خفیہ ملاقات کا حال چھپائے رکھا آخر ایک روز بتا دیا۔ میں نے مصنوعی خفگی کا اظہار کیا۔ تو اُس نے سچ سمجھتے ہوئے مجھ سے معافی مانگی اور کہا۔" واقعی ہم سے غلطی ہوئی۔ مگر خدا کے لئے اب آپ اس کا ذکر کسی سے نہ کیجئے گا۔"

وہ چاہتی تھی کہ بات مجھی تک رہے۔ ایک ایکٹرس کے گھر جانا تینوں بہنوں کے نزدیک بہت ہی معیوب بات تھی۔ وہ اس "حرکت" کو چھپانا چاہتی تھیں۔ چنانچہ جہاں تک مجھے معلوم ہے اس کا ذکر انھوں نے اپنی ماں سے بھی نہیں کیا تھا۔ حالانکہ وہ بالکل تنگ خیال نہیں تھیں۔

میں اب تک نہیں سمجھ سکا کہ ان کی وہ حرکت حرکتِ مذموم کیوں تھی۔ اگر

وہ نرگس کے ہاں گئی تھیں تو اس میں برائی ہی کیا تھی۔ اداکاری معیوب کیوں سمجھی جاتی ہے۔ کیا ہمارے اپنے خاندان کے حلقے میں ایسے افراد نہیں ہوتے جن کی ساری عمر فریب کاریوں اور ملمع کاریوں میں گذر جاتی ہے۔ نرگس نے تو اداکاری کو اپنا پیشہ بنایا تھا۔ اُس نے اس کو راز بنا کہ نہیں رکھا تھا۔ کتنا بڑا فریب جس میں یہ لوگ مبتلا رہتے ہیں۔

اس مضمون کے آغاز میں میں نے ایک خط کا کچھ حصّہ نقل کیا ہے جو مجھے تسنیم سلیم نے لکھا تھا۔ اب اس کی طرف لوٹتا ہوں۔ دراصل ساری بات ہی اسی سے چلی تھی۔

چونکہ مجھے نرگس کو اُس کے گھر میں ملنے کا اشتیاق تھا۔ اس لئے میں مصروف ہونے کے باوجود مسٹر سلیم اور اُن کے مصاحبوں کے ساتھ میرین ڈرائیو چل پڑا۔ چاہیئے تو یہ تھا۔ کہ میں فون کے ذریعے سے جدّن بائی کو اپنی آمد سے مطلع کر دیتا اور یہ بھی معلوم کر لیتا کہ نرگس فارغ بھی ہے یا نہیں۔ لیکن میں عام زندگی میں بھی چونکہ ایسے تکلفات کا قائل نہیں۔ اس لئے بغیر اطلاع دیئے وہاں جا دھمکا۔ جدن بائی باہر برآمدے میں بیٹھی سروتے سے چھالیا کاٹ رہی تھی۔ مجھے دیکھا تو باآواز بلند کہا۔ "اوہ منٹو ــــ آؤ۔ بھائی آؤ۔" پھر نرگس کو آواز دی۔ بے بی.... تمہاری سہیلیاں آئی ہیں۔"

میں نے قریب جا کر اُسے بتایا کہ میرے ساتھ سہیلیاں نہیں "سہیلے" ہیں

جب میں نے نواب چھتاری کے داماد کا ذکر کیا تو اُس کا لہجہ بدل گیا۔" بلا لو انھیں"۔ نرگس دوڑی دوڑی آئی۔ تو اُس سے کہا۔"تم اندر جاؤ بے بی۔ منٹو صاحب کے دوست آئے ہیں"۔

جدن بائی نے میرے دوستوں کی کچھ اس انداز سے آؤ بھگت کی۔ جیسے وہ مکان دیکھنے اور پسند کرنے آئے تھے۔ وہ بے تکلّفی جو میرے لئے مخصوص تھی۔ غائب ہو گئی۔ بیٹھو تشریف رکھیے میں تبدیل ہو گیا۔ کیا پیو گے۔ کیا نوش فرمائیے گا بن گیا۔ تم آپ ہو گیا۔ اور میں خود کو چغد محسوس کرنے لگا۔

میں نے اپنی اور اپنے دوستوں کی آمد کا مدّعا بیان کیا۔ تو جدّن بائی نے بڑے ہی پُرتصنع انداز میں مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے میرے ساتھیوں سے کہا۔" بے بی سے ملنا چاہتے ہیں،...... کیا بتاؤں کئی دنوں سے غریب کی طبیعت ناساز ہے۔ دن رات کی شوٹنگ نے اُسے بے حد مضمحل کر دیا ہے۔ بہت منع کرتی ہوں۔ کہ ایک روز آرام کر لو۔ مگر شوق ایسا ہے کہ نہیں سنتی۔ محبوب نے بھی کہا کہ بیٹا کوئی حرج نہیں۔ تم ریسٹ کر لو۔ میں شوٹنگ بند کر دیتا ہوں۔ مگر نہ مانی...... آج میں نے زبردستی روک لیا...... زکام سے نڈھال ہو رہی ہے غریب!"

یہ سن کر میرے دوستوں کو ظاہر ہے۔ بہت مایوسی ہوئی۔ نرگس کی ایک جھلک وہ ٹیکسی میں بیٹھے بیٹھے دیکھ چکے تھے۔ اور اُس کو مفصل طور پر دیکھنے کے لئے بے تاب تھے۔ جب اُن کو معلوم ہوا۔ کہ اُس کی طبیعت ناساز ہے تو انھیں بڑی

کوفت ہوئی۔ جدّن بائی اِدھر اُدھر کی باتیں کئے جاتی تھی۔ جن سے ان کو کوئی دلچسپی نہ تھی۔ میں صاف دیکھ رہا تھا کہ وہ تھوڑی دیر کے بعد جمائیاں لینے لگیں گے اور مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ نرگس کی ناسازیٔ طبیعت کا بہانہ محض رسمی ہے۔ چنانچہ میں نے جدّن بائی سے کہا۔ "بے بی کو زحمت تو ہو گی۔ مگر یہ اتنی دور سے آئے ہیں۔ ذرا بلا لیجئے۔"

اندر تین چار مرتبہ کہلوانے کے بعد نرگس آئی۔ سب نے اُٹھ کر تعظیماً اُسے سلام کیا۔ میں بیٹھا رہا۔ نرگس کا داخلہ فلمی تھا۔ اُس کا سلام کا جواب دینا فلمی تھا۔ اُس کا بیٹھنا اُٹھنا فلمی تھا۔ اُس کی گفتگو فلمی تھی۔ جیسے سیٹ پر مکالمے بول رہی ہو۔ اور میرے ساتھیوں کے سوال جواب بڑے ہی توّابانہ قسم کے اوٹ پٹانگ تھے۔

"آپ سے مل کر بڑی مسرّت ہوئی۔"

"جی ہاں آج ہی بمبئے پہنچے ہیں۔"

"کل پرسوں واپس چلے جائیں گے۔"

"آپ ماشاء اللہ اس وقت ہندوستان کی چوٹی کی اداکارہ ہیں۔"

"آپ کے ہر فلم کا ہم نے پہلا شو دیکھا ہے۔"

"یہ تصویر جو آپ نے دی ہے میں اسے اپنے البم میں لگاؤں گا۔"

اس دوران میں موہن بابو بھی آ گئے۔ مگر وہ خاموش بیٹھے رہے۔ کبھی کبھی اپنی بڑی بڑی خوبصورت آنکھیں گھما کر ہم سب کو دیکھ لیتے۔ اور پھر خدا جانے کس سوچ

میں غرق ہو جاتے۔

سب سے زیادہ باتیں جدّن بائی نے کیں۔ ان میں اس نے ملاقاتیوں پر بڑے واضح الفاظ میں ظاہر کر دیا کہ وہ ہندوستان کے ہر راجے اور ہر نواب کو اندر باہر سے اچھی طرح جانتی ہے۔ نرگس نے جتنی باتیں کیں بہت مختصر اور بناوٹ سے بھرپور تھیں اس کی ہر حرکت اور ہر ادا سے یہ صاف مترشح تھا کہ وہ اپنے ملنے والوں کو یہ چیزیں پلیٹ میں ڈال کر بڑے تکلّف سے پیش کر رہی ہے۔ تاکہ وہ اس کا شکریہ ادا کریں۔ وہ دلی طور پر ممنون و متشکر تھے۔ مگر اس امتنان و تشکر سے نرگس متشفی نہیں تھی۔ وہ غالباً جواب میں تصنّع ہی کی طالب تھی۔

یہ ملاقات کچھ بہت ہی پھیکی رہی میرے لیے بھی اور میرے ساتھیوں کے لیے بھی۔ میری موجودگی میں وہ کھل کر احمقانہ باتیں نہیں کر سکتے تھے اور میں ان کی موجودگی کے باعث بہت ہی تکلیف دہ گھٹن محسوس کر رہا تھا۔ بہرحال نرگس کا دوسرا رنگ دیکھنا دلچسپی سے خالی نہیں تھا۔

سلیم اپنے دوستوں کے ساتھ دوسرے روز پھر نرگس کے ہاں گئے۔ اس کی اطلاع انھوں نے مجھے نہ دی۔ میرا خیال ہے اس ملاقات کا رنگ کچھ اور ہی ہو گا۔ نخشب کے ساتھ جس جنگ کا ذکر تسنیم نے اپنے خط میں کیا ہے وہ مجھے بالکل یاد نہیں۔ ہو سکتا ہے۔ کہ وہ اُس وقت وہاں موجود نہ ہوں۔ کیونکہ جدّن بائی کو شعر و شاعری سے بڑی دلچسپی تھی اور بمبے کے اکثر شعرا اپنا کلام سنانے کیلئے

وہاں جایا کرتے تھے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نخشب سے ان کی شاعری ہی پر اختلاف رائے کے باعث ہلکی سی چپقلش ہو گئی ہو۔

نرگس کا ایک اور دلچسپ رنگ میں نے اس وقت دیکھا جب اشوک میرے ساتھ تھا۔ جدّن بائی کوئی اپنا ذاتی فلم تیار کرنے کا ارادہ کر رہی تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ اشوک اس کا ہیرو ہو۔ اشوک حسبِ عادت اکیلا جانے سے گھبراتا تھا چنانچہ وہ مجھے اپنے ساتھ لے گیا۔

دورانِ گفتگو میں کئی نکتے تھے۔ کاروباری نکتے، دوستانہ نکتے۔ خوشامدی نکتے یہ نکتے بڑے ہی دلچسپ طریقے پر آپس میں گڈمڈ ہوتے رہے۔ جدّن بائی کا انداز کبھی بزرگانہ ہوتا تھا اور کبھی ہم عصرانہ۔ وہ کبھی پروڈیوسر بن جاتی تھی اور کبھی نرگس کی ماں۔ ایسی ماں جو اپنی بیٹی کی قدر و قیمت بڑھانا چاہتی ہے۔ موہن بابو سے کبھی کبھی ہاں میں ہاں ملا لی جاتی تھی۔

لاکھوں روپے کا ذکر آیا۔ وہ جو خرچ ہو چکے تھے۔ خرچ ہونے والے تھے۔ اور جو خرچ کیے جا سکتے تھے۔ سب کا حساب انگلیوں پر گنوایا گیا۔ نرگس کا یہ انداز تھا کہ دیکھو اشوک، مانتی ہوں کہ تم منجھے ہوئے ایکٹر ہو۔ تمہاری دھاک بیٹھی ہوئی ہے۔ مگر میں بھی کسی طرح کم نہیں۔ تم مان جاؤ گے کہ میں اداکاری کے میدان میں تمہارا مقابلہ کر سکتی ہوں۔ چنانچہ اس کی تمام کوششیں اس نقطے پر مرکوز تھیں۔ اس کے علاوہ کبھی کبھی اس کے اندر عورت بھی بیدار ہو جاتی تھی۔ اس وقت

وہ اشوک سے یہ کہتی معلوم ہوتی۔ "تم پہ ہزاروں لڑکیاں فریفتہ ہیں۔ لیکن میں اسے کیا سمجھتی ہوں۔ میرے بھی ہزاروں چاہنے والے موجود ہیں۔ یقین نہ آئے تو کسی مرد سے پوچھ لو۔" اور ساتھ ہی ساتھ اس چیلنج کی ہلکی سی جھلک بھی ہوتی۔ "ہو سکتا ہے تم ہی مجھ پہ مرنا شروع کر دو۔"

اور جدّن بائی کبھی مصالحت کی طرف جھک جاتی کہ نہیں، اشوک تم اور بے بی دونوں پہ دنیا مرتی ہے۔ اسی لئے تو میں چاہتی ہوں کہ تمھیں ایک ساتھ پیش کروں تاکہ ایک قتلِ عام ہو اور ہم سب خوب فائدہ اٹھائیں۔ کبھی کبھی وہ ایک اور انداز اختیار کر لیتی اور مجھ سے مخاطب ہوتی۔

"منٹو، اشوک اتنا بڑا ایکٹر بن گیا ہے۔ لیکن خدا کی قسم بہت ہی نیک آدمی ہے بڑا کم گو بڑا ہی شرمیلا —— خدا عمر دراز کرے۔ میں جو فلم شروع کر رہی ہوں، اس میں اشوک لئے خاص طور پر میں نے کیریکٹر لکھوایا ہے۔ تم سنو گے تو خوش ہو جاؤ گے۔"

میں یہ کیریکٹر سنے بغیر ہی خوش تھا۔ اس لئے کہ جدّن بائی کا کیریکٹر خود بہت ہی دلچسپ تھا۔ اور نرگس جو رول ادا کر رہی تھی وہ تو اور بھی زیادہ دلچسپ تھا میرا خیال ہے اگر پردے پر وہ حالات پیش کیے جاتے اور اس سے کہا جاتا کہ اشوک سے مل کر تمھیں ایسی گفتگو کرنا ہے تو وہ کبھی اتنی کامیاب نہ ہوتی جتنی کہ وہ اس وقت تھی۔

باتوں باتوں میں ثریا کا ذکر آیا تو جدّن بائی نے ناک بھوں چڑھا کر اس میں اور اس کے سارے خاندان میں کیڑے ڈالنے شروع کر دیئے۔ ثریا کی عیب جوئی وہ ایک فرض کے طور پہ کرتی تھی۔ اس کا گلا خراب ہے — بے سُری ہے بے اُستادی ہے۔ دانت بڑے واہیات ہیں۔ اُدھر ثریا کے ہاں جاؤ تو نرگس اور جدّن بائی پہ عملِ جراحی شروع ہو جاتا تھا۔ ثریا کی نانی جو حقیقت میں اس کی ماں تھی حقّے کے لقّے اڑا اڑا کر دونوں کو خوب کوستی تھی۔ نرگس کا ذکر آتا تو وہ بُرا سا منھ بنا کر میراثنوں کے انداز میں جگت کرتی۔ منھ دیکھو جیسے گلا سڑا پپیتا ہوتا ہے۔

موہن بابو کی خوبصورت اور بڑی بڑی آنکھیں ہمیشہ کے لیے مندہ چکی ہیں۔ جدّن اپنے دل کی بقایا حسرتیں اور تمنّائیں لیے منوں مٹّی کے نیچے دفن ہے۔ اس کی بے بی، نرگس تصنع اور بناوٹ کے آخری زینے پہ پہنچ کر معلوم نہیں اور اوپر دیکھ رہی ہے یا اس کی اداس اداس آنکھیں نیچے سب سے پہلے زینے کو دیکھ رہی ہیں۔ جب اس نے گھٹنیوں چلنا سیکھا تھا۔ وہ خیرہ کن روشنی میں تاریک ترین سائے کی تلاش میں ہے۔ یا تاریک ترین سائے میں روشنی کی ننھی سی کرن ٹٹول رہی ہے؟ — روشنی اور سائے کا تانا بانا ہی زندگی ہے۔ اور اس تانے بانے کی عکّاسی فلمی زندگی جس میں کبھی ایسا پیچ، ایسا خم بھی آجاتا ہے جب روشنی روشنی رہتی ہے نہ سایہ سایہ!

کشتِ زعفران

"لائٹس اون ـــ فین اوف ـــ کیمرہ ریڈی ـــ سٹارٹ مسٹر جگتاپ۔!"

"سٹارٹڈ"

"سین تھرٹی فور ـــ ٹیک ٹن۔"

"نیلا دیوی آپ کچھ فکر نہ کیجئے۔ میں نے بھی پشاور کا پیشاب پیا ہے!"

"کٹ کٹ"

لائٹس اون ہوئیں۔ وی ایچ ڈیسائی نے رائفل ایک طرف رکھتے ہوئے بڑے اطمینان سے اشوک سے پوچھا۔ "او کے مسٹر گنگولی؟"

اشوک نے جو جل بھن کر راکھ ہونے کے قریب تھا قہر آلود نگاہوں سے خلا میں دیکھا اور زہر کے چند بڑے بڑے گھونٹ جلدی جلدی پی کر چہرے

پر مصنوعی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے ڈیسائی سے کہا۔ "ونڈر فل ——" پھر اُس نے معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھا۔ "کیوں منٹو؟"

میں نے ڈیسائی کو گلے لگا لیا۔ "وُنڈر فل"

ہمارے چاروں طرف لوگ اپنی اپنی ہنسی کا بہت بُری طرح گلا گھونٹ رہے تھے۔ ڈیسائی بہت خوش تھا۔ چوں کہ اُس نے بہت دیر کے بعد میرے منھ سے اپنی اس قدر پُر جوش تعریف سنی تھی۔ دراصل اشوک نے کچھ عرصہ پہلے مجھے منع کر دیا تھا کہ میں اپنی جھنجھلاہٹ کا اظہار ہرگز نہ کروں۔ کیوں کہ اُسے اندیشہ تھا کہ ڈیسائی بوکھلا جائے گا اور سارا دن غارت کر دے گا۔

جب چند لمحات گذر گئے تو ڈیسائی نے مکالمہ آموز ڈکشٹ سے کہا۔ "ڈکشٹ صاحب نکسٹ ڈائلاگ؟"

یہ سن کر اشوک جو کہ "آٹھ دن" نامی فلم ڈائرکٹ کر رہا تھا، مجھ سے مخاطب ہُوا۔ "منٹو، میرا خیال ہے پہلا ڈائلاگ ایک دفعہ اور لے لیں۔"

میں نے ڈیسائی کی طرف دیکھا۔ "کیوں ڈیسائی صاحب؟ —— میرا خیال ہے اس دفعہ اور بھی ونڈر فل ہو جائے۔"

ڈیسائی نے گجراتی انداز میں اپنا سر ہلایا۔ "ہو —— تو لے لو ابھی۔ گرما گرم معاملہ ہے۔"

دتّا رام چلّایا۔ "لائٹس اون۔"

لائٹس روشن ہوئیں۔ ڈیسائی نے رائفل سنبھالی۔

ڈکشٹ جھٹ سے ڈیسائی کی طرف لپکا اور مکالموں کی کتاب کھول کر کہنے لگا۔ "مسٹر ڈیسائی۔ ذرا وہ ڈائلاگ یاد کر لیجیے۔"

ڈیسائی نے پوچھا۔ "کون سا ڈائلاگ؟"

ڈکشٹ نے کہا۔ "وہی جو آپ نے اَنّا وَنڈر فل بولا تھا۔ ذرا اُسے دُہرا دیجیے۔"

ڈیسائی نے رائفل کندھے پر جماتے ہوئے بڑے سنگین اعتماد سے کہا "مجھے یاد ہے۔"

ڈکشٹ نے مجھے اشارہ کیا۔ "منٹو صاحب ذرا آپ سُن لیجیے۔"

میں نے ڈیسائی کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور بڑے غیر سنجیدہ لہجے میں کہا "ہاں، تو وہ کیا ہے ڈیسائی صاحب —— نیلا دیوی، آپ کوئی فکر نہ کیجیے۔ میں نے بھی پشاور کا پانی پیا ہے۔"

ڈیسائی نے اپنے سر پر پشاوری لنگی کا زاویہ درست کیا، اور ویرا (فلم میں نیلا دیوی) سے مخاطب ہو کر کہا۔ "نیلا دیوی، آپ کوئی پشاور نہ کیجیے۔ میں نے بھی آپ کا پانی پیا ہے۔"

ویرا اس قدر بے تحاشا ہنسی کہ ڈیسائی ڈر گیا۔ "کیا ہوا مس ویرا؟"

ویرا ساڑھی کے آنچل میں ہنسی دباتی سیٹ سے باہر چلی گئی۔ ڈیسائی نے

تشویش ظاہر کرتے ہوئے ڈکشٹ سے پوچھا۔ "کیا بات تھی؟"
ڈکشٹ نے اپنا ہنسی سے اُبلتا ہوا منھ دوسری طرف کر لیا۔ میں نے ڈیسائی کی پریشانی دور کرنے کے لیے کہا۔ "نتھنگ سیریس — کھانسی آگئی۔"
ڈیسائی ہنسا۔ "اوہ" پھر وہ مستعد ہو کر اپنے مکالمے کی طرف متوجہ ہوا۔ "نیلا دیوی آپ کوئی کھانسی نہ کیجیے۔ میں نے بھی دیوی کا......"
اشوک اپنے سر کو مکّے مارنے لگا۔ ڈیسائی نے دیکھا تو متفکر ہو کر اُس سے پوچھا۔ "کیا بات ہے مسٹر گنگولی۔"
گنگولی نے ایک زور کا مکّا اپنے سر پر مارا۔ "کچھ نہیں۔ سر میں درد تھا۔ — تو ہو جائے ٹیک؟"
ڈیسائی نے اپنا کدّو سا سر ہلایا۔ "ہو!"
گنگولی نے مردہ آواز میں کہا۔ "کیمرہ ریڈی — ریڈی مسٹر جگتاپ؟"
بھونپو سے جگتاپ کی منمناہٹ سنائی دی — "ریڈی!"
گنگولی نے اور زیادہ مردہ آواز میں کہا —
"سٹارٹ۔"
کیمرہ اسٹارٹ ہوا۔ کلیپ اسٹک ہوئی۔
"سین تھرٹی فور — ٹیک الیون!"
ڈیسائی نے رائفل لہرائی اور ویرا سے کہنا شروع کیا۔ "نیلا پانی۔ آپ

کوئی دیوی نہ کیجئے ۔میں نے بھی پشاور کا.....''

اشوک دیوانہ وار چلّایا۔''کٹ کٹ''

ڈیسائی نے رائفل فرش پر رکھی۔اور گھبرا کر اشوک سے پوچھا۔''اپنی مسٹیک مسٹر گنگولی؟''

اشوک نے ڈیسائی کی طرف قاتلانہ نگاہوں سے دیکھا۔مگر فوراً ان میں بھیڑوں کی سی نرمی اور معصومیت پیدا کرتے ہوئے کہا۔''کوئی نہیں ـــــ بہت اچھا تھا ـــــ بہت ہی اچھا۔'' پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔''آؤ منٹو، ذرا باہر چلیں!''

سیٹ سے باہر نکل کر اشوک قریب قریب رو دیا۔''منٹو، بتاؤ، اب کیا کیا جائے صبح سے یہ وقت ہو گیا ہے۔پشاور کا پانی اُس کے منہ پر چڑھتا ہی نہیں ـــــ میرا خیال ہے لنچ کے لئے بریک کر دیں۔''

بڑا معقول خیال تھا۔کیوں کہ ڈیسائی سے یہ فوری توقع بالکل فضول تھی کہ وہ صحیح مکالمہ بول سکے گا۔ایک دفعہ اگر اس کی زبان پر کوئی چیز جم جائے تو بڑی مشکل سے ہٹتی تھی۔اصل میں اُس کا حافظہ بالکل صفر تھا۔اُسے چھوٹے سے چھوٹا مکالمہ بھی یاد نہیں رہتا تھا۔اگر سیٹ پر وہ پہلی بار کوئی مکالمہ صحت کے ساتھ ادا کر جاتا تو اُسے محض اتفاق سمجھا جاتا تھا۔مگر لطف یہ ہے کہ غلط ادائگی کے باوجود ڈیسائی کو قطعاً اس بات کا احساس نہیں ہوتا تھا کہ اُس نے مکالمے کو کس حد تک ـــــ کس رُلا دینے والی حد تک مسخ کیا ہے۔

مکالمے کی ٹانگ توڑ کر اُس کو مکمل طور پہ اپاہج کر کے وہ عام طور پہ حاضرین کی طرف داد طلب نگاہوں سے دیکھا کرتا تھا۔ اُس کی ایک دو لڑکھڑاہٹیں یقیناً تفریح کا موجب ہوتی تھیں۔ مگر جب وہ حد سے تجاوز کر جاتا تو سب کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی کہ اُس کے سر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے جائیں۔

میں فلمستان میں تین برس رہا۔ اس دوران میں ڈیسائی نے چار فلموں میں حصّہ لیا مجھے یاد نہیں کہ اُس نے ایک مرتبہ بھی پہلے ہی مرحلے میں اپنا مکالمہ صحت سے ادا کیا ہو، اگر حساب لگایا جائے تو آنجہانی نے اپنی فلمی زندگی میں لاکھوں فٹ فلم ضائع کیا ہو گا۔

اشوک نے مجھے بتایا کہ ڈیسائی کی ری ٹیکس، کا ریکارڈ چھہتّر ہے۔ یعنی بمبے ٹاکیز میں اُس نے ایک بار ایک مکالمے کو چھہتّر مرتبہ غلط ادا کیا۔ یہ صرف جرمن ڈائرکٹر فرانز اوسٹن ہی کا حوصلہ تھا کہ وہ بہت دیر تک ضبط کیے رہا۔ آخر اُس کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا۔ سر پیٹ کر اُس نے ڈیسائی سے کہا۔ "مسٹر ڈیسائی مصیبت یہ ہے کہ لوگ تمھیں پسند کرتے ہیں۔ تمھیں پردے پر دیکھتے ہی ہنسنا شروع کر دیتے ہیں۔ ورنہ آج میں نے تمھیں ضرور اُٹھا کر باہر پھینک دیا ہوتا۔"

اور فرانز اوسٹن کی اس صاف گوئی کا نتیجہ یہ ہوا کہ چھہتّر ری ٹیک ہوئے اور اسٹڈیو کے ہر کارکن کو باری باری ڈیسائی کو دم دلاسا دینے کا فرض ادا کرنا پڑا، لیکن کوئی حیلہ کارگر نہیں ہوتا تھا۔ وہ ایک بار اُکھڑ جائے تو کوئی دوا یا دعا

با اثر ثابت نہیں ہوتی۔ ایسے وقتوں میں چناں چہ یہی مناسب خیال کیا جاتا تھا کہ نتیجہ خدا کے ہاتھ سونپ کر دھڑا دھڑ فلم ضائع کیا جائے۔ جب اُس کی اور ڈیسائی کی مرضی بیک وقت شاملِ حال ہو جائے تو سجدۂ شکرانہ ادا کرے۔

اشوک نے لنچ کے لئے بریک کر دیا۔ جیسا کہ عام دستور تھا۔ کسی نے ڈیسائی سے مکالمے کے بارے میں گفت گو نہ کی۔ تاکہ جو کچھ ہو چکا ہے۔ اُس کی یاد تازہ نہ ہو۔ اشوک اِدھر اُدھر کی گپیں سناتا رہا۔ ڈیسائی نے حسبِ معمول اپنی طرف سے مزاح انگیز باتیں کیں۔ جن میں ذرّہ برابر مزاح نہیں تھا، لیکن سب ہنستے رہے۔

لنچ ختم ہُوا، شوٹنگ پھر شروع ہوئی۔ اشوک نے اُس سے پوچھا۔ "کیوں ڈیسائی صاحب، آپ کو ڈائلاگ یاد ہے؟"

ڈیسائی نے بڑے وثوق کے ساتھ کہا ـــ "جی ہوا!"

لائٹس اون ہوئیں۔ سین تھرٹی فور، ٹیک ٹو شروع ہوُا۔ ڈیسائی نے رائفل لہرا کر ڈیرا سے کہا۔ "نیلا دیوی..... آپ ـــ آپ" اور ایک دم رُک گیا۔ "آئی ایم سوری۔"

اشوک کا دل بیٹھ گیا۔ لیکن اُس نے ڈیسائی کا دل رکھنے کے لئے کہا "کوئی بات نہیں ـــ جلدی کیجیے۔"

"سین تھرٹی فور، ٹیک تھرٹین،" شروع ہُوا۔ مگر ڈیسائی نے پیشاور سے پیشاب کو الگ نہ کیا۔ جب چند اور کوششیں بھی بار آور نہ ہوئیں، تو میں نے الگ لیجا کر

اشوک کو یہ مشورہ دیا "دادا منی، دیکھو یوں کرو ــــ جب ڈیسائی یہ مکالمہ ادا کرتا ہے تو وہ کیمرے کی طرف پیٹھ کرتے ہوئے اُس کا بقایا حصّہ ادا کرے۔ یعنی پُشاور کا پیشاب پیا ہے۔ کیمرے کے سامنے منھ کر کے نہ بولے۔"

اشوک سمجھ گیا کیوں کہ اس مشکل سے نکلنے کی ایک صرف یہی ترکیب تھی۔ کیوں کہ ہم بڑی آسانی سے یہ مکالمہ بعد میں "ڈب" کر سکتے تھے۔ اگر وہ سارا مکالمہ کیمرے کے سامنے منھ کر کے ادا کرتا تو اُس کے ہونٹوں کی جنبش صحیح مکالمے کے ساتھ چسپاں نہ ہو سکتی۔

جب ڈیسائی کو یہ ترکیب سمجھائی گئی تو اُسے بہت ٹھیس پہنچی۔ اُس نے ہم سب کو یقین دلانے کی ہر ممکن کوشش کی وہ اب غلطی نہیں کرے گا۔ مگر پانی سر سے گزر چکا تھا ــــ اور وہ بھی پشاور کا، اس لئے اُس کی منّت سماجت بالکل نہ سنی گئی، بلکہ اُس سے کہہ دیا گیا کہ وہ جو اُس کے دل میں آئے بول دے۔

ڈیسائی بہت بد دل ہوا، لیکن اُس نے مجھ سے کہا۔ "کوئی بات نہیں منٹو۔ میں منھ دوسری طرف موڑ لوں گا۔ لیکن آپ دیکھئے گا کہ میں ڈائلاگ بالکل کورکٹ بولوں گا۔"

"سین تھرٹی فور ــــ ٹیک فورٹین" کی آواز آئی۔ ڈیسائی نے بڑے عزم کے ساتھ رائفل ہوا میں لہرائی اور دیرا سے مخاطب ہو کر کہا۔ "نیلا دیوی آپ کوئی فکر نہ کیجئے۔" یہ کہہ کر وہ "مڑا" میں نے بھی پشاور کا پیشاب پیا ہے۔"

سین کٹ ہوا۔ ڈیسائی نے فتح مندانہ انداز میں رائفل کندھے پر رکھی - اور اشوک سے پوچھا۔ "کیوں مسٹر گنگولی ؟ " اشوک اب بالکل سنگ دل بن چکا تھا۔ اُس نے بڑے روکھے انداز میں کہا۔ "ٹھیک ہے ٹھیک ہے ——" پھر وہ کیمرہ مین مہردیپ سے مخاطب ہوا۔ "چلو نیکسٹ شوٹ !"

شوٹنگ ختم ہوئی، مجھے اپنے ایک دوست کے ساتھ چرچ گیٹ جانا تھا اس لئے ہم جلدی جلدی اسٹیشن پہنچے۔ گاڑی کھڑی تھی۔ ہم ایک ڈبے میں بیٹھ گئے کیا دیکھتے ہیں کہ ڈیسائی صاحب بھی براجمان ہیں اور مسافروں کو اپنے کارنامے سنا رہے ہیں —— میرا دوست جو اُس دن کی شوٹنگ دیکھ چکا تھا۔ ڈیسائی کے پاس بیٹھ گیا۔ دورانِ گفتگو میں اُس نے ایک بڑا بے ڈھب سا سوال کیا۔

"سیٹ پر جو لوگ ڈائلاگ بھول جاتے ہیں۔ اُس کا کیا علاج کیا جاتا ہے؟"

ڈیسائی نے جواب دیا۔ "معلوم نہیں۔ میں تو ایک دفعہ بھی نہیں بھولا۔"

اُس کا یہ جواب بے حد معصوم تھا، جیسے وہ ڈائلاگ بھول جانے کے مرض سے قطعاً ناآشنا ہے —— میرا خیال ہے کہ خود اُس کو اس کا کامل یقین تھا کہ اُس سے کوئی غلطی سرزد نہیں ہوتی۔ اور یہ درست تھا، اس لئے کہ غلطی کا احساس تو صرف اُسی صورت میں پیدا ہو سکتا ہے۔ اگر صحت کے متعلق ہلکا سا تصوّر انسان کے دماغ میں موجود ہو۔ ڈیسائی مرحوم کے دماغ میں کوئی ایسا خانہ ہی نہیں تھا جو غلط اور صحیح میں تمیز کر سکے، وہ اِس سے بالکل بے نیاز تھا، معصومیت کی حد تک

وہ لوگ جو یہ سمجھتے ہیں کہ وہ بہت بڑا مزاح کار تھا یکسر غلط ہے۔ وہ جو یہ سمجھتے ہیں کہ وہ بہت بڑا اکرداہ کار تھا۔ قطعاً نادرست ہے۔ ایسا گناہ آنجہانی سے کبھی سرزد نہیں ہوا، لوگ اگر اُس کی حرکات پر ہنس ہنس کے دوہرے ہوتے تھے۔ تو اُس کا باعث قدرت کی چھیڑ خانی تھی۔ خداوند تعالیٰ نے اُس کی تخلیق ہی ایسے آب و گل سے کی تھی، جس میں زعفران گندھی ہو۔

ایک دفعہ ریس کورس پر میں نے دور سے اُس کی طرف اشارہ کیا۔ اور اپنی بیوی سے کہا۔ "وہ ڈیسائی ہے ۔ وہ!"

میری بیوی نے اُس جانب دیکھا اور بے اختیار ہنسنا شروع کر دیا۔ میں نے اُس سے پوچھا۔ "اتنی دُور سے دیکھنے پر اس قدر بے تحاشا ہنسنے کی وجہ کیا ہے؟"

وہ میرے سوال کا اطمینان بخش جواب نہ دے سکی۔ صرف یہ کہہ کر وہ اور زیادہ ہنسنے لگی۔ "معلوم نہیں!"

آنجہانی کو ریس کا بہت شوق تھا، اپنی بیوی اور لڑکی کو ساتھ لاتا تھا۔ مگر دس روپے سے زیادہ کبھی نہیں کھیلتا تھا۔ اُس کے بیان کے مطابق کئی جو کی اُس کے بہت ہی قریبی دوست تھے جو اُس کو سولہ آنے کھری ٹپ دیتے تھے۔ یہ ٹپ وہ اکثر دوسروں کو دیتا تھا۔ اس درخواست کے ساتھ کہ وہ اسے اپنے تک رکھیں اور کسی اور کو نہ بتائیں۔ خود وہ کسی اور کی دی ہوئی ٹپ پر کھیلتا تھا۔

ریس کورس پر جب میں نے اُس کو اپنی بیوی سے متعارف کرایا تو اس نے ایک "شیور" یعنی یقینی ٹپ دی۔ جب وہ نہ آئی تو اُس نے میری بیوی سے پُر تعجب لہجے میں کہا۔ "حد ہوگئی ہے ـــ یہ ٹپ تو آنا ہی مانگتی تھی۔" اُس نے خود ایک دوسرے نمبر کا گھوڑا کھیلا تھا جو ہلیس آگیا تھا۔ اِس پر اُس نے کسی قسم کے تعجب کا اظہار نہیں کیا تھا۔

ڈیسائی آنجہانی کی اوائلی زندگی کے متعلق لوگوں کی معلومات بہت محدود ہیں۔ خود میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ وہ گجرات کے ایک متوسّط گھرانے کا فرد تھا بی۔ اے کرنے کے بعد اُس نے ایل، ایل، بی کیا۔ چھ سات برس تک بمبے کی چھوٹی عدالتوں کی خاک چھانتا رہا۔ اُس کی پریکٹس معمولی تھی۔ لیکن اس کا گھر بار چلانے کے لئے کافی تھی۔ لیکن جب وہ دماغی عارضے میں گرفتار ہوا تو اُس کی مالی حالت بہت پتلی ہوگئی۔ ایک عرصے تک نیم پاگل رہا۔ علاج معالجے سے یہ عارضہ دور تو ہوگیا۔ مگر ڈاکٹروں نے دماغی کام کرنے سے منع کر دیا۔ کیونکہ خطرہ تھا کہ مرض پھر عود نہ کر آئے ـــ اب ڈیسائی غریب کے لئے بڑی مشکل تھی کہ وہ کرے تو کیا کرے۔ وکالت ظاہر ہے کہ یکسر دماغی کام تھا۔ اس لئے ادھر رجوع کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کچھ عرصے تک وہ اِدھر اُدھر ہاتھ پاؤں مارتا رہا۔ تجارت سے اُسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ حالانکہ اُس کی رگوں میں ٹھیٹ گجراتی خون تھا۔

جب حالات بہت نازک ہو گئے تو وہ ساگر مووی ٹون کے چمن لال ڈیسائی سے ملا اور خواہش ظاہر کی کہ اُسے اسٹوڈیو میں کام مل جائے۔ اصل میں اُس کا مقصد یہ تھا کہ اُسے ایکٹنگ کا موقع دیا جائے۔ چمن لال گجراتی اور ڈیسائی تھا اُس نے وی، ایچ کو ملازم رکھ لیا۔ اُس کے کہنے پر چند ڈائرکٹروں نے آزمائش کے طور پر مختلف فلموں میں تھوڑا تھوڑا کام دیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ اُس کو پھر آزمانا بہت بڑی خطا ہے۔ چنانچہ وہ کچھ عرصے کے لئے بیکار ساگر مووی ٹون میں پڑا روٹیاں توڑتا رہا۔

اس دوران میں مسٹر ہمانسو رائے بمبے ٹاکیز قائم کر چکے تھے۔ جس کے متعدد فلم کامیاب بھی ہو چکے تھے۔ اس ادارے کے متعلق مشہور تھا کہ تعلیم یافتہ لوگوں کی قدر کرتا ہے۔ یہ درست بھی تھا۔ چنانچہ ڈیسائی قسمت آزمائی کے لئے وہاں پہنچا۔ دو تین چکر لگانے اور مختلف سفارشی خطوط حاصل کرنے کے بعد مسٹر ہمانسو رائے سے ملا ـــــ ہمانسو رائے نے اس کی شکل وصورت اور اس کی تمام کمزوریوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایک خاص کردار وضع کیا اور ہندوستانی اسکرین کو ایک ایسا ایکٹر بخشا جو ایکٹنگ سے بالکل ناآشنا تھا۔ پہلے ہی فلم میں وی، ایچ ڈیسائی فلم بینوں کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ بمبے ٹاکیز کے عملے کو شوٹنگ کے دوران میں جو مشکلات پیش آئیں۔ وہ بیان سے باہر ہیں۔ سب کی قوتِ برداشت جواب دے دے جاتی تھی۔ مگر وہ اپنے تجربے

میں ڈٹے رہے آخر کامیاب رہے۔ اس فلم کے بعد ڈیسائی بمبے ٹاکیز کے فلموں کا جزوِ لاینفک بن گیا، اُس کے بغیر بمبے ٹاکیز کا فلم غیر مکمل اور روکھا پھیکا سمجھا جاتا تھا۔

ڈیسائی اپنی کامیابی پہ خوش تھا مگر اُس کو حیرت ہرگز نہیں تھی۔ وہ سمجھتا تھا کہ اُس کی کامیابی اُس کی ذہانت و ذکاوت اور انتھک کوششوں کا نتیجہ ہے۔ مگر خدا بہتر جانتا ہے کہ اِن تمام چیزوں کا اُس کی شہرت اور کامیابی میں ذرّہ برابر دخل نہیں تھا۔ یہ صرف قدرت کی ستم ظریفی تھی کہ وہ فلموں کا سب سے بڑا ظریف بن گیا تھا۔

میری موجودگی میں اُس نے فلمستان کے تین فلموں میں حصّہ لیا۔ ان تین فلموں کا نام علی الترتیب یہ ہے۔ "چل چل رے نوجوان"، "شکاری" اور "آٹھ دن"۔ ہر فلم کی تیاری کے دوران میں ہم اُس کی طرف سے متعدد بار مایوس ہوئے۔ مگر اشوک اور مکرجی چونکہ مجھے بتا چکے تھے کہ اُس سے کام لینے کے لیے پِتّا قطعی طور پر مار دینا پڑتا ہے۔ اس لیے مجھے اپنی جلد گھبرا جانے والی طبیعت کو قابو میں رکھنا پڑا، ورنہ بہت ممکن تھا کہ میں 'چل چل رے نوجوان' کی شوٹنگ ہی کے دوران میں دوسرے جہان کو چل پڑتا۔ ویسے کبھی کبھی غصّے کے عالم میں یہ خواہش بڑی شدّت سے پیدا ہوتی تھی کہ کیمرہ اُٹھا کر اُس کے سر پہ دے مارا جائے۔ مائکروفون کا پورا بوم اُس کے حلق میں ٹھونس دیا جائے، اور سارے بلب اُتار کر اُس کی لاش پہ ڈھیر کر دیئے جائیں۔ مگر جب اس قصد سے اُس کی طرف دیکھتے تو یہ سفاکانہ عزم ہنسی میں تبدیل ہو جاتا۔

مجھے معلوم نہیں عزرائیل علیہ السلام نے اُس کی جان کیوں کر لی ہوگی۔ کیونکہ اُس کو دیکھتے ہی ہنسی کے مارے اُن کے پیٹ میں بل پڑ پڑ گئے ہوں گے۔ مگر سنا ہے کہ فرشتوں کے پیٹ نہیں ہوتا۔ کچھ بھی ہو ڈیسائی کی جان لیتے ہوئے وہ یقیناً ایک بہت ہی دلچسپ تجربے سے دوچار ہوئے ہوں گے۔

جان لینے کا ذکر آیا تو مجھے "شکاری" کا آخری سین یاد آگیا۔ اس میں ہمیں ڈیسائی کی جان لینا تھی ـــــ اُنھیں بے رحم جاپانیوں کے ہاتھوں زخمی ہو کر مرنا تھا۔ اور مرتے وقت اپنے ہونہار اور بہادر شاگرد بادل (اشوک) اور اُس کی محبوبہ ویرا سے مخاطب ہو کر یہ کہنا تھا کہ وہ اس کی موت پر مغموم نہ ہوں، اور اپنا نیک کام کئے جائیں۔ مکالموں کی صحتِ ادائگی کا سوال حسبِ معمول مشکل تھا، مگر اب یہ مصیبت درپیش تھی کہ ڈیسائی کو کس انداز سے مارا جائے کہ لوگ نہ ہنسیں۔ میں نے تو اپنا فیصلہ دے دیا تھا کہ اس کو اگر سچ مچ بھی مار دیا جائے تو لوگ ہنسیں گے وہ کبھی یقین ہی نہیں کریں گے کہ ڈیسائی مر رہا ہے یا مر چکا ہے۔ اُن کے ذہن میں ڈیسائی کی موت کا تصور آ ہی نہیں سکتا۔

میرے اختیار میں ہوتا تو میں نے یقیناً یہ آخر کا سین حذف کر دیا ہوتا۔ مگر مشکل یہ تھی کہ کہانی بہاؤ ہی کچھ ایسا تھا کہ انجام میں اُس کیریکٹر کی موت ضروری تھی جو کہ اُسے سونپا گیا تھا، کئی دن ہم سوچتے رہے کہ اس مشکل کا کوئی حل مل جائے مگر ناکام رہے۔ اب اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ اُسے مرتا دکھایا جائے۔

مکالموں کی صحت اب ثانوی اہمیت رکھتی تھی۔ جب ریہرسلیں کی گئیں۔ تو ہم سب نے نوٹ کیا کہ وہ نہایت ہی مضحکہ خیز طریقے پر مرتا ہے۔ اشوک اور ویرا سے مخاطب ہوتے ہوئے وہ کچھ اس انداز سے اپنے دونوں ہاتھ ہلاتا ہے، جیسے کوک بھرا کھلونا، اُس کی یہ حرکت بہت ہی خندہ خیز تھی۔ ہم نے بہت کوشش کی کہ وہ ساکت پڑا رہے اور اپنے بازوؤں کو جنبش نہ دے۔ مگر دماغ کی طرح اُس کا جسم بھی اُس کے اختیار سے باہر تھا۔

بڑی دیر کے بعد آخر اشوک کو ایک ترکیب سوجھی، اور وہ یہ تھی کہ جب سین شروع ہو، تو ویرا اور وہ دونوں اُس کے ہاتھ پکڑ لیں۔ یہ ترکیب کارگر ثابت ہوئی۔ سب نے اطمینان کا سانس لیا۔ لیکن جب پردے پر یہ فلم پیش ہوا، اور ڈیسائی کی موت کا یہ منظر آیا تو سارا ہال قہقہوں سے گونج اٹھا ___ ہم نے فوراً دوسرے شو کے لئے اس کو قینچی سے مختصر کر دیا۔ مگر تماشائیوں کے ردِ عمل میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہوئی۔ آخر تھک ہار کر اُس کو ویسے کا ویسا رہنے دیا۔

ڈیسائی آنجہانی بے حد کنجوس تھا۔ کسی دوست پر ایک دمڑی بھی خرچ نہیں کرتا تھا۔ بڑے عرصے کے بعد اُس نے قسطوں پر اشوک سے اُس کی پرانی موٹر خریدی۔ وہ خود چونکہ ڈرائیو کرنا نہیں جانتا تھا۔ اس لئے ایک ملازم رکھنا پڑا، مگر یہ ملازم ہر دسویں پندرھویں روز بدل جاتا تھا، میں نے ایک روز اُس کی وجہ دریافت کی تو ڈیسائی گول کر گیا۔ لیکن مجھے ساؤنڈ ریکارڈسٹ جگتاپ نے بتایا کہ

ڈیسائی صاحب ایک ڈرائیور رکھتے ہیں۔ نمونے کے طور پہ اُس کا کام دس بارہ روز دیکھتے ہیں۔ اور پھر اُسے "کنڈم" کر کے دوسرا رکھ لیتے ہیں۔ یہ سلسلہ کافی دیر تک جاری رہا، مگر اسی دوران میں اُس نے خود موٹر چلانا سیکھ لیا۔

آنجہانی کو دمے کی شکایت بہت عرصے سے تھی۔ یہ مرض لاعلاج قرار دے دیا گیا تھا۔ کسی کے کہنے پر اُس نے ہر روز دوا کے طور پر تھوڑی سی خشک بھنگ کھانا شروع کی تھی۔ اب وہ اس کا عادی بن گیا تھا۔ شام کو سردیوں کے موسم میں برانڈی کا آدھا پیگ بھی پیتا تھا۔ اور خوب چہکا کرتا تھا۔

"آٹھ دن" میں ایک سین ایسا تھا کہ اُسے پانی کے ٹب میں بیٹھنا تھا۔ موسم خوشگوار تھا۔ مگر اُس کی حد سے نازک طبیعت کے لئے ناقابلِ برداشت حد تک سرد تھا۔ ہم نے اِس کے پیشِ نظر پانی گرم کرا دیا اور ساتھ ہی پروڈکشن منیجر سے کہہ دیا کہ برانڈی تیار رکھے، جن اصحاب نے یہ فلم دیکھا ہے، اُن کو یہ منظر ضرور یاد ہوگا جس میں ٹیکم لالہ (ڈیسائی) سر زیندر کے فلیٹ کے غسل خانے میں ٹب میں بیٹھا ہے۔ سر پہ برف کی تھیلی ہے۔ ایک چھوٹا پنکھا چل رہا ہے اور وہ شراب کے نشے میں دُھت یہ کہہ رہا ہے۔ "چاروں طرف سمندر ہی سمندر ہے۔ اُوپر برف کا پہاڑ ہے ـــــ وغیرہ وغیرہ۔

شوٹنگ ختم ہوئی تو جلدی جلدی ڈیسائی کے کپڑے تبدیل کرائے گئے، اُس کے بدن کو اچھی طرح خشک کیا گیا۔ پھر اُس کو ایک پیگ برانڈی کا دیا گیا۔

یہ اُس کے حلق سے نیچے اُتری تو اُس نے بہکنا شروع کر دیا۔ اتنی قلیل مقدار ہی نے اُسے پُورا شرابی بنا دیا، کمرے میں صرف میں موجود تھا، چنانچہ وہ مجھے لکنت بھرے لہجے میں اپنے تمام کارناموں کی داستان سنانے لگا۔ کچہریوں میں وہ کیسے مقدمے لڑتا تھا۔ اور کس شاندار اور زوردار طریقے پر اپنے مُوکلوں کی وکالت کرتا تھا۔

ڈیسائی قائدِاعظم محمد علی جناح مرحوم اور شری بھولا بھائی ڈیسائی کی قانون دانی اور اُن کے زورِ وکالت کا بہت معترف تھا۔ قائدِ اعظم مرحوم سے وہ کئی بار شرفِ ملاقات حاصل کر چکا تھا۔ اور متعدد مرتبہ عدالتِ عالیہ میں اُن کی قانونی موشگافیاں سُن چکا تھا۔

غالباً "آٹھ دن" فلمانے ہی کا زمانہ تھا کہ حکومتِ پنجاب نے زیرِ دفعہ ۲۹۲ میرے وارنٹ جاری کئے۔ میرے افسانے "بُو" پر فحاشی کا الزام تھا۔ اس کا ذکر ڈیسائی سے ہُوا تو اُس نے اپنی قانونی واقفیت بگھارنا شروع کر دی۔ دفعتاً مجھے ایک دلچسپ شرارت سُوجھی، وہ یہ کہ اپنے مقدمے کی پیروی کے لئے اُسے منتخب کروں۔ عدالت میں یقیناً ایک ہنگامہ برپا ہو جاتا۔ جب وہ میری طرف سے پیش ہوتا۔ میں نے اس کا ذکر مُکر جی سے کیا وہ فوراً مان گئے۔ بات واقعی مزے کی تھی۔

گواہوں کی فہرست بنائی تو مَیں نے انڈین چارلی نور محمد کو بھی اس میں شامل کیا۔

چارلی اور ڈیسائی سارے لاہور کو عدالت کے کمرے میں کھینچنے کے لئے کافی تھے، میں اس کا تصوّر کرتا تو میرے سارے وجود میں ہنسی کا چشمہ پھوٹنے لگتا۔ مگر افسوس کہ شوٹنگ کی مشکلات کے باعث میرا یہ دلچسپ خواب پورا نہ ہُوا۔

ڈیسائی نے متعلقہ دفعہ کے متعلق تمام معلومات حاصل کر لی تھیں جو میرے نزدیک قطعی ضروری نہیں تھیں، اس لئے کہ میں تو صرف تفریح چاہتا تھا۔ نور محمد چارلی نے بھی اپنی گواہی کا خاکہ تیار کر لیا تھا۔ مگر وہ اُدھر رنجیت میں کچھ اس طرح اپنے فلموں کی شوٹنگ میں مصروف تھا کہ ایک دن کے لئے بھی اسے چھوڑ نہیں سکتا تھا۔

ڈیسائی کو افسوس تھا کہ اُسے اپنی قانونی قابلیت دکھانے کا موقعہ نہ ملا، کم بخت کی نگاہوں سے یہ بالکل اوجھل تھا کہ مجھے اُس کی اس قابلیت سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں تو یہ چاہتا تھا کہ جب وہ عدالت میں پیش ہو تو بار بار بوکھلائے اور جو کچھ کہنا چاہتا ہے بار بار بھُولے۔ پشاور کے پانی کو پیشاب بنائے۔ اور اتنے ری ٹیک کرائے کہ سب کی طبیعت صاف ہو جائے۔

ڈیسائی مر چکا ہے۔ زندگی میں صرف ایک بار اُس نے ری ٹیک ہونے نہیں دیا۔ ریہرسل کئے بغیر اُس نے عزرائیل علیہ السّلام کے حکم کی تعمیل کی۔ اور لوگوں کو مزید ہنسائے بغیر موت کی گود میں چلا گیا۔

بابو راؤ پاٹیل

غالباً سن اڑتیس کی بات ہے کہ بابو راؤ سے میری ملاقات ہوئی۔ میں ان دنوں ہفتہ وار "مصوّر" ایڈٹ کیا کرتا تھا، تنخواہ واجبی تھی، یعنی کل چالیس روپے ماہوار "مصوّر" کا مالک نذیر لودھیانوی چاہتا تھا کہ میری اس آمدنی میں کچھ اضافہ ہو جائے، چنانچہ اس نے میرا تعارف بابو راؤ پاٹیل اڈیٹر فلم انڈیا سے کرایا۔

اس سے پہلے کہ میں اپنی اس ملاقات کا حال بیان کروں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں یہ بتاؤں کہ فلم انڈیا معرضِ وجود میں کیسے آیا۔ آپ کو یاد ہوگا، ایک زمانہ تھا جب پونہ کی پربھات فلم کمپنی اپنے پورے عروج پر تھی، "امرت منتھن" اور "امر جیوتی" جیسے امر فلم پیش کرکے اس نے ہندوستان کے اکناف و اطراف میں غیر معمولی شہرت حاصل کر لی تھی، اب وہ ایک معمولی ادارہ نہیں رہا تھا بلکہ "پربھات نگر"

میں تبدیل ہو چکا تھا۔ جس کا ہر رکن عزم و اجتہاد کے نشے میں مخمور تھا۔ شانتارام، سیّد فتح لال، دھائبر ـــــ سب کو ایک ہی لگن تھی کہ ان کی کمپنی فن اور تکنیک میں سب کو پیچھے چھوڑ جائے۔

اسی زمانے میں جبکہ پربھات 'وسعت اختیار کر رہی تھی اور حاملہ عورت کی طرح خوبصورت اور باوقار تھی، اس نے اپنے بطن سے تین بچے پیدا کیے

(۱) فیمس پکچرز، جو پربھات کے فلموں کا واحد تقسیم کار ادارہ مقرر ہوا، اس کے مالک بابوراؤ پائی تھے۔

(۲) بی۔ پی سامنت اینڈ کمپنی۔ اشتہاروں کے تقسیم کار۔ پربھات کے تمام فلموں کی نشر و اشاعت کا کام اس ادارے کے سپرد ہوا۔

(۳) نیو جیک پرنٹنگ پریس ـــ گمنام سا پریس تھا، اس کے مالک پارکر تھے ان کو پربھات نے اپنے تمام پوسٹروں، دستی اشتہاروں، اور کتابچوں کی چھپائی کا کام تفویض کر دیا۔

فلم انڈیا، نیو جیک پرنٹنگ ورکس سے پیدا ہوا، پارکر بابوراؤ کا دوست تھا، معمولی سا پڑھا لکھا آدمی، ان دونوں نے مل کر پلان بنایا، پریس موجود تھا، کاغذ بھی دستیاب ہو سکتا تھا۔ کیونکہ ان دنوں بہت سستا تھا، بی۔ پی سامنت کمپنی موجود تھی، اس سے پربھات فلم کمپنی کے علاوہ دوسری فلم کمپنیوں کے اشتہار مل سکتے تھے، ظاہر ہے کہ سب لوازم موجود تھے ـــــ اور بابوراؤ

بڑا محنتی آدمی ہے، اور دقیقہ رس بھی، اس کے علاوہ وہ خواب دیکھنے والا آدمی نہیں، انگریزی محاورے کے مطابق وہ کیل کے سر پر چوٹ لگانا جانتا ہے چنانچہ جب 'فلم انڈیا' کا پہلا پرچہ شائع ہؤا، تو یہ واقعہ ہے ہندوستان میں فلمی صحافت کا ایک نیا اور انوکھا دور شروع ہؤا۔

بابوراؤ کے قلم میں فصاحت تھی، بلاغت تھی، گنڈوں کی سی کجکلاہی بھی تھی، اس کے علاوہ اس میں ایک ناقابلِ نقل طنز اور مزاح تھا، ایک زہر تھا، جو میں سمجھتا ہوں یہاں ہندوستان میں کسی انگریزی لکھنے والے ادیب کے قلم کو نصیب نہیں ہؤا۔

بابوراؤ کے قلم کی جس خوبی نے اس کی دھاک جمائی وہ اس کا نوکیلا بہت ہی نوکیلا طنز تھا، جس میں ہلکا سا گنڈ پنا بھی شامل تھا۔ اس صنف سے ہندوستانی آنکھیں بالکل ناآشنا تھیں، اس لئے اس کی تحریریں لوگوں کے لئے چاٹ کا مزا دینے لگیں۔

بابوراؤ بڑے ٹھسّے کا آدمی ہے، اس نے اپنا دفتر اپالو اسٹریٹ کی مبارک بلڈنگ کے ایک وسیع وعریض فلیٹ میں قائم کیا، اور اسے ہر ممکن طریقے سے بارعب بنایا۔

مبارک بلڈنگ کے اسی وسیع وعریض دفتر میں بابوراؤ سے میری پہلی ملاقات ہوئی، اس وقت تک "فلم انڈیا" کے غالباً سات آٹھ شمارے نکل چکے تھے، جو میں "مصور" کے دفتر میں دیکھ چکا تھا اور متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا تھا۔

میرا خیال تھا ایسی ستھری انگریزی لکھنے والا اور نوکیلے طنز کا مالک، دبلا پتلا اور تیکھے تیکھے نقشوں والا آدمی ہوگا، مگر جب میں نے ایک جاٹ کو ایک جہازی میز کے پاس گھومنے والی کرسی پر بیٹھے دیکھا تو مجھے سخت ناامیدی ہوئی، اس کے چہرے کا کوئی نقش، کوئی خط ایسا نہیں تھا، جس میں اس کے قلم کا ہلکا سا عکس بھی نظر آسکے، چھوٹی چھوٹی آنکھیں، چوڑا چکلا چہرہ، موٹی ناک بڑا وا ہیات لب دہان، دانت بدنما ـــــ لیکن پیشانی بڑی۔

جب وہ مجھ سے ہاتھ ملانے کے لئے اٹھا تو مجھے معلوم ہوا کہ وہ مجھ سے اونچا ہے، یعنی کافی دراز قد ہے۔ مضبوط ڈیل ڈول، لیکن جب اُس نے ہاتھ ملایا تو گرفت بڑی ڈھیلی، اور جب اُس نے اُردو میں بات چیت شروع کی تو میرا سارا مزا کرکرا ہوگیا، گنواروں کا سا لب و لہجہ، بات بات میں بمبئی کے موالیوں کی طرح "سالا" کہتا تھا، اور گالیاں بکتا تھا۔

میں نے خیال کیا، شاید اس لئے کہ اس کو اردو نہیں آتی، لیکن جب اُس نے ٹیلیفون پر کسی سے انگریزی میں گفتگو شروع کی تو خدا کی قسم میرے دل میں شک پیدا ہوا، کہ یہ شخص ہرگز ہرگز وہ بابو راؤ پٹیل نہیں جو فلم انڈیا کا اداریہ لکھتا ہے۔ "بھیے کالنگ" رقم کرتا ہے اور سوالوں کے جواب دیتا ہے، معاذ اللہ کیا لب و لہجہ تھا، ایسا لگتا تھا کہ انگریزی، مرہٹی میں اور مرہٹی، بمبئی کی گنوار بولی میں بول رہا ہے یہاں بھی ہر فل سٹاپ کے بعد یا اس سے پہلے ایک "سالا" ضرور آتا تھا۔

میں نے دل میں کہا۔ "اگر یہی سالا بابو راؤ پاٹیل ہے تو سالا میں سعادت حسن منٹو نہیں ہوں"

تھوڑی دیر گفتگو ہوئی، نذیر لودھیانوی نے میری بہت تعریف کی۔ اس پہ بابو راؤ نے کہا۔ "مجھے مالوم ہے۔ وہ سالا عابد گل ریز ہر ہفتے مجھ کو مصور پڑھ کے سنا جاتا ہے۔" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہُوا۔ "یہ سالا منٹو کیا ہُوا۔"

میں نے اس کو اس کا مطلب سمجھا دیا۔

معاملہ صرف اتنا تھا کہ پربھات کے کسی فلم کی "چوپڑی" یعنی کتابچے میں جو کہانی کا خلاصہ تھا، اور جسے بابو راؤ نے لکھا تھا، مجھے اس کا اردو میں ترجمہ کرنا تھا، میں نے یہ خلاصہ لے لیا اور ترجمہ کر کے نذیر لودھیانوی کے ہاتھ اسے بھجوا دیا۔ جو اس نے بہت پسند کیا۔

اس کے بعد دیر تک میری اس کی ملاقات نہ ہوئی، میں دفتر سے بہت کم باہر نکلتا تھا۔ فلم کمپنیوں میں ملازمت حاصل کرنے کے لیئے در بدر مارے پھرنا، یہ میں اس وقت بھی اپنی شان کے خلاف سمجھتا تھا۔

بابو راؤ نے کسی نہ طرح شانتا رام کو اُکسایا کہ وہ "پربھات" کا ایک ماہانہ پرچہ شائع کرے، جس میں وہ بالکل نئے انداز سے ان کی فلم کمپنی کی اور ان کے فلموں کی پبلسٹی کرے گا، شانتا رام گو اَن پڑھ تھا۔ مگر آرٹسٹ تھا، اور بہت اعلےٰ پائے کا، طبیعت میں اُپج تھی فوراً مان گیا، بس پھر کیا دیر تھی "پربھات"

نکل آیا اور بڑی شان سے، بابوراؤ نے واقعی بڑے انوکھے اور پیارے انداز میں پربھات والوں اور ان کے فلموں کی پبلسٹی کی۔

نذیر لدھیانوی بڑا وقت شناس اور مطلب نکالنے والا آدمی تھا۔ فوراً بابوراؤ کے پاس پہنچا، یہ اسکیم لے کر کہ پربھات کے ہر شمارے کے کچھ حصے "مصور" میں بھی شائع ہونے چاہئیں۔

میں یہاں ایک بات عرض کردوں کہ بابوراؤ نے چونکہ خود مفلسی کے دن دیکھے ہیں، اس لئے وہ حاجتمندوں پر ہمیشہ مہربان ہوجاتا ہے، اس کو معلوم تھا کہ نذیر کی مالی حالت کوئی زیادہ اچھی نہیں، اس لئے وہ فوراً اُس کی تجویز مان گیا۔ لیکن اس کو شبہ تھا کہ جو کچھ اس نے انگریزی میں لکھا ہے، اردو میں منتقل نہ ہوسکے گا۔ نذیر نے میرا نام لیا تو وہ کسی قدر مطمئن ہوگیا۔

ایمان کی بات ہے میرا انگریزی کا علم بہت محدود ہے۔ بابوراؤ نے جو کچھ لکھا تھا وہ میری سمجھ سے بالاتر تو نہ تھا۔ مگر اس کا اردو میں من وعن ترجمہ کرنا بہت ہی دشوار تھا۔ اس کا ایک خاص طرز تھا، الفاظ کی نشست و برخواست ایک خاص ڈھب کی تھی، انگریزی اور امریکی دونو محاورے تھے۔ بعض الفاظ پر وہ کھیل کھیل گیا تھا، اب میں کیا کرتا۔ بہت سوچ بچار کے بعد یہی بات سمجھ میں آئی کہ مضمون سامنے رکھ لوں اور اس کے مفہوم کو اپنے انداز اور اپنی زبان میں منتقل کر دوں، چنانچہ میں نے یہی کیا۔

جب یہ خرافات چھپ گئی تو نذیر، پرچہ لے کر اس کے پاس گیا۔ میں بھی اس کے ساتھ تھا، اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا، "سالا تو بھی بابو راؤ بننے کی کوشش کرتا ہے۔"

میں نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ اس کو ساری بات سمجھادی کہ تمھاری تحریر کو اردو میں لانے کی صرف ایک یہی صورت تھی ——— میں سمجھتا ہوں میں نے جو کیا جائز ہے۔"

دائیں ہاتھ کی آخری انگلیوں میں سگرٹ دبائے ٹھیٹ دیہاتیوں اور موالیوں کی طرح اس نے مٹھی بند کر کے زور کا کش لیا اور کہنے لگا۔ "سالا ہم نے عابد گل ریز سے سب سُنا۔ بہت مزا آئی ——— میں نے اس کو کہا ——— (گالی) ——— تو تو کہتا تھا کہ اُردو کا بہت بڑا رائٹر ہے۔"

میں اس داد سے بہت خوش ہوا۔ چنانچہ طے ہو گیا کہ آئندہ ترجمے کا یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہے گا ——— مگر دو ہی پرچوں کے بعد بند ہو گیا، کیونکہ پربھات فلم کمپنی اتنے زائد شاہانہ خرچ کی کفیل نہیں ہو سکتی تھی۔

میں زیادہ تفصیلات میں نہیں جانا چاہتا کہ وہ مجھے کھینچ کر اور موضوعات کی طرف لے جائیں گی، جو اس داستان کے ریشوں کے اندر چھپے ہوئے ہیں۔ مجھے اصل میں بابو راؤ پاٹیل کے متعلق اپنے تاثرات بیان کرنا ہیں۔

چند ایسے واقعات ہوئے کہ نذیر سے میرے .... نہ نہ نہ ...... ابھی

نہیں، یہ بعد کی بات ہے، جی ہاں ــــ میں نے شادی کا ارادہ کر لیا، ان دنوں میں امپیریل فلم کمپنی میں اسّی روپے ماہوار پہ نوکر ہوا تھا، یہاں ایک برس ملازمت کی۔ مگر تنخواہ صرف آٹھ مہینے کی ملی۔ چار مہینے کی باقی تھی کہ اس کمپنی کا دیوالہ پٹ گیا۔

یہاں سے میں سروج فلم کمپنی میں چلا گیا۔ مگر ایسا لگتا ہے کہ میں اندر داخل ہوا ہی تھا کہ کمپنی نے بند ہونے کا ارادہ کر لیا تھا، مجھے یقین ہونے والا تھا کہ میں سبز قدم ہوں کہ اس کمپنی کے بند ہونے کے تھوڑے ہی عرصہ بعد اس کے سیٹھ نے ہاتھ پاؤں مار کر اسی چار دیواری میں ایک نئی کمپنی کھڑی کر دی، یہاں میں سو روپے ماہوار پہ ملازم ہوا۔ ایک کہانی لکھی۔ یہ تین چوتھائی فلمائی بھی گئی۔ اسی دوران میں میرا نکاح ہو چکا تھا۔ اب صرف رخصتی باقی تھی، جس کے لئے مجھے روپے کی ضرورت تھی، تاکہ کوئی معمولی سا فلیٹ کرائے پہ لے کر اُسے گھر میں تبدیل کر سکوں۔ جب روپیہ مانگنے کا وقت آیا تو سیٹھ نانو بھائی نے صاف جواب دے دیا۔ اور کہا میری حالت سخت خراب ہے، اس کی حالت تو جو خراب تھی سو تھی لیکن یہ غور فرمائیے میری حالت کتنی خراب ہو گی۔ میں نے سیٹھ کو سارے واقعات سے آگاہ کیا۔ مگر اس کے کان پہ جوں تک نہ رینگی، معاملہ بڑھ گیا۔ تُو تُو میں میں شروع ہوئی تو اس نے مجھے کمپنی سے نکال باہر کیا۔ میری عزّت پہ یہ صاف حملہ تھا، میرا وقار بالکل مٹی میں مل گیا تھا، چنانچہ میں نے تہیہ کر لیا کہ وہیں باہر

صدر دروازے پر بیٹھ کر بھوک ہڑتال شروع کر دوں گا۔
اس معاملے کی خبر کسی نہ کسی طریقے سے بابوراؤ تک پہنچ گئی، اس نے پہلے تو نانو بھائی ڈیسائی کو فون پر بہت گالیاں دیں۔ جب اس کا کچھ اثر نہ ہوا، تو سیدھا اسٹڈیو پہنچا اور بارہ سو روپے کا فیصلہ آٹھ سو روپے میں کرا دیا۔ میں نے کہا چلو بھاگتے چور کی لنگوٹی ہی سہی۔

میرا گھر بس گیا۔

ہاں میں آپ سے یہ کہنا بھول گیا، میں جس زمانے میں امپیریل فلم کمپنی میں تھا، ان دنوں وہاں ایک بہت ہی شریف الطبع ایکٹرس پدما دیوی کے نام سے تھی، میرے پہلے فلم "کسان کنیا" (رنگین) کی ہیروین یہی تھی، میرے اس کے بڑے دوستانہ تعلقات تھے، لیکن اس کا صحیح یعنی جسمانی تعلق بابوراؤ پاٹیل سے تھا، جو اس پر بڑی کڑی نگرانی رکھتا تھا۔

یہاں آپ کو یہ بتا دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بابوراؤ پاٹیل کی اس وقت دو بیویاں تھیں، ان میں سے ایک کو میں نے دیکھا ہے، جو ڈاکٹر تھی۔

خیر چند ایسے واقعات ہوئے کہ نذیر نے میری بے لوث خدمت اور دوستی ٹھکرا دی ——— ہم دونوں الگ ہو گئے، اس کا مجھے افسوس نہ تھا، میں اس سے لیتا ہی کیا تھا، لیکن پھر بھی وہ میرے مکان کا کرایہ جو پچیس روپے بنتا تھا ادا کر دیا کرتا تھا، ان دنوں میں نے ریڈیو میں بھی لکھنا شروع کر دیا تھا۔ لیکن اب

چونکہ میری اکیلی جان کا سوال نہیں تھا، اس لیئے میں نے سوچا کہ بابوراؤ سے ملنا چاہیئے ــــ لیکن ٹھہریئے ــــ میں آگے چلا آیا۔ درمیان میں مجھے آپ سے کچھ اور بھی کہنا تھا۔

میری شادی عجیب و غریب حالات میں ہوئی تھی، کچھ ایسے قصّے تھے کہ میرے گھر میں سوائے میری والدہ کے اور کوئی نہیں تھا، فلم انڈسٹری کے تمام آدمی آرہے تھے۔ ان کی خاطر داری کون کرتا، ایک ضعیف عورت بیچاری کیا کر سکتی تھی۔

بابوراؤ کو کہیں سے معلوم ہوا کہ منٹو پریشان ہے تو اس نے اپنی چہیتی رنگین ملکہ پدما دیوی کو بھیج دیا کہ جاؤ اس کی والدہ کا ہاتھ بٹاؤ، مجھے اچھی طرح یاد ہے، پدما نے میری بیوی کو شاید کوئی زیور وغیرہ بھی دیا تھا۔

چلیئے، اب چلتے ہیں ــــ جی ہاں، میں بابوراؤ کے پاس پہنچا، اس لیئے کہ وہ اردو کا ایک ہفتہ وار اخبار "کارواں" بھی نکالتا تھا، صرف اس غرض سے کہ عابد گل ریز کے لیئے جو اس کا دوست تھا، روزی کا ایک وسیلہ بن جائے، مگر وہ ایک لاابالی طبیعت کا شاعر آدمی تھا اور ان دنوں اخبار سے علحدہ ہو کر مکالمہ نویسی، گیت نگاری اور فلم سازی کے چکّر میں پڑا تھا۔

میں نے بابوراؤ کو برطرفی کا وہ نوٹس دکھایا۔ جو ... نے نذیر نے بھیجا تھا، اسے دیکھ کر بابوراؤ ایک لحظہ کے لیئے چکرا گیا، بہت بڑی گالی دے کر اس نے

صرف اتنا کہا۔ "ایسا؟"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

بابوراؤ نے فوراً ہی کہا۔ "تو سالا تم ادھر کیوں نہیں آجاتا ـــ اپنا کاروان ہے ـــ سالے کو پوچھنے والا ہی کوئی نہیں۔"

میں نے جواب دیا۔ "اگر ایسی بات ہے تو میں تیار ہوں۔"

بابوراؤ نے زور سے آواز دی۔ "ریٹا"

دروازہ کھلا۔ ایک مضبوط پنڈلیوں اور سخت چھاتیوں والی گہرے سانولے رنگ کی کرسچین لڑکی اندر داخل ہوئی۔

بابوراؤ نے اسے آنکھ ماری "ادھر آؤ۔"

وہ اس کی کرسی کے پاس چلی گئی۔

بابوراؤ نے کہا۔ "منہ ادھر کرو۔"

اس نے حکم کی تعمیل کی۔

بابوراؤ نے ایک ایسا دھپّا اس کے چوتڑوں پر مارا کہ اس کے کولھوں کا سارا گوشت ہل گیا۔ "جاؤ کاغذ پنسل لاؤ۔" لڑکی جس کا نام ریٹا کارلائل تھا اور جو بابوراؤ کی بیک وقت سکرٹری، سٹینو اور داشتہ تھی، چلی گئی اور فوراً ہی شارٹ ہینڈ کی کاپی اور پنسل لے آئی۔ بابوراؤ میرے نام کا اپائنٹ منٹ لیٹر لکھوانے لگا۔ تنخواہ کے پاس پہنچا تو رک گیا اور مجھ سے مخاطب ہوا۔ "کیوں منٹو کتنا چلے گا؟"

پھر خود ہی کہا۔ "ایک سو پچاس ٹھیک ہے۔"

میں نے کہا۔ "نہیں"

بابو راؤ سنجیدہ ہو گیا۔ "دیکھو منٹو — یہ سالا کارواں زیادہ افورڈ نہیں کر سکتا۔"

میں نے کہا۔ "تم میرا مطلب غلط سمجھے ہو — میں ساٹھ روپے ماہوار پہ کام کروں گا۔ اس سے کم نہ اس سے زیادہ۔"

بابو راؤ سمجھا، میں اس سے مذاق کر رہا ہوں، پر جب میں نے اسے یقین دلایا کہ میرا ایسا کوئی مطلب نہیں تو وہ اپنے مخصوص گنوار لہجے میں بولا۔ "سالا میڈ ملّا۔"

میں نے اس سے کہا۔ میں میڈ ملّا یعنی پاگل ملّا ہی سہی۔ لیکن میں نے یہ ساٹھ روپے اس لئے کہے ہیں کہ میں وقت کا پابند نہیں رہنا چاہتا۔ جب چاہوں گا آؤں گا۔ جب چاہوں گا چلا جاؤں گا۔ لیکن کارواں وقت پر نکلتا رہے گا۔

بات طے ہو گئی۔

میں نے بابو راؤ کے دفتر میں غالباً چھ سات مہینے کام کیا۔ اس دوران میں مجھے اس کی عجیب و غریب شخصیّت کے متعلق کئی باتیں معلوم ہوئیں۔

اس کو ریٹا کارلائل سے عشق تھا۔ اور وہ سمجھتا تھا کہ دنیا میں اور کوئی لڑکی اس کے حسن و جمال کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ ریٹا کارلائل جیسا کہ عام کرسچین لڑکیوں کا دستور ہے۔ جس راستہ پہ تھی چلی جا رہی تھی۔ لیکن بابو راؤ کی وجہ سے اس کا بھاؤ بڑھ گیا تھا۔

مجھے یقین ہے اگر ریٹا اردو بول سکتی تو وہ اسے چند دنوں میں فلمی آسمان پہ پہنچا دیتا۔ اس کو اپنے قلم اور اس کے زور پر بہت ناز ہے وہ سمجھتا ہے۔ کہ میں اگر لکڑی کا ایک ٹکڑا لے لوں اور کہنا شروع کر دوں کہ نرتے سمراٹ ہے تو یقیناً وہ چوب بے حرکت نرتے سمراٹ بن جائے گی۔ اور لوگ اس پہ ایمان لائیں گے۔

پدما دیوی گمنامی کے گوشے میں پڑی تھی مگر جب اس کے آغوش میں آئی تو اس نے اسے "کلر کوئین" یعنی رنگوں کی ملکہ بنا دیا۔ ان دنوں فلم انڈیا کے ہر شمارے میں اس کے درجنوں فوٹو ہوتے تھے۔ جن کے نیچے وہ بڑے چست فقرے اور جملے لکھتا تھا۔

بابوراؤ خود ساختہ آدمی ہے۔ جو کچھ بھی وہ اس وقت تھا اور جو کچھ وہ اس وقت ہے اس کے بنانے میں کسی کا ہاتھ نہیں۔ جوانی ہی میں اس کی اپنے باپ سے کسی بات پر ان بن ہو گئی تھی۔ چنانچہ دونوں کے تعلقات منقطع ہو گئے۔ بابوراؤ سے میں نے جب بھی بڈھے پاٹیل کے بارے میں سنا۔ یہی سنا کہ "وہ سالا پکّا حرامی ہے"۔

معلوم نہیں ان دونوں میں سے حرامی کون ہے اگر بڈھا پاٹیل حرامی ہے۔ (بابوراؤ کے معنوں میں) تو خود بابوراؤ بھی اس بڈھے سے حرامی پن میں جہاں تک جوتوں کا تعلق ہے کئی جوتے آگے ہے۔ اپنے اور اپنے باپ کے ملا کر۔

بابوراؤ کے قلم میں جس نوکیلے طنز کا میں نے ذکر کیا ہے، اگر اس کے اسباب تلاش کئے جائیں تو اس کی اوائل کی زندگی میں مل سکتے ہیں۔ وہ غزنی کا محمود بن کر کیوں بت شکنی کرنا چاہتا ہے۔ اسی لئے کہ بچپن میں اس کے والد نے اس کی فطرت توڑنے اور اپنے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی۔ اس کی شادی کی۔ مگر اس کی مرضی کے خلاف ــــ دوسری شادی، اس نے خود کی۔ مگر اس مرتبہ وہ خود دھوکا کھا گیا اور چڑ گیا۔ اپنے آپ سے ــــ ہر ایک سے!

بابوراؤ کے کردار کے شہ نشینوں میں کئی بت اوندھے اور شکستہ پڑے ہیں۔ کئی بڈھے حرامی ہیں۔ سینکڑوں بازاری ٹکھیائیاں ہیں۔ لیکن ان بتوں کو توڑ پھوڑ کر اسے وہ لذّت حاصل نہیں ہوئی جو سومنات کا مندر ڈھا کر غزنی کے محمود کو ہوئی تھی۔

وہ اُونچے استھان پر کسی کو بیٹھے ہوئے نہیں دیکھ سکتا، لیکن جو زمین پر گرا ہوگا، اُس کو اُٹھانے کے لئے وہ کئی کوس چل کے آئے گا۔ اُس کو اُونچا کرنے کے لئے وہ ایڑھی چوٹی کا زور لگا دے گا اور جب وہ افتادہ شخص اُس کی مدد سے اور اپنی محنت سے بلند مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ تو وہ اُس کو گرانے کی کوشش کرے گا۔

بابوراؤ مجموعۂ اضداد ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ شانتا رام اُس کے نزدیک دنیا کا سب سے بڑا فلم ڈائرکٹر تھا

ایک وہ زمانہ آیا کہ اُس نے اسی شانتا رام کے فلموں میں بلکہ اُس کے کردار میں بھی کیڑے ڈالنے شروع کر دیئے۔ کاردار کے وہ سخت خلاف تھا۔ لیکن بعد میں بابوراؤ کو اُس کی ہر ادا پسند آنے لگی۔ بٹوارہ ہوا تو وہ پھر اُس کے خلاف ہو گیا اُس کا اسٹڈیو اور اُس کی جائداد ضبط کرانے کے لیئے اُس نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ لیکن غریب کی قسمت اچھی تھی کہ بال بال بچ گیا۔

بیچ میں ایک زمانہ آیا کہ اُس نے ببانگِ دہل اعلان کر دیا کہ فلم سازی صرف 'میاں بھائی (مسلمان) جانتے ہیں۔ جو رکھ رکھاؤ، جو سلیقہ اور قرینہ مسلمان فلم ڈائرکٹروں کو ودیعت ہوا ہے۔ وہ کسی ہندو فلم ساز کے حصّے میں نہیں آسکتا۔ میں وہ دن بھی جانتا ہوں جب پرتھوی راج کو وہ ایک حقیر کیڑا سمجھتا تھا اور وہ دن بھی یاد ہیں۔ جب کشور ساہو اُسے بہت کھلتا تھا۔

بابوراؤ پر دورے پڑتے ہیں۔ نفسیاتی طور پر اُس کا دماغ بالکل درست نہیں۔ وہ ایک بہکی ہوئی بھٹکی ہوئی طاقت ہے ــــ ایک اندھی طاقت جو کبھی ادھر اپنا سر پھوڑتی کبھی ادھر ــــ وہ ایک ایسا آرٹسٹ ہے جو اپنے زعم میں گمراہ ہو گیا۔

میں جب "کارواں" میں تھا تو فلم انڈیا میں میری ذہانت و ذکاوت کے چرچے عام ہوتے تھے۔ وہاں سے نکلا تو میں "یہ منٹو کون ہے ــــ جانے کون بلا ہے" ہو گیا۔ لیکن تھوڑے ہی عرصے کے بعد جب میرا فلم "آٹھ دن" پیش ہوا تو اُس نے اس کے ریویو میں اپنی ٹوپی اُتار کر مجھے سلام کیا اور کہا

کہ منٹو ہمارے ملک کا منفرد ذہین افسانہ نگار ہے۔

جب بابوراؤ پربھات فلم کمپنی سے منسلک تھا تو شانتا آپٹے ہندوستان کی خوبصورت ترین فلم ایکٹرس تھی۔ وہاں سے علیحدہ ہوا تو وہ ایک دم بدصورت ہوگئی۔ اُس کے خلاف اُس نے کافی زہر "فلم انڈیا" میں اُگلا۔ مگر وہ بھی مرہٹے کی بچّی ہے۔ ایک روز سواری کا لباس پہنے بابوراؤ کے دفتر میں گھس گئی۔ اور سٹراپ سٹراپ چھ سات ہنٹر اُس کے جڑ دیئے۔

سنا تھا کہ اونٹ کی کوئی کل سیدھی نہیں ہوتی تھی۔ اونٹ کے بعد درجہ بابوراؤ پٹیل کا آتا ہے۔ اُس کی بھی کوئی کل سیدھی نہیں —— عرصہ ہوا بمبئی کی انگریزی صحافت کے باوا مسٹر بی۔ جی ہارنی مین (مرحوم) نے "بمبے سینٹی نل" کے خاص کالموں میں چند فقرے بابوراؤ پر چست کر دیئے۔

بابوراؤ کو بڑا تاؤ آیا اُس نے جھٹ ہتک عزّت کا مقدمہ دائر کر دیا۔ اسّی برس کا گرگِ جہاندیدہ ہارنی مین بہت ہنسا اُس نے ایک دوست کے ذریعے سے بابوراؤ کو یہ پیغام پہنچوایا کہ دیکھو اگر تم چاہتے ہو۔ کہ میں لڑوں تو میں تیار ہوں۔ لیکن اگر تم اپنی خیریت چاہتے ہو تو دو ہزار کی رقم دہنے ہاتھ سے بھجوا دو، تاکہ میں خاموش رہوں۔

بابوراؤ کو اور تاؤ آیا، پر جب اُس نے ٹھنڈے دل سے غور کیا اور بڈھے ہارنی مین کے کارناموں پر نظر ڈالی تو دو ہزار روپے اُس کی نذر کر دیئے۔

وہ بے وقوف ہے ـــ پرلے درجے کا احمق ہے، ورنہ اُس کے دل میں انسانیت کی رمق موجود ہے۔ وہ بڑا کھرا حیوان نہیں۔ غریبوں کا ہمدرد ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے، ایک مرتبہ اُس نے ایک بات پر طوفان برپا کر دیا تھا۔ بمبئی میں جو اُونچی عمارتیں ہیں اُن میں لفٹ لگی ہے۔ سیڑھیاں بھی ہوتی ہیں۔ سب کو یہ لفٹیں استعمال کرنے کی اجازت ہے۔ لیکن غریب ڈاکیوں کو نہیں۔ اگر صرف پانچویں منزل کے لئے ایک خط ہو تو اُسے پورا قطب صاحب چڑھنا اور اُترنا پڑے گا۔ بابوراؤ نے بہت طوفان مچایا اور اس خلافِ انسانیت حکم کے خلاف بہت دیر تک صدائے احتجاج بلند کی اور آخر اسے منسوخ کرا کے رہا۔

اس نے ہندوستانی صنعتِ فلم سازی کی سطح بلند کرنے میں قابلِ ستائش خدمات سرانجام دی ہیں۔ غیر ملکی فلم سازوں سے جو ہندوستان، ہندوستانی روایات اور خود ہندوستانیوں کا مضحکہ اڑایا کرتے تھے۔ اس کا اُس نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ یورپ کا دورہ کیا اور اُن لوگوں کو اُن کی حماقتوں سے آگاہ کیا۔

وہ کئی بچوں کا باپ ہے۔ درجنوں تو نہیں ہوں گے، لیکن ایک درجن کے قریب ضرور ہوں گے۔ کیونکہ ایک دن جب میں اس کے گھر گیا تھا تو اُس نے اپنے تمام بچوں کو "فال اِن" کا حکم دیا۔ بابوراؤ ان سب کا شفیق باپ ہے۔ مگر ـــ

بس اسی مگر کے بعد وہ بابوراؤ شروع ہوتا ہے۔ جس کا آغاز اور اس کے

بعد کا کچھ حصّہ میں نے دیکھا تھا، تعمیر و تاسیس، عظمت و بزرگی کے خلاف جو ہلکی سی کد اُس کی تحریروں میں جھلکیاں لیتی تھی اور آہستہ آہستہ نمایاں ہو رہی تھی۔ اب اپنے پورے بھیانک لباس میں جلوہ گر ہے۔

محمود غزنوی کی بُت شکنی کا وہ ہلکا سا پر تو، جو اس کے دل و دماغ میں موجود تھا۔ اب نہایت بھونڈی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے۔

درمیان میں اس نے جواہر لال نہرو کی ہر دلعزیزی اور عظمت سے چڑ کر اُس کو گاندھی کا لے پالک اور ساری قوم کے سر کا درد کہا تھا یہی چیز اب بگڑ کر پاکستان دشمن بن گئی ہے۔ اس لئے کہ پاکستان حقیقت بن گیا ہے اور دنیا کے نقشے پر اپنے لئے ایک اہم جگہ پیدا کر رہا ہے۔ یہ اُس کی کج رو طبیعت کے خلاف ہے۔

"فلم انڈیا" میں جیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔ صرف فلم سے متعلقہ مضامین ہونے چاہئیں۔ اور ہوا کرتے تھے لیکن آہستہ آہستہ اس میں سیاسیات نے بھی سر نکالنا شروع کر دیا۔ اور اب تو یہ حالت ہے کہ سیاسیات، فلمیات اور جنسیات کچھ اس طرح آپس میں گڈمڈ ہو گئے ہیں کہ بالکل بابوراؤ کی موجودہ پروٹڈ ذہنیت کا نقشہ پیش کرتے ہیں۔ ایک ہی جگہ پر آپ کو پاکستان، مرارجی ڈِسائی، عورتوں کے ایام اور دیرا کے سپاٹ نما چہرے کا ذکر ملے گا۔

لیاقت کا مکہ ہو گا، ساتھ ہی بابوراؤ کی تنومندی اور مردمی، اس کے ساتھ

اچاریہ کشور ساہو اور آخر میں وہ گاندھی ٹوپی کو اپنی پھونکوں سے اڑانے کی کوشش کر رہا ہوگا۔

سیاسیات میں قدم رکھ کر وہ سمجھتا ہے کہ یہ بھی کوئی ریٹا ہے، سوشیلا ہے، پدما ہے جسے وہ ڈگڈگی بجاکر بانس پر چڑھا دے گا اور خود تماشا دیکھے گا، حالانکہ وہ اندرونی طور پر جانتا ہے کہ فلم سازی کے میدان میں بہت بری طرح ناکام رہ چکا ہے اور اس میدان میں اس سے بھی زیادہ ناکام رہے گا ـــــ مگر چھیڑ چھاڑ اُس کی سرشت میں داخل ہے۔

مجھ سے آپ پوچھئے تو بابوراؤ کو ہندوستان سے غرض ہے نہ پاکستان سے وہ دراصل عظمت اور برتری کا دشمن ہے۔ ورنہ وہ اپنے اُس بنگلے میں خوش ہے جو اُس نے ایک بڑی رقم دے کر عمر پارک میں خریدا ہے۔ اپنی سکرٹری سوشیلا رانی سے خوش ہے جس کو آسمانوں پر چڑھانے کے لیے اُس نے "فلم انڈیا" دو برس تک وقف کیے رکھا۔ اُس کو ایک فلم میں بھی پیش کیا۔ اس خیال سے کہ دوسرے کا ہاتھ رانی کو نہ لگے۔ اُس نے یہ فلم خود ڈائرکٹ کیا ـــــ لیکن نتیجہ صفر۔

اس کی بابوراؤ کو کوئی پروا نہیں۔ اُس کے پاس رانی ہے۔ اُس کے پاس ریس کے گھوڑے ہیں۔ اُس کے پاس بہترین دفتر ہے۔ اُس کے پیٹ میں سرطان ہے لیکن اُس کی تجوری میں کافی دولت ہے۔ وہ اُڑ کر امریکہ جا سکتا ہے اور اس کا علاج کرا سکتا ہے ـــــ لیکن اُس کو ایک بہت بڑا دکھ ہے۔

میں آپ کو بتاتا ہوں ـــــ اُس کو یہ دکھ ہے کہ مسلمان کیوں اتنے بے وفا ہوتے ہیں۔ میں سچ کہتا ہوں اُس کے کئی مسلمان دوستوں نے اُس سے بے وفائی کی ہے۔ ہندو دوستوں نے بھی کی ہے۔ لیکن مسلمان اُسے زیادہ عزیز تھے۔ وہ اُن کی خوبو پسند کرتا تھا۔ اُن کا رہن سہن پسند کرتا تھا۔ اُس کو اُن کی خوبصورتی پسند تھی۔ سب سے زیادہ اُس کو اُن کے کھانے پسند تھے۔

بابو راؤ عقائد کے لحاظ سے بہت روشن خیال ہے۔ اُس کی ایک لڑکی، پریس کے ایک مسلمان ملازم کے عشق میں گرفتار ہو گئی۔ مسلمان قریب قریب ان پڑھ تھا۔ اور بابو راؤ کی لڑکی ظاہر ہے کہ تعلیم یافتہ تھی ـــــ لیکن عشق ایسی چیزیں کب دیکھتا ہے۔ دونوں بھاگ گئے۔

بابو راؤ اُن دونوں کو پکڑ کر لے آیا۔ لڑکی کو لعنت ملامت کی اور چاہا کہ یہ قصہ ختم ہو جائے، لیکن لڑکی نہ مانی ـــــ بابو راؤ نے اُس سے پوچھا "تو کیا چاہتی ہے؟"

لڑکی نے جواب دیا۔ "میں اُس سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔"

بابو راؤ نے اپنی لڑکی کی شادی پریس میں کام کرنے والے مسلمان سے کر دی۔ ـــــ کچھ عرصے کے بعد جب اُس سے میری ملاقات ہوئی تو وہ آنکھوں میں آنسو بھر کے کہنے لگا۔ "یہ تم سالا مسلمان کیسا ہے ـــــ ایک ہم سے چھوکری لیتا ہے ـــــ پھر کہتا ہے کھانے کے لئے بھی دو۔"

اس پس منظر میں بھی بابوراؤ کی موجودہ زہریلی تحریروں کو دیکھنے کی ضرورت ہے۔

لیکن یہ کتنی بڑی حماقت ہے کہ وہ ایک فرد کا یا دو تین افراد کا بدلہ ایک پوری قوم سے لینا چاہتا ہے — ایک مذہب سے لینا چاہتا ہے۔ بابوراؤ تاریخ کا طالب علم ہے، کیا اُس پر یہ حقیقت آشکارا نہیں کہ یہ قوم اور یہ مذہب سراب نہیں، ایک ٹھوس حقیقت ہے!

اسلام اور ہادیٔ اسلام کے خلاف لوگ دریدہ دہنی کرتے رہے ہیں، لیکن اس سے کچھ فرق نہیں پڑا۔ پاکستان کے خلاف بھی لوگ ایک عرصے تک زہر اُگلتے رہیں گے۔ اس سے کیا ہوتا ہے — مجھے افسوس تو اس بات کا ہے کہ حالات نے کتنا شاندار قلم غلاظت اور گندگی میں ڈبو دیا — کوئی آرٹسٹ کسی کی مذہبی دل آزاری کا باعث نہیں ہوسکتا۔ وہ آرٹسٹ تھا، لیکن افسوس کہ عام آدمی بن گیا۔

خدا کی قسم 'فلم انڈیا' کے چند پچھلے شمارے دیکھے، مجھے گھن آنے لگی — بابوراؤ اور ایسی گراوٹ، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ آرٹسٹ جو اُس میں تھا، یا تو سرطان بن کے اُس کے پیٹ میں چلا گیا ہے، یا اُس کی دو بیویوں کی بددعاؤں۔ ریٹا کارلائل کے بریدہ گیسوؤں — اور پدما دیوی اور سوشیلا رانی کے بستروں میں دفن ہو گیا ہے۔

گنجے فرشتے

"ٹھنڈا گوشت" کا مقدمہ قریب قریب ایک سال چلا۔ ماتحت عدالت نے مجھے تین ماہ قید بامشقت اور تین سو روپے جرمانے کی سزا دی۔ سیشن میں اپیل کی تو بری ہوگیا۔ (اِس حکم کے خلاف سرکار نے ہائی کورٹ میں اپیل دائر کر رکھی ہے مقدمے کی سماعت ابھی تک نہیں ہوئی)

اس دوران میں مجھ پر جو گذری اُس کا کچھ حال آپ کو میری کتاب "ٹھنڈا گوشت" کے دیباچے بعنوان "زحمتِ مہرِ درخشاں" میں مل سکتا ہے۔ دماغ کی کچھ عجیب ہی کیفیت تھی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں۔ لکھنا چھوڑ دوں یا احتساب سے قطعاً بے پروا ہو کر قلم زنی کرتا رہوں۔ سچ پوچھیے تو طبیعت اس قدر کھٹی ہو گئی تھی کہ جی چاہتا تھا کوئی چیز الاٹ ہو جائے تو آرام سے کسی کونے میں بیٹھ کر چند برس قلم اور

دوات سے دور رہوں۔ دماغ میں خیالات پیدا ہوں تو انھیں پھانسی کے تختے پر لٹکا دوں۔ الاٹ منٹ میسّر نہ ہو تو بلیک مارکٹنگ شروع کر دوں، یا ناجائز طور پر شراب کشید کرنے لگوں۔ آخر الذکر کام میں نے اس لیئے نہ کیا کہ مجھے اس بات کا خدشہ تھا کہ ساری شراب میں خود پی جایا کروں گا۔ خرچ ہی خرچ ہو گا۔ آمدن ایک پیسے کی بھی نہ ہو گی۔ بلیک مارکٹنگ اس لیئے نہ کر سکا کہ سرمایہ پاس نہ تھا۔ ایک صرف الاٹ منٹ ہی تھی جو کار آمد ثابت ہو سکتی تھی۔ آپ کو حیرت ہو گی۔ مگر یہ واقع ہے کہ میں نے اس کے لیئے کوشش کی۔ پچاس روپے حکومت کے خزانے میں جمع کرا کے میں نے درخواست دی کہ میں امرتسر کا مہاجر ہوں۔ بیکار ہوں اس لیئے مجھے کسی پریس یا سینما میں کوئی حصہ الاٹ فرمایا جائے۔

درخواست کے چھپے ہوئے فارم تھے۔ ایک عجیب و غریب قسم کا سوالیہ تھا۔ ہر سوال اس قسم کا تھا جو اس امر کا طالب تھا کہ درخواست کنندہ پیٹ بھر کے جھوٹ بولے۔ اب یہ عیب مجھ میں شروع سے رہا ہے کہ جھوٹ بولنے کا سلیقہ نہیں ہے۔ میں نے الاٹ منٹ کرانے والے بڑے بڑے گھاگوں سے مشورہ کیا۔ تو انھوں نے کہا کہ تمھیں جھوٹ بولنا ہی پڑے گا۔ میں راضی ہو گیا۔ لیکن جب چھپے ہوئے فارم کی خالی جگہیں بھرنے لگا تو روپے میں صرف دو یا تین آنے جھوٹ بول سکا۔ اور جب انٹرویو ہوا تو میں نے صاف صاف کہہ دیا کہ

صاحب جو کچھ درخواست میں ہے بالکل جھوٹ ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ میں ہندوستان میں کوئی بہت بڑی جائداد چھوڑ کے نہیں آیا۔ صرف ایک مکان تھا اور بس۔ آپ سے میں خیرات کے طور پر کچھ نہیں مانگتا۔ میں بزعمِ خود بہت بڑا افسانہ نگار تھا۔ لیکن اب مجھے محسوس ہوا کہ یہ کام میرے بس کا روگ نہیں اللہ میاں میاں ایم اسلم اور بھارتی دت کو سلامت رکھے۔ میں ان کے حق میں اپنی افسانہ نگاری سے سبک سر ہوتا ہوں اور صرف اتنا چاہتا ہوں کہ حکومت مجھے کوئی ایسی چیز الاٹ کر دے جس کے لئے مجھے کام کرنا پڑے اور اس کام کی اجرت کے طور پر مجھے پانچ چھ سو روپیہ ماہوار مل جایا کرے۔

حیرت ہے کہ میری اس گفتگو کا اثر ہوا۔ قریب تھا کہ مجھے کسی برف خانے میں کوئی حصہ الاٹ ہو جائے کہ بورڈ کے ممبروں سے کسی نے کہہ دیا کہ تم لوگ یہ کیا غضب کر رہے ہو۔ یہ شخص جس کا نام سعادت حسن منٹو ہے، ترقی پسند ہے۔ چنانچہ یک قلم میری درخواست مسترد کر دی گئی۔

ادھر یہ ہوا، اُدھر ترقی پسند مصنفین نے رجعت پسند قرار دے کر میرا حقہ پانی بند کر دیا —— یہ بھی خوب لطیفہ رہا۔ بہت دیر تک سوچا گیا، آخر اس نتیجے پر پہنچا کہ "مُولے نے اوڑک ہٹی بہناں"۔ چنانچہ قلم اٹھا کر پھر لکھنا شروع کر دیا۔ لیکن لکھنے سے پہلے یہ مرحلہ درپیش رہا کہ موضوع کیا ہو۔ فورم کیسی ہو۔ بہت سوچ بچار کے بعد میں نے یہ فیصلہ کیا کہ اپنی جان پہچان کے ایکٹر

ایکٹرسوں پر کچھ لکھوں۔ اس سلسلے کا پہلا مضمون چنانچہ "پری چہرہ نسیم بانو" کے عنوان سے ہوا جو روزنامہ 'آفاق' میں چھپا۔ میں خوش تھا کہ ایک رستہ نکل آیا ہے جو حکومت کے احتساب سے پاک صاف رہے گا اور طہارت پسند لوگوں کے لئے موجب اطمینان ہو گا۔ لیکن یہ مضمون چھپتے ہی طوفان برپا ہو گیا۔ 'آفاق' کے دفتر میں بے شمار خطوط آئے جن میں مجھے ملعون و مطعون گردانا گیا۔

۲ر جولائی کے 'آفاق' میں ایک صاحب قاضی م۔ بشیر محمود صاحب ادیب فاضل کا ایک خط ایڈیٹر کے نام چھپا —— اس کا ملخص ملاحظہ فرمائیے:

> سعادت حسن منٹو کا مضمون —— بے ضرر سا مضمون "پری چہرہ نسیم بانو" نظر سے گذرا۔ ساتھ ہی نسیم بانو کا مکتوب اپنے بھائی کے نام بھی پڑھا۔
>
> منٹو نے بڑے اطمینان اور لطف لے لے کر بہن کے بتمامہا وصف، مناقب، لغزشیں اور حکائتیں توضیع اور وضاحت کے ساتھ رقم کی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہن کی قدر و منزلت، ساکھ اور وقعت اور وقار کو کچھ حد تک نظر انداز کر چکے ہیں۔ کسی حد تک یہ بہن کی توہین و تذلیل میں شمار ہو گا۔
>
> ایسا لکھتے ہوئے انھیں حجاب و تامل کو خدا حافظ

کہنا پڑا ہوگا۔ مجھے اُن کے الفاظ پر اعتراض نہیں۔ حروف و سکنات پر گرفت نہیں اور نہ ہی مضمون پر حرف گیری کر رہا ہوں۔

میں آپ سے پوچھتا ہوں۔ کیا نسیم بانو، منٹو صاحب کی حقیقی بہن ہے؟ — کیا منٹو اُس کے معاشقے پر روشنی ڈالنے کی قوت اور جسارت رکھتا ہے؟

منٹو بڑا شریر ہے۔ میرے دل میں اُس کی بے انتہا عزت ہے۔ میں اُس کے کافی کارنامے دیکھ چکا ہوں۔ اب ایک اور "بے ضرر قسم کا" کارنامہ بھی لگے ہاتھوں دیکھ لیا۔ میں منٹو دوست کی "پری چہرہ نسیم بانو" پر رائے زنی یا نکتہ چینی نہیں کر رہا اور نہ ہی کرنا چاہتا ہوں — اور پھر اپنے منٹو پر نکتہ چینی کر بھی کیسے سکتا ہوں۔ اس کی بلند آشیانی تک ابھی میری پہنچ نہیں۔

یہ خط پڑھ کر مجھے بہت کوفت ہوئی۔ اسے دور کرنے کے لئے میں نے یہ چند حروف لکھ کر محمد سرور صاحب کو بھیج دیئے۔

اس خط پر اور ایسے ہی دوسرے خطوں پر جو اس مضمون کے متعلق "آفاق" اور دوسرے اخباروں میں چھپتے رہے ہیں کوئی تبصرہ نہیں کرنا چاہتا۔

سرور صاحب نے شروع شروع میں اِن خطوط کی کوئی پروا نہ کی اور مجھ سے کہا "تم لکھتے رہو، یہ سلسلہ کافی دلچسپ ہے، جاری رہنا چاہیئے ـــــ میں نے جاری رکھا۔ لعنت ملامت بھی جاری رہی۔ شیام پر مضمون چھپا تو سیالکوٹ کی ایک خاتون نیّر بانو صاحبہ نے ایک طویل خط لکھا۔ جسے پڑھ کر یقین مانیے مجھے بہت ترس آیا۔ اس کے چند اقتباس دیکھیے:

میں سینما دیکھنا گناہِ کبیرہ میں شمار نہیں کرتی۔ تصویروں پر نظر پڑتے ہی آنکھوں پر پٹی باندھنے نہیں دوڑی جاتی۔ مگر میرے پاس بچّے ہیں اور میری آرزو ہے کہ وہ نیک اخلاق ہوں۔ سینما دیکھ دیکھ کر اخلاق بنتا نہیں، بگڑتا ہے۔ اس لئے میں نے سینما دیکھنا چھوڑ دیا ـــــ میں جاؤں گی تو وہ بھی جائیں گے۔ زبردستی روکا تو اس آرزو کو دل میں پالتے رہیں گے اور جب موقع ملے گا کسر پوری کر لیں گے۔

میں اتنی بڑی ہوں مگر بعض تصویروں پر نظر ڈالنا طبیعت کو گوارا نہیں ہوتا۔ ایسا نیچ پن محسوس ہوتا ہے کہ کیا بتاؤں۔ جیسے کسی کی خلوت میں بغیر اجازت گھسے جا رہے ہیں۔ اور یہ بات آدابِ شرافت کے خلاف

ہی تو ہے۔ آپ کہیں گے، ایسے رسالے اخبار، کتابیں بچوں کو نہ دکھائی جائیں مگر یہ کتنا مشکل کام ہے کہ پڑھتے پڑھتے اخبار یا رسالہ میز پر ٹکا دینے کی بجائے خاص اہتمام سے تالے میں بند کرنے کی فکر کی جائے۔

ذرا "مُرلی کی دھن" دوبارہ پڑھ کر بتائیے کہ یہ کیا چیز ہے؟ ـــــ کوئی شخص خواہ کتنا بھی نیکی سے دور اور اخلاق باختہ ہو۔ کیا اپنے گھر میں بیوی بچّوں کے درمیان بیٹھ کر یہ پُرلطف یا گھناؤنے تجربات دہرانا پسند کرتا ہے؟ ـــــ اُس نے چاہے کتنے ہی جسم لنڈھائے ہوں۔ شراب کے تالاب میں غوطے لگائے ہوں۔ پی کر منجمد رہتا ہو، یا مغلظات بکتا ہو۔ کتنی ہی عورتوں کو دسترخوان کی چٹنی بناتا ہو۔ جب یاد کیا ہو "سالی عورت" کہا ہو۔ اور نہ پاکر بستر کو آگ لگادی ہو۔ ان چیزوں کو اخباروں کے ذریعے سے پھیلا کر کونسی انسانیت اور اخلاق کی خدمت ہوتی ہے ـــــ دوسروں کے بھی گھر ہوتے ہیں۔ اُن کے بھی بیوی بچے ہوتے ہیں۔ لڑکے لڑکیاں ہوتی ہیں۔ ان کا خیال بھی

اپنے گھر اور بچوں کی طرح ہونا چاہیئے۔ کل دنیا مردوں
ہی کی تو نہیں کہ خاک پھانکتے پھریں۔ گندگی اچھالیں
خود لتھڑیں، معصوموں کو بھی لتائیں ۔ کوئی پوچھنے والا
نہیں ـــــ کوئی کہاں بھاگے۔ گھروں میں بھی چین نہیں
اخبار، رسالے اور ادب جو بیج بو رہے ہیں۔ ماں باپ
کو چاہیئے۔ وہ بھی ان کی پرورش اور آبیاری شروع
کر دیں تاکہ بہتر اور مکمّل نتیجہ سامنے آئے۔ باپ بیٹے
کو سکھائے کہ اس طرح شراب کے تالاب میں غوطہ
لگا کر ان سالیوں کو اس طرح گھسیٹ لے جانا چاہیئے
اور مائیں اپنی بیٹیوں کو نئے نئے دام بچھانے کے دام
حربے سمجھا دیں۔ استغفراللہ، کیسی انسانیت اور کیسا
معاشرہ ہوگا ـــــ ذرا تصوّر تو کیجیئے۔ سوچ سوچ کر میں کتنا
جلتی ہوں۔

میں نے جب یہ خط پڑھا تو بخدا مجھ پر بہت اثر ہوا۔ مجھے نیّر بانو کی حالت
پر بہت ترس آیا۔ میں نے سوچا کہ اور کچھ نہیں تو اس خاتون پر میں نے واقعی بہت
ظلم کیا ہے جس کا کفارہ مجھے ضرور ادا کرنا چاہیئے۔ لیکن پھر میں نے سوچا اگر میں
نے اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق یہ کفارہ ادا کرنے کی کوشش کی تو وہ عورت

جو بعض تصویروں پر نظر ڈال کر نیچ پن محسوس کرتی ہے اور یہ سمجھتی ہے گویا وہ کسی کی خلوت میں اجازت کے بغیر گھس گئی ہے۔ یقیناً اس کی تاب نہ لاکر بے ہوش ہو جائے گی اور بہت ممکن ہے مر بھی جائے۔

مجھے اس کا پورا پورا احساس ہے کہ نیّر بانو ذہنی مریضوں کی جس فہرست میں آتی ہیں، اُس کے تمام افراد قابلِ رحم ہیں ـــــ اُن کا علاج جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس کے سوا اور کوئی نہیں کہ اُن کے سامنے بوتلوں کے کاگ اُڑا اُڑا کر تالاب بھرے جائیں۔ گندگی اُچھالی جائے۔ اپنے سر میں خاک ڈالی جائے، بال نوچے جائیں، مغلظات بکی جائیں۔ یہ کام خود سے نہ ہو سکے تو کرائے پر آدمی لائے جائیں جو واہی تباہی بکیں ـــــ شمع، بیسویں صدی، رومان اور اسی قسم کے دوسرے پرچوں کے تمام مضامین اشتہاروں سمیت پڑھ کر بار بار انھیں سنائے جائیں۔ اگر یہ نسخہ کارگر ثابت نہ ہو تو سعادت حسن منٹو سے کہا جائے کہ نیّر بانو کا پرانا سینڈل اُٹھائے اور اپنے سر پہ مار مار کر اُسے گنجا کر دے۔

میں نے بہت سوچا تھا کہ ان مضامین کے مجموعے کا نام میں نے "گنجے فرشتے" کیوں رکھا ہے ـــــ اب یہ سطور لکھتے لکھتے اس کی وجہ تسمیہ معلوم ہو گئی ہے مجھے یقین ہے کہ میرا بنایا ہوا نسخہ ہرگز ہرگز مجرّب نہیں ہے اور لوگ اپنی کمزوریاں دور کرنے کے لئے ضرور محلّہ پیر گیلانیاں کے غلام محمد ہی کی گولیاں

خریدیں گے اور انجام کار سیالکوٹ کے کسی چوراہے میں کھڑے ہو کر مجھے نیّرہ نو کے پرانے یا نئے سینڈل سے اپنا سر گنجا کرنا پڑے گا۔

میراجی والا مضمون "تین گولے" شائع ہوا تو اس سے بھی لوگوں کو تکلیف پہنچی۔ آفاق کے ایڈیٹر کو ایک صاحب خواجہ فرخندہ بنیادی صاحب نے یہ خط لکھا:

آپ نے "آفاق" کے ادبی ایڈیشن میں سعادت حسن منٹو کا مضمون "تین گولے" شائع کر کے میراجی مرحوم، منٹو صاحب اور خود "آفاق" کے ساتھ بڑا ظلم کیا ہے۔ یہ مضمون ایک مخصوص ادبی حلقے کے لئے تو شاید موزوں تھا لیکن ایک سنجیدہ اخبار اس کی اشاعت کا قطعاً متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔

دنیا کے ہر مہذّب ملک اور ہر مہذّب سماج میں یہ اصول مروّج ہے کہ مرنے کے بعد خواہ وہ دشمن ہی کیوں نہ ہو اسے اچھے الفاظ کے ساتھ یاد کیا جاتا ہے۔ اس کے صرف محاسن بیان کئے جاتے ہیں اور عیوب پر پردہ ڈالا جاتا ہے۔ میراجی میں اگر کچھ کمزوریاں تھیں تو ان سے صرف ان کا مخصوص حلقۂ احباب ہی واقف تھا۔ دنیا تو

انھیں ایک ادیب اور شاعر کی حیثیت سے جانتی اور
عزت کرتی تھی۔ کیا غضب کہ اُن کے لنگوٹیے یار اُن
کے مرنے کے بعد ان برائیوں کو الم نشرح کر رہے ہیں۔
عصمت نے 'دوزخی' لکھ کر اپنے بھائی کو جس طرح
خراج ادا کیا ہے، غالباً ہمارے ادیب اب اُسی ڈگر
پر چل رہے ہیں —— اور پھر اس مضمون کے بعض حصوں
کی کراہت کی حد تک عریانی۔ پناہ بخدا! نہ نفاست پسند
طبائع اسے برداشت کر سکتی ہیں، نہ یہ مضمون گھر کی
خواتین پڑھ سکتی ہیں، نہ بچے، نہ لڑکیاں۔ اگر منٹو کے
بغیر آپ کا ادبی اڈیشن مکمل نہیں ہو سکتا تھا۔ تو اڈیٹر کے
قلمی احتساب کو کیا ہو گیا تھا؟

میراجی مرحوم، منٹو اور 'آفاق' کے ساتھ جو ظلم ہونا تھا۔ وہ تو ہو گیا۔ اس مجموعے کی اشاعت سے جو مزید ظلم ہو گا اُس کا میں گنہ گار ہوں۔ اور یہ گناہ بنیادی صاحب کے سر چڑھ کر کر رہا ہوں۔ انھوں نے مجھے یقین دلایا ہے کہ "دنیا کے ہر مہذب ملک اور ہر مہذب سماج میں یہ اصول مروّج ہے کہ مرنے کے بعد خواہ دشمن ہی کیوں نہ ہو اُسے اچھے الفاظ کے ساتھ یاد کیا جاتا ہے اُس کے صرف محاسن بیان کیے جاتے ہیں اور عیوب پر پردہ ڈالا جاتا ہے۔"

ویسے میں ایسی دنیا پر، ایسے مہذّب ملک پر، ایسے مہذب سماج پر ہزار لعنت بھیجتا ہوں جہاں یہ اصول مروّج ہو کہ مرنے کے بعد ہر شخص کا کردار اور تشخص لانڈری میں بھیج دیا جائے جہاں سے وہ دھل دھلا کر آئے اور رحمۃ اللہ علیہ کی کھونٹی پر لٹکا دیا جائے۔

میرے اصلاح خانے میں کوئی شانہ نہیں، کوئی شیمپو نہیں، کوئی گھونگھر پیدا کرنے والی مشین نہیں ـــــ میں بناؤ سنگھار کرنا نہیں جانتا ـــــ آغا حشر کی بھینگی آنکھ مجھ سے سیدھی نہیں ہو سکی۔ اُس کے منہ سے گالیوں کے بجائے میں پھول نہیں جھڑا سکا۔ میراجی کی غلاظت پر مجھ سے استری نہیں ہو سکی۔ اور نہ میں اپنے دوست شیام کو مجبور کر سکا ہوں کہ وہ بر خود غلط عورتوں کو سالیاں نہ کہے ـــــ اس کتاب میں جو فرشتہ بھی آیا ہے، اُس کا مونڈن ہوا ہے۔ اور یہ رسم نے میں نے بڑے سلیقے سے ادا کی ہے۔

سعادت حسن منٹو

لاہور۔ ۱۱ر جنوری ۱۹۵۲ء

جلا کر کر بگاڑو تیرا کون ہے؟ وہ غم اب میرا گھر نہیں ہے۔
تمہارا